

خلافت الہی میں ہر شے کا حقیقی مالک اللہ ہے، اس لیے مملکت کی ساری چیزیں افراد کو بطور ”امانت“ استعمال کے لیے دی جائیں گی اور ہر فرد کی حیثیت ”امین“ کی ہوگی۔ اس قسم کی تنظیم کو بروئے کار لانے کے لیے خلافت کے پیش نظر ایک معین مقصد ہو گا اور دوسرا اس مقصد کے لیے طریقہ کار۔۔۔

جس طرح اللہ اپنی تمام مخلوق کو عادلانہ طور سے روزی دیتا ہے اور اس کے نظام تنظیم و تقسیم میں تخصیص و ترجیح کی صورت نہیں پیدا ہوتی ہے ایسے ہی خلافت کا فرض ہو گا کہ وہ اللہ کی مخلوق کے لیے سامان خور و نوش مہیا کرے اور بلا تخصیص مذہب و ملت حسب ضرورت و صلاحیت عدل کے ساتھ ان میں تقسیم کرے۔

اور جس طرح اللہ اپنی تمام مخلوق کے رزق کا ذمہ دار ہے اور یہ سب سامان رزق کا پھیلاؤ اسی کے کرشمہ قدرت کا نتیجہ اور اسی کی عطاء و بخشش کا نمونہ ہے اسی طرح خلافت کا فرض ہو گا کہ وہ مفاد عامہ کے پیش نظر حسب حاجت و مصلحت اس طرح سامان رزق کی تنظیم و تقسیم کرے کہ وہ اللہ کی مخلوق کو روزی پہنچا کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکے۔

(مولانا محمد تقی امینی)

حکمتِ قرآن انسٹیٹیوٹ کا ترجمان

اقتصاد

مارچ 2011ء

الہی ہدایت و قوانین
کی روشنی میں انسانوں کے لیے
عصری اقتصادی رہنمائی
کا مخزن

حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ کا ترجمان

الاقتصاد

ششماہی اشاعت - 1

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

چیف ایڈیٹر
مولانا محمد سلیمان طاہر

ایڈیٹر
ابوالفضل نور احمد

معاون ایڈیٹر
مولانا عبداللطیف ناگراج

مارچ 2011ء

فہرست

۳	ارشادات رب العلمین ﷺ
۵	اقتصادی تعلیمات کو قانون کی شکل میں نافذ کیا جائے
۹	انسان کی حیثیت خلیفہ و امین کی ہے
۲۰	اسلام کا تصور ملکیت
۴۱	ملکیت کی حقیقت اور حقیقی مالک
۴۹	قرآن حکیم سے احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت کا ثبوت
۷۱	معاشی مسئلہ کا اسلامی حل
۸۲	اسلامی مملکت میں ٹیکس کا مسئلہ
۱۰۳	نفع و نقصان میں شرکت کا معاملہ اور اس کی شرعی حیثیت
۱۱۹	سرمائیدار قرآن کی عدالت میں
۱۲۹	شاہ ولی اللہ کے اقتصادی نظریات و افکار
۱۵۵	”ربوبیت“ عصر حاضر میں
۱۶۹	معاشیات کی اہمیت

الاقتصاد اور حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ کی دیگر

کتابیں ڈاؤن لوڈ کرنے کے لیے

www.hikmatequran.org

E-mail:

hikmatequran@gmail.com

رابطہ ایڈریس

حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ

سندھی جماعت کو آپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی، جوگی موڑ، نیشنل ہائی وے، کراچی 75030

فون: 0300-2707097 موبائل: 021-35000278

ابتداء اللہ عزوجل کے نام سے

مستبد حکمرانوں اور سرمایہ پرستوں نے ہر دور میں انسانیت کو ظلم کی بھینٹ چڑھا کر اپنے اقتدار اور دولت کے مزے لوٹے ہیں۔ احبار اور رہبان مذہبی گروہوں کو انہوں نے کچھ حصہ عطا کر کے اپنے ظالمانہ اقتدار اور سرمایہ داریت کے لیے استعمال کیا ہے۔

قرآن حکیم کی انقلابی تعلیم اس ظلم و استحصال کا خاتمہ کر کے انسانیت کو احترام، مساوات اور فلاح کا نظام عطا کرتی ہے۔ الاقتصاد قرآن حکیم کی اسی تعلیمات کا نقیب جریدہ ہے۔

آئندہ شمارہ

الاقتصاد کا آئندہ شمارہ اگست 2011ء میں شائع ہوگا جس میں زمین کی ملکیت کے بارے میں قرآن حکیم کی تعلیمات اور حکمائے قرآن کے استفادات پر مبنی مضامین شامل ہوں گے۔ محققین سے گزارش یہ ہے کہ مذکورہ موضوع پر اپنی تحریریں 30 جون تک لازماً ارسال کریں۔

كَلَّا بَلْ لَا تَكْرُمُونَ الْيَتِيمَ ۝

”ہرگز نہیں! بلکہ تم لوگ یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے۔“

وَلَا تَحْضُونَهُ عَلَى طَعَامِ الْيَسِيرِينَ ۝

”اور نہ ہی مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو اکساتے ہو۔“

وَتَأْكُلُونَ الثَّرَاثَ أَكْلًا لَّهًا ۝

”اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔“

وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝

”اور مال سے تو بہت ہی محبت رکھتے ہو۔“

كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًا ۝ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝

”ہرگز نہیں! جب زمین کوٹ کوٹ کر گزار بنادی جائیگی اور آپ کا پروردگار میدان حشر میں فیصلہ کیلئے جلوہ گر ہو گا اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے۔“

وَجَاءَ يَوْمَ مِيزَانٍ يَوْمَ تَدْكُرُ الْأُنْسَانُ وَأَتَى لَهُ الَّذِي كُرِيَ ۝

”اس دن جہنم کو سامنے لایا جائیگا، تب اس روز انسان کو سمجھ آئیگی، لیکن اس وقت سمجھنے کا کیا فائدہ؟“

يَقُولُ يَلَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي ۝

”وہ کہے گا: کاش! میں نے آخرت کی زندگی کیلئے کچھ سامان آگے بھیجا ہوتا!“

فَيَوْمَ مِيزَانٍ لَا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ ۝

”پھر اس روز اللہ ایسی سزا دیگا کہ اس جیسا کوئی سزا دینے والا نہ ہوگا۔“

وَلَا يُؤْتِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ ۝

”اور نہ اس کے جکڑنے کی طرح کوئی جکڑنے والا ہوگا۔“

يَأْتِيهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ أَرْجَعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝

وَادْخُلِي جَنَّاتٍ ۝

”اے نفس مطمئنہ! تو اپنے رب کی طرف واپس اس طرح روانہ ہو جائیے کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی ہو۔ پھر شامل ہو جا میرے خاص بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں!“

ارشادات رب العلمین جل جلالہ

بسم الله الرحمن الرحيم

(سورة الفجر، مکیہ، آیاتھا ۳۰)

وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ۝ وَاللَّيْلِ إِذَا يَسِرُ ۝ هَلْ فِي ذَلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرِ ۝

”قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور جفت اور طاق کی، اور رات کی جب وہ رخصت ہو رہی ہو، ان چیزوں میں صاحب عقل کیلئے بڑی ہی شہادت ہے۔“

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ إِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝ وَثَمُودَ ۝ الَّذِينَ جَاءُوا الصَّخِرَ بِالْوَادِ ۝ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَارِ ۝ الَّذِينَ ظَنُّوا أَنَّهُمُ الْبِلَادِ ۝ فَكَتَرُوا فِيهَا ۝ فَالْفُسَادِ ۝ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ۝ إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْأَعْيُنِ ۝

”کیا تم نہیں دیکھتے کہ تمہارے پروردگار نے عادِ ارم کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ جو بڑے ستونوں والے تھے۔ جو ایسے قوی اور متمدن تھے کہ دنیا میں ایسی قوم پیدا نہیں ہوئی تھی اور قوم ثمود جنہوں نے اپنے رہنے کیلئے پہاڑوں کو تراش کر گھر بنائے تھے۔ اور فرعون جو اپنی شان و شوکت خسروی کیلئے خیمہ و خرگاہ رکھتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے انسانی آبادیوں میں فتنہ و ظلم کا بڑا سرا اٹھایا تھا اور عدل و اصلاح کی جگہ ان میں فساد پھیلارکھتا تھا۔ پس قانون الہی نے اپنے تازیانے عذاب کو حرکت دی اور ان سب کو نابود کر دیا، بے شک آپ کا رب گھات میں لگا ہوا ہے۔“

فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ ۝ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۝

”انسان کا حال تو یہ ہے کہ جب اس کا پروردگار اس کے ایمان کو اس طرح آزماتا ہے کہ اسے دنیا میں عزت و نعمت عطا فرماتا ہے تو وہ فوراً خوش ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا پروردگار میرا اعزاز و اکرام کرتا ہے۔“

وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ ۝ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ۝

”اور جب اس کے ایمان کو کسی آزمائش میں ڈال کر اس طرح آزماتا ہے کہ رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے (یعنی مصیبت میں ڈال دیتا ہے) تو (معامایوس ہو کر) کہنے لگتا ہے کہ میرا پروردگار تو مجھے ذلیل کر رہا ہے، میرا کچھ خیال نہیں کرتا۔“

اقتصادی تعلیمات کو قانون کی شکل میں نافذ کیا جائے

معاش اور معیشت، روزی اور رزق کے معنی میں آتے ہیں، جن کو سلمان زبیت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، اس کو ”علم الاقتصاد“ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ قصد سے ماخوذ ہے، اس سے مراد میانہ روی، اعتدال اور افراط و تفریط سے پاک ہونا ہے۔ ”وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ (لقمان: ۱۹) وَمِنْهُمْ مَّقْتَصِدٌ (فاطر: ۳۲) میں بھی میانہ روی کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن لفظ ”الاقتصاد“ معیشت (Economics) میں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ”علم الاقتصاد یعنی ایسا علم، جس میں یہ بتایا جائے کہ انسان اپنی طبعی ضروریات کس طرح متوازن اور معتدل طریقے سے حاصل کرے۔“

عہد حاضر کو معاشیات کا عہد کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ آج کے دور میں معاشی مسئلہ کی اس قدر اہمیت بڑھ گئی ہے کہ گویا یہ انسان کا بنیادی مسئلہ بن چکا ہے۔ آج کا انسان سب سے پہلے اپنے معاشی مسئلہ کا اطمینان بخش حل چاہتا ہے۔ وہ اپنے اور خاندان کی کفالت کے مسئلہ کو سب سے مقدم رکھتا ہے، اسکو باقی مسائل سے دلچسپی کم ہے مگر آج کا انسان اس دین اور نظریہ کو قبول کرتا ہے جس میں اس کے معاشی مسائل کا حل موجود ہو۔

ہماری خوش بختی اور سعادت یہ ہے کہ اسلام نے معاشی اور اقتصادی مسائل کے سلسلہ میں جو ہدایات دی ہیں، اگر ہم ان کو قانونی شکل دیکر اپنے معاشرہ میں رائج کریں اور ظلم، نا انصافی اور عدم توازن کو مٹانے کے لئے قرآن کی روشنی میں اصول و ضوابط بنائیں، اور عام انسانوں کے معاشی استحصال پر تعزیراتی قوانین بنا کر ان پر عمل کریں تو ہمارا معاشرہ نہ صرف یہ کہ خوشحال، پرسکون اور مطمئن زندگی گزارنے والا معاشرہ بن جائیگا، بلکہ یہ معاشرہ ”آئیڈیل“ کی صورت میں دوسرے ہر کے لئے ایک مثال بھی بن جائیگا اور ساتھ ساتھ اسلام کی برکتوں، رحمتوں اور سعادتوں کا یہ پیغام دوسری دنیا کیلئے اسلام کی حقانیت اور اس کی انسان دوستی والا دین ہونے کا ذریعہ بھی بن جائے گا۔ کہ اسلام ایسا عدل و انصاف اور فلاحی معاشرہ وجود میں لانے والا دین ہے کہ اسکو قبول کرنے سے انسانیت اعلیٰ و بلند مدارج تک پرواز کر سکتی ہے۔

دور اول میں خاص طور پر خلافت راشدہ کے دور میں طاغوتی اور ظالمانہ معاشروں میں زندگی بسر کرنے والے بے بس اور مقہور و مجبور انسان جس تیزی سے اسلام میں داخل ہوئے تھے، اس میں اسلام کے نظام عدل اور اس کے معاشی و اقتصادی کفالت کے نظام کا بڑا دخل تھا، جس نے لوگوں کو آزادی، حریت اور خوشحالی میسر کی تھی۔

عہد فاروقی میں ایک مرتبہ امیر المؤمنین بازار میں جا رہے تھے کہ ایک مجوسی غیر مسلم کو دیکھا جو بڑھاپے

کی حالت میں مانگ رہا تھا۔ خلیفہ راشد نے پوچھا کہ بوڑھے میاں! کیوں مانگ رہے ہو؟ اس نے کہا کہ مجھ پر جزیہ عائد کر دیا گیا ہے، اب محنت نہیں کر سکتا، اس لئے مانگ کر جزیہ کی رقم پوری کر رہا ہوں۔ سیدنا عمرؓ نے فوری طور پر جزیہ معاف کر دیا اور بیت المال سے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا تاکہ وہ اپنی کفالت کر سکے اور فرمایا کہ جس شخص نے جوانی میں محنت کر کے ہمیں جزیہ دیا اب ہم اسکی بڑھاپے میں کفالت نہ کریں تو یہ عدل کے منافی ہے۔

آج کے نام نہاد مسلم معاشروں میں اسلام کی اقتصادی ہدایات کو قانون کی شکل نہیں دی گئی ہے۔ اور انحراف کی صورت میں تعزیراتی قوانین نافذ کئے گئے ہیں، اس لئے یہ ہدایات واعظ و نصیحت سے زیادہ موثر نہیں اور ان سب تعلیمات کو استجاب کی حیثیت حاصل ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ”انفاق فی سبیل اللہ“ کو دین کارکن نہیں سمجھا جاتا، حالانکہ پورے قرآن میں امر کے صیغہ میں سینکڑوں مرتبہ اس کا حکم دیا گیا ہے اور انفاق سے انحراف کرنے والوں کو عذاب الیم کی تنبیہ کی گئی ہے۔ اس کو دنیا و آخرت میں ذلت اور خسران سے تعبیر کیا گیا ہے، تب بھی انفاق نہ کرنے والے کو گناہ کبیرہ کا مرتکب قرار نہیں دیا جاتا۔ اس وجہ سے امت مسلمہ میں سرمایہ داری کا رجحان بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ”وَمِمَّا زَكَّاهُمْ يَنْفِقُونَ“ کی آیت مبارکہ پر اصحاب اموال کی نظر ہی نہیں جاتی۔ ذاتی ملکیت کے احترام و تقدس کے ایسے حوالے یاد کیے ہوئے ہیں کہ ان کو ”آت ذالقرین والیتامی والمساکین“ جیسی آیتوں پر صرف استجابی امر ہی سوچتا ہے۔ عمومی طور پر علمائے دین اقتصادی مسائل کی اہمیت اور غربا و مساکین کو اپنے جائز حقوق سے محروم رکھنے پر اظہار خیال کیا ہی نہیں ہے۔ اسلامی لٹریچر میں اقتصادیات پر کتابیں خال خال موجود ہیں اور جو کچھ ہیں بھی تو ان میں صاف اور واضح طور پر قرآن و سنت کا موقف نہیں پیش کیا گیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام اور اس میں عادل امیر المؤمنین اور سادہ اور امانت و دیانت سے زندگی بسر کرنے والا حکمران اگر موجود نہیں ہو گا تو پھر بیت المال کو لٹانے والے، عیاشی کرنے اور انعامات دینے والے حکمران ہی جنم لیں گے جو اپنے خاندان اور احباب کو دولت سے مالا مال کرتے رہیں گے اور عوام کو غربت کے آخری کنارہ تک پہنچا دیں گے۔

ہمارے ملک کی صورت حال یہ ہے کہ ملک وجود میں آتے ہی اشرافیہ طبقہ کے ہاتھوں یرغمال ہو گیا ہے، یہ ملک اشرافیہ طبقہ نے بنایا۔ اب ان کے مفادات پورے کیے جا رہے ہیں۔ یہ ملک ایک دن کیلئے بھی اسلامی ملک نہیں بن سکا۔ جھوٹ بکتے ہیں وہ لوگ جو کہتے اور لکھتے رہتے ہیں کہ یہ ملک اسلام کے نظام کے عملی نفاذ کیلئے بناتھا یا اس کے بنانے والوں کو اسلام سے عشق اور اخلاص تھا، یہ ملک سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے بنا یا اور اس ملک میں ان کی جاگیریں محفوظ ہو گئیں اور سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام مکروہ اور فبیح شکل میں موجود ہے، جس میں ملک کا پانچ فی صد مراعات یافتہ طبقہ لوٹ کھسوٹ کر رہا ہے، دولت کو تجوریوں میں بند کر کے رکھا ہے بلکہ بیرونی ملکوں کی بینکوں میں پاکستانی عوام کی کمائی یا انکو ملنے والا قرض لوٹ کر وہاں جمع کیا ہوا ہے۔ عوام کی صورت حال یہ ہے کہ ان کو کھانے کیلئے آٹا، چینی، دالیں اور سبزیاں تک میسر نہیں ہیں، علاج

کیلئے دوائیں لینے کی رقم نہیں ہے۔ گھر کر ایہ پر یکا مکان ہے، تعلیم بڑے لوگوں کی اولاد کیلئے مخصوص ہے اور ان کی درسگاہیں الگ ہیں۔ غریبوں کے بچے دھکے کھا رہے ہیں۔ روزگار، نوکریاں اشرفیہ طبقے کیلئے ہیں۔ غربت اب اس انتہا کو پہنچ چکی ہے کہ لوگ خود کشیاں کر رہے ہیں۔ بچوں کو قتل کر رہے ہیں۔ بازاروں میں اولاد کو فروخت کر رہے ہیں۔ مساکین کا ہجوم سڑکوں پر جھولیاں پھیلانے مانگ رہا ہے جن میں بوڑھے، بچے اور خواتین شامل ہیں۔ مگر پاکستان کے ظالم سرمایہ داروں، منافق حکمرانوں اور استحصالی دولت مندوں کو تھوڑا سا شرم و حیا بھی نہیں ہے کہ وہ خدائی مخلوق کا ذرہ برابر بھی خیال کریں اور ان کو انسان سمجھ کر ان سے لوٹی ہوئی دولت میں سے کچھ حصہ ان کو واپس کریں۔

پاکستان میں اس وقت مکمل طرح سرمایہ دارانہ نظام، جو استحصالی، طبقاتی اور مشرکانہ نظام معیشت ہے، پوری طرح نافذ اور کارفرما ہے۔ اس نظام سے جب تک سود کی لعنت سے چھٹکارا حاصل نہ کیا جائے گا، انصاف فراہم نہیں ہو سکتا۔

اسکے بعد زمین کی ملکیت کا مسئلہ ہے۔ زمین کا مالک غیر مشروط اور علی الاطلاق اللہ تعالیٰ ہے اور مسلمانوں کی اسٹیٹ خدا کی نیابت میں اس کی عارضی مالک ہے۔ زمین آباد کرنے کیلئے کسی کو ملکیت میں نہیں بلکہ آباد کرنے کیلئے دی جاسکتی ہے۔ زمین پر جو شخص محنت کر کے اناج اور فروٹ پیدا کرے گا، وہ اس چیز کا مالک ہو گا۔ یہی ذاتی ملکیت محترم اور مقدس ہوگی۔ مگر جو شخص محنت نہیں کرتا، اس کو زمین کی پیداوار کا کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ زمین بلا محنت کے کسی کو نہیں دی جاسکتی اور نہ کسی کی جائز ملکیت تصور کی جاسکتی ہے۔ اس طرح زمین کر ایہ پر یا بٹائی پر بھی نہیں دی جاسکتی۔

یہ مال باطل کی شکلیں ہیں اور یہ محنت کا استحصالی تصور ہے اور باطل اور استحصالی سے حاصل شدہ دولت قطعی طور پر حرام ہے۔ قرآن مجید میں تصریح ہے: **إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ**۔ ”زمین خدا کی ہے“ جو اسکو آباد کرے وہی اس کا وارث ہے۔

سنن ابوداؤد میں ایک حدیث موجود ہے:

اشھدان رسول اللہ ﷺ قضي ان الارض الله والعباد عباد الله۔ من احيا امواتا فهو احق بها۔ جاء هذا عن النبي ﷺ الذين جاء بالصلاة۔

”میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت رسول ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں۔ پس جو شخص کسی مردہ زمین کو آباد کرے وہی شخص اس کا زیادہ حقدار ہے۔ ہمیں یہ فیصلہ آنحضرت ﷺ کا ان لوگوں نے پہنچایا جن لوگوں نے ہم کو نماز قائم کرنے کا حکم پہنچایا ہے۔“

حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ایک حدیث کا ذکر کیا ہے کہ:

”حضور کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس کے پاس زائد سواری ہو وہ اس شخص کو دے جس کے پاس کوئی سواری نہ ہو، جس کے پاس زائد کھانا ہو وہ اس کو دیئے جائیں جس کے پاس کھانا نہیں ہے، اس طرح آپ ﷺ نے مال کے کئی اقسام گنوائے کہ وہ اپنے محروم بھائیوں کو۔ اس پر صحابہ کرامؓ نے سمجھا کہ ہمیں اپنی ضرورت سے زائد چیزوں پر کوئی حق نہیں ہے، ہمیں چاہیے کہ وہ اپنے ضرورت مند بھائیوں میں تقسیم کر دیں۔“

اسلامی ریاست کو زمین کی ملکیت سے متعلق قوانین بنانے چاہیں کہ زمین علی الاطلاق کسی کی ملکیت میں نہیں دی جاسکتی۔ زمین کا عارضی مالک وہی ہے جو اس کو آباد کرے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور میں صحابہ سے مشورہ کر کے یہ قانون بنادیا تھا کہ جو شخص تین سال تک زمین کو آباد نہ کر سکے تو زمین اس کی ملکیت سے جاتی رہے گی۔

آج کے دور میں صنعتیں، ملیں، فیکٹریاں، شوگر اور فلور ملیں وغیرہ مزدور کی محنت کے استحصالی ادارے ہیں۔ ان میں محنت کی اجرت معمولی دی جاتی ہے مگر سرمایہ اور مشینری کی اجرت پر صنعتکار ساری دولت پر قابض ہو جاتا ہے۔ یہ دولت بھی صنعتکار کیلئے حرام ہے۔ اس میں بہتر طریقہ یہ ہے کہ محنت کرنے والے مزدور کے حصے مقرر کیے جائیں اور ان حصوں کے مطابق ان کو پیداواری حصہ میں شریک بنایا جائے تاکہ مزدور بھی چند سالوں کے اندر اپنا گھر بنا سکے، اپنی کفالت سہولت سے کر سکے، اس کی اولاد اور خاندان بھی خوشحالی کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس طرح تجارت میں لیبر کے حقوق عادلانہ طریقہ سے مقرر کیے جائیں۔ ان سب کیلئے اسٹیٹ کو قانون سازی کرنی چاہیے۔ اس کے بعد زکوٰۃ کے ساتھ خمس بھی قانونی طور پر نافذ کیا جائے بلکہ اسٹیٹ کو غربت مٹانے کیلئے اور معاشرہ کے معذور، بیمار اور بوڑھے افراد کیلئے ماہواری و خائف کا نظام رائج کرنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں بھی دولت مندوں سے جبری طور پر اتفاق کرنے پر قانون سازی کرنی چاہیے۔ اسلام میں قوانین الہی پر عمل درآمد کیلئے ایمان، تقویٰ اور جذبہ انفاق کو اولین ترجیح دی گئی ہے مگر جو لوگ ایمان کے جذبہ کے تحت عمل نہ کریں تو اسٹیٹ جبری طور پر ان کو حکم دے کر بالآخر مزاحمت کر کے بھی زائد از ضرورت دولت چھیننے کا حق رکھتی ہے، تاکہ معاشرہ کے محروم اور پس ماندہ لوگوں کے حقوق ادا کیے جائیں اور انکو عزت و وقار کے ساتھ زندگی گزارنے کا اہل بنایا جاسکے۔ اسلام میں ریاست کو فلاحی اور ویلفیئر بنانے کا حکم دیا گیا ہے اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ اپنے معاشروں کو قرآن کی ہدایت پر چلانے کیلئے بھرپور کوشش کریں۔ اس سلسلہ میں سب سے اول ریاست کو مغرب کے سیاسی نظام سے نجات حاصل کرنے کیلئے جہاد کا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ ایک اسلامی ریاست اور منصفانہ حکمرانی ہی اسلام کی اقتصادی تعلیمات کو قانونی شکل دیکر معاشرہ کو خوشحال اور مطمئن بنا سکتی ہے۔

(چیف ایڈیٹر)

انسان کی حیثیت خلیفہ وامین کی ہے

(۱) اسلام میں اقتدار اعلیٰ کی بنیاد لا الہ الا اللہ ہے
اسلام ایک نظام حیات ہے، جس کی بنیاد اللہ کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنے پر ہے۔
ذَلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۚ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ (الزمر: ۶۰)
”یہی اللہ تمہارا رب ہے، اسی کی سلطنت ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تو پھر تم کہاں سے کہاں
پھر اے جا رہے ہو؟“

ذَلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ (المائدہ: ۱۰۲)
”یہی خدا تمہارا پروردگار ہے۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر وہی۔“

اس کے چند اساسی اصول یہ ہیں:
(۱) کائنات کی ہر شے کا خالق و مالک اللہ ہے اور زمین و آسمان میں اسی کی فرماں روائی ہے۔

خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ (المائدہ: ۱۰۲)
”تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا۔ سو دیکھو! اسی کی بندگی کرو۔“

خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (المومن: ۶۲)
”تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا۔“

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (البقرہ: ۲۸۴)
”آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کے لیے ہے۔“

وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ (الفرقان: ۲)
”اور جس کی جہانداری میں کوئی شریک نہیں۔“

قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهُ لِلّٰهِ (آل عمران: ۱۵۴)

”(اے پیغمبر!) تم ان لوگوں سے کہدو! (اس معاملہ ہی پر کیا موقوف ہے) ساری باتیں اللہ ہی کے
اختیار میں ہیں۔“

اِنَّ الْحُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ ۚ اَمْرًا اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ ۚ (یوسف: ۴۰)

”حکومت تو اللہ ہی کے لیے ہے، اس کا فرمان یہ ہے کہ صرف اسی کی بندگی کرو اور کسی اور کی نہ کرو۔“
(۲) اللہ الہ العالمین ہے اور اس کا قانون عدل و رحمت تمام مخلوق کے لیے یکساں ہے، وہ رب العالمین
ہے اور ہر جاندار و بے جان کی تربیت کرتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَاءِ اِلٰهُ فِي الْاَرْضِ اِلٰهُ (الزخرف: ۸۴)

”اور وہی ایک ذات ہے جو آسمان میں بھی معبود ہے اور زمین میں بھی لائق پرستش ہے۔“

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مُلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (الفاتحہ: ۳ تا ۱)

”ہر طرح کی ستائشیں اللہ ہی کی لیے ہیں جو تمام کائنات خلقت کا پروردگار ہے۔ جو رحمت والا
ہے اور جس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنی بخششوں سے مالا مال کر رہی ہے۔ جو اس دن کا مالک ہے جس دن
کاموں کا بدلہ لوگوں کے حصہ میں آئے گا۔“

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ (فاطر: ۳)

”کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا بھی خالق ہے؟ جو تمہیں آسمان و زمین کی بخشائشوں سے رزق دے رہا ہے۔“

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (هود: ۶)

”اور زمین میں چلنے والا کوئی جانور نہیں ہے جس کی روزی کا انتظام اللہ پر نہ ہو۔“

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنِ (الذاریات: ۵۸)

”بیشک اللہ تعالیٰ خود ہی رزاق، صاحب قوت اور زبردست ہے۔“

كُلًّا مَّمْدُودًا ۚ هُوَ الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ رِزْقًا ۚ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (بنی اسرائیل: ۲۰)

”ہم ہر فریق کو اپنی پروردگاری کی بخشائشوں سے (دنیا میں) مدد دیتے ہیں، ان کو بھی (کہ صرف دنیا
کے ہی پیچھے پڑ گئے) اور ان کو بھی (کہ آخرت کے طالب ہوئے اور راہ حق پر چلے) اور (اے پیغمبر!) تیرے
پروردگار کی بخشش عام ہے، کسی پر بند نہیں۔“

(۲) خلافت میں الہی حکمت عملی منعکس ہوتی ہے

(۱) انسان اس کا خلیفہ ہے اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ایسا نظام حیات قائم کرنے پر مامور ہے جس

میں صرف اللہ کی حکمت عملی منعکس ہو۔

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (البقرہ: ۳۰)

”میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔“

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ
وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ (ص: ۲۶)

”اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین میں حکمران بنایا ہے، لہذا لوگوں کے مابین انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا کر اور خواہش کی پیروی نہ کر!“

فَلَنذِكَ فَادُعْ ۖ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ط (الشوری: ۱۵)

”(اے پیغمبر! تو ان کو دعوت دے اور جو حکم دیا گیا ہے، اس پر قائم ہو جا اور ان کی خواہشوں پر نہ چل۔“
(۲) یہ حکمت عملی اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ ان کی زبان میں وقتاً فوقتاً دنیا کے ہر ملک اور قوم کے سامنے پیش کی۔

لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد: ۷)

”ہر قوم کے لیے ایک رہنما ہوا ہے۔“

وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر: ۲۴)

”اور کوئی قوم دنیا کی ایسی نہیں جس میں (بد عملیوں کے نتائج سے) متنبہ کرنے والا کوئی رسول نہ گزر ہو۔“

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ (ابراہیم: ۴)

”اور ہم نے کوئی پیغمبر دنیا میں نہیں بھیجا مگر اس طرح کہ اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام حق پہنچانے والا تھا۔“

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ
وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ط (الشوری: ۱۳)

”تمہارے لئے دین کا وہی راستہ ٹھہرایا ہے جس کے لئے نوح کو وصیت کی گئی تھی اور (اے پیغمبر اسلام!) جس کے لئے ہم نے تم پر وحی کی ہے۔ نیز یہ وہی راستہ ہے جس کے لئے ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی وصیت کی تھی، کہ دین الہی قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔“

(۳) قرآن حکیم الہی دستور کا آخری ایڈیشن ہے، جس میں اللہ کی حکمت عملی کی تشریح ہے۔

وَمَثَّ كَلِمَتٌ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ط لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۖ (الانعام: ۱۱۵)

”اور (یاد رکھو!) تمہارے پروردگار کی بات سچائی اور انصاف کے ساتھ (پوری ہو کر رہے گی۔ یوں

سمجھو کہ) پوری ہو گئی۔ اس کی باتوں کا (یعنی اس کے قانون کا) کوئی بدلے والا نہیں۔“

یہ اساسی اصول تمام الہی کتابوں میں بیان کئے گئے تھے لیکن زمانہ کے دستبرد سے وہ محفوظ نہ رہ سکے۔ البتہ قرآن حکیم میں وہ اپنی اصل صورت میں آج تک مکمل طور سے محفوظ ہیں اور تمام انسانوں کے لیے قدیل راہ بنے ہوئے ہیں۔

وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ
بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۖ (البقرہ: ۲۱۳)

”اور یہ جو لوگ باہم دگر مختلف ہوئے تو اس لیے نہیں ہوئے کہ ہدایت سے محروم اور حقیقت سے بے خبر تھے۔ نہیں، وحی الہی کے واضح احکام ان کے سامنے تھے مگر پھر بھی محض آپس کی مخالفت سے اختلاف کرنے لگے تھے۔“

قَوِيلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ۖ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ (البقرہ: ۷۹)

”پس افسوس ان پر جن کا شیوہ یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں (یعنی اپنی راہوں اور خواہشوں کے مطابق احکام شرع کی کتابیں بناتے ہیں) پھر لوگوں سے کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ (یعنی اس میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، وہ کتاب الہی کے احکام ہیں)“

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (الحجر: ۹)

”بلاشبہ خود ہم نے ”الذکر“ (یعنی قرآن کہ سر تا پا نصیحت ہے) اتارا ہے اور بلاشبہ خود ہی اس کے نگہبان ہیں۔“

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ط تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ (الحم سجدہ: ۴۲)

”نہ تو اس کے آگے باطل جم سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے اسے جگہ مل سکتی ہے، وہ خدائے حکیم و مجید کا اتارا ہوا ہے۔ (پھر باطل کا یہاں کیا گزر ہو گا؟)“

(۳) خلافت کے اساسی اصول

ان حقائق کے پیش نظر خلافت الہیہ کے مندرجہ ذیل اصول سامنے آتے ہیں:

(۱) انسان کی سماجی تنظیم میں اللہ ہی کی حکومت و فرمانروائی ہوگی اور اسی کا اقتدار اعلیٰ مسلم ہوگا۔

(۲) خلافت الہیہ کی تنظیم عالمگیر ہوگی۔

(۳) اس کی افادیت، ربوبیت کے لحاظ سے ہر قوم و ملت کے لیے عام اور یکساں ہوگی۔

چونکہ اس کتاب کا کچھ تعلق نظام ربوبیت کی ایک شق نظام رزق سے ہے، اس لیے اسی بحث کی طرف

زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ ربوبیت کا مفہوم اور خلیفہ کی حیثیت و فرائض متعین ہو جانے کے بعد زرعی نظام کی روح معلوم کرنا آسان ہو۔

(۴) ربوبیت کا مفہوم اور خلافت کی ذمہ داری

ربوبیت کا مفہوم یہ ہے:

”کسی چیز کو اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق محبت اور شفقت کے ساتھ اس طرح نشو و نما دیتے رہنا کہ وہ اپنی حد کمال کو پہنچ جائے۔“^۱

اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ”ربوبیت“ کا مفہوم صرف اسباب مہیا کر دینے پر ختم نہیں ہو جاتا، اسباب کی تنظیم اور بخشش کا نظام بھی اس میں داخل ہے، کیونکہ اللہ جو کچھ دیتا ہے ایک مقررہ نظم و عدل کے ساتھ دیتا ہے۔ بارانِ رحمت عام ہوتی ہے اور ہر شے اپنی صلاحیت کے مطابق ایک نظم کے ماتحت اس سے مستفید ہوتی ہے۔

وَمَا نُنْزِلُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ (الحجر: ۲۱)

”مگر ہم انہیں ایک ٹھہرائے ہوئے اندازے کے مطابق ہی بھیجتے ہیں۔“

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (القر: ۴۹)

”ہم نے ہر چیز کو اندازے سے پیدا کیا ہے۔“

اور یہ بات بھی کھل جاتی ہے کہ ربوبیت کا مفہوم کسی خاص شعبہ حیات کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس میں ذہنی و جسمانی، روحانی و سماجی غرض ہر قسم و ہر شعبہ کی ترقی و نشو و نما شامل ہے۔

خلیفہ رب العالمین کے لیے حتی الوسع ایسا ہی نظام قائم کرنا ضروری ہے۔ یعنی اس کے قلم و خلافت میں تربیت و نشو و نما کا پروگرام عالمگیر اصولوں پر ہوا اور جس وقت جیسی کچھ ضرورتیں پیش آئیں، ان سب کے لیے ہو، تاکہ بلا تخصیص مذہب و ملت ذرائع اور مواقع سب کے لیے مہیا ہوں اور ایک مقررہ نظم و عدل کے ساتھ اپنی صلاحیت کے مطابق سب مستفید ہوں۔ دراصل اسی مقصد کی تکمیل کے لیے کارساز حقیقی نے زمین و آسمان کی ہر چیز انسان کے لیے مسخر کی ہے اور تمام مخلوقات سے ممتاز و مکرم کر کے یہ ”امانت“ اس کے سپرد کی ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (الباقیہ: ۱۳)

”اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، وہ سب اللہ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا۔ (ان کی قوتیں

^۱ مفردات امام راغب اصفہانی میں ربوبیت کا یہی مفہوم ذکر کیا گیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ”هو انشاء الشيء حالا فحالاً الى حد التمام“ ۱۲۔ از ترجمان القرآن۔

اور تاثیریں اس طرح تمہارے تصرف میں دے دی گئیں کہ جس طرح چاہو کام لے سکتے ہو)“

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (بنی اسرائیل: ۷۰)

”اور البتہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور خشکی اور تری دونوں کی قوتیں اس کے تابع کر دیں کہ اسے اٹھائے پھرتی ہیں اور اچھی چیزیں اس کی روزی کے لیے مہیا کر دیں، نیز جو مخلوقات ہم نے پیدا کی ہیں، ان میں سے اکثر پر برتری دے دی پوری برتری جیسی کہ ہونی چاہیے۔“

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ (الاحزاب: ۷۲)

”ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی لیکن سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس بارگراں کے متحمل نہ ہو سکے لیکن انسان آگے بڑھا اور اس نے بلا تامل اٹھالیا۔“

(۵) خلافت امانت ہے اور خلیفہ امین اللہ

اس بنا پر خلافت ”امانت“ ہوگی اور خلیفہ امین اللہ۔ خلافت مملکت کی تمام امانتوں کی نگرانی کرے گی اور ان کو اس طرح تنظیم و تقسیم کرے گی کہ وہ مخلوق کے لیے خدا کی صفت ”رزاق“ کا مظہر بن جائے۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النساء: ۵۸)

”(مسلمانو!) خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو جس کی امانت ہو وہ اس کے حوالے کر دیا کرو، (ایسا نہ کرو کہ حق دار و اہل حق سے انکار کرو)۔ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو چاہیے کہ انصاف کے ساتھ کرو۔“

وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلِفِينَ فِيهِ (الحدید: ۷)

”اور اس مال میں سے خرچ کرو جس پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔“

چونکہ خلافت الہی میں ہر شے کا حقیقی مالک اللہ ہے، اس لیے مملکت کی ساری چیزیں افراد کو بطور ”امانت“ استعمال کے لیے دی جائیں گی اور ہر فرد کی حیثیت ”امین“ کی ہوگی۔ اس قسم کی تنظیم کو بروئے کار لانے کے لیے خلافت کے پیش نظر ایک معین مقصد ہو گا اور دوسرا اس مقصد کے لیے طریق کار۔

مقصد تو یہ ہو گا کہ جس طرح اللہ اپنی تمام مخلوق کو عادلانہ طور سے روزی دیتا ہے اور اس کے نظام تنظیم و تقسیم میں تخصیص و ترجیح کی صورت نہیں پیدا ہوتی ہے ایسے ہی خلافت کا فرض ہو گا کہ وہ اللہ کی مخلوق کے لیے سامان خور و نوش مہیا کرے اور بلا تخصیص مذہب و ملت حسب ضرورت و صلاحیت عدل کے ساتھ

ان میں تقسیم کرے۔

اور جس طرح اللہ اپنی تمام مخلوق کے رزق کا ذمہ دار ہے اور یہ سب سامان رزق کا پھیلاؤ اسی کے کرشمہ قدرت کا نتیجہ اور اسی کی عطاء و بخشش کا نمونہ ہے اسی طرح خلافت کا فرض ہو گا کہ وہ مفاد عامہ کے پیش نظر حسب حاجت و مصلحت اس طرح سامان رزق کی تنظیم و تقسیم کرے کہ وہ اللہ کی مخلوق کو روزی پہنچا کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکے۔

وَمَنْ يَزِرْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۖ إِنَّ إِلَهَكُمْ اللَّهُ (النمل: ۶۴)

”اور وہ کون ہے جو آسمان و زمین کے کارخانہ ہائے رزق سے تمہیں روزی دے رہا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟“

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (هود: ۶)

”اور زمین میں چلنے والا کوئی جانور نہیں ہے جس کی روزی کا انتظام اللہ پر نہ ہو۔“

(۶) ذرائع پیداوار کی تنظیم و تقسیم، خلق اللہ کے مفاد کے پیش نظر ہوتی ہے

رہ گیا طریق کار کا مسئلہ کہ اس مقصد تک پہنچنے کے لیے راستہ کون سا اختیار کیا جائے؟ تو اس سلسلہ میں خلافت کے پیش نظر صرف دو باتیں قابل توجہ ہوں گی:

(۱) ذرائع پیداوار کی تنظیم اور (۲) پیداوار کی تقسیم۔

چونکہ مقصد متعین ہے، اس لیے تنظیم و تقسیم کی شکل کے تعین میں کسی خاص الجھاؤ اور پیچیدگی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے، بلکہ وہ مقصد کے پیش نظر اس طرح تنظیم و تقسیم پر مامور ہے کہ بالآخر خلق اللہ کو رزق طیب میا ہو سکے۔ یہ بندش نہیں ہے کہ ذرائع پیداوار افراد کے سپرد کئے جائیں یا جماعتوں کے سپرد ہوں۔ البتہ یہ بات ضروری ہے کہ جن کے سپرد ذرائع پیداوار کئے گئے ہیں، وہ افراد ہوں یا جماعتیں، حکومت الہی میں سب کی حیثیت محض ”امین“ کی ہوگی اور ان سب کو اس وقت تک استعمال کا حق ہو گا جب تک کہ وہ حصول مقصد میں خلافت کا ہاتھ بٹاتے رہیں اور ایسی فضاء پیدا کرنے میں مددگار بنیں جو عام مخلوق کی خوشحالی و ترقی کی ضامن ہو۔

(۷) ذرائع پیداوار مفاد عامہ کے لیے ہیں، تنہا خوری کے لیے نہیں ہیں

بہر حال یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ خلافت الہی میں ذرائع پیداوار، ذاتی و قار اور اقتدار بڑھانے کے لیے کسی کے پاس نہیں رکھے جاسکتے کہ وہ تنہا یا جماعتی حیثیت سے سرچشمہ رزق پر قابض ہو کر کمزوروں کو

اپنی غلامی پر مجبور کر سکے۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرِيَّةٍ بِطَرَتِ مَعِيشَتَهَا (القصص: ۵۸)

”اور کتنی ہی آبادیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا، حالانکہ اسباب معیشت سے وہ لامال تھیں۔“

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۖ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً ۖ فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ (الانعام: ۴۴)

”پھر جب ایسا ہوا کہ جو کچھ نصیحت انہیں کی گئی تھی، اسے انہوں نے بھلا دیا تو ہم نے (بظاہر) ان پر ہر طرح (کی خوش حالیوں) کے دروازے کھول دیئے، یہاں تک کہ (اپنی کامرانیوں پر) خوشیاں منانے لگے۔ لیکن جب ایسا ہوا تو اچانک (جزائے عمل کا قانون حرکت میں آگیا اور) ہم نے انہیں پکڑ لیا، پس ناگہا نا امید ہو کر رہ گئے۔“

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرِيَّةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا (نہ اسرائیل: ۱۶)

”اور جب ہمیں منظور ہوتا ہے کہ کسی بستی کو ہلاک کریں تو ایسا ہوتا ہے کہ اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں (یعنی وحی کے ذریعے احکام حق پہنچا دیتے ہیں) پھر وہ بجائے اس کے کہ اس کی تعمیل کریں نافرمانی میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔ پس ان پر عذاب کی بات ثابت ہو جاتی ہے اور (پاداش عمل میں) انہیں برباد و ہلاک کر ڈالتے ہیں۔“

اس ضمن میں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خلافت الہی میں انفرادی و اجتماعی ملکیت کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اصل چیز مقصد ہے۔ اگر افراد میں تقسیم کرنے سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہے تو ذرائع پیداوار فرداً فرداً تقسیم کر دیئے جائیں گے اور اجتماعی طور سے کاشت کرانے میں عام نفع ہو تو اس کے لیے بھی کوئی روک نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدمت خلق پر زیادہ زور دیتا ہے، اس کی نظر میں فرائض کی اہمیت زیادہ ہے اور حقوق اس سے متعلق ہیں، یعنی جس طرح اسلام کی عدالت سے ہر شخص کو یہ حق ملتا ہے کہ وہ زندہ رہے اور ضروریات زندگی سے متفع ہو، اس سے زیادہ اس بات کی تاکید کی جاتی ہے کہ وہ دوسرے کو زندہ رہنے دے اور ایثار و قربانی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرے۔

(۸) مسئلہ ملکیت کا غلط تصور

بد قسمتی سے ذرائع پیداوار کی تنظیم میں سب سے زیادہ اہمیت مسئلہ ملکیت کو دے دی گئی ہے۔ انفرادی و اجتماعی، عارضی و دائمی وغیرہ قسم کے مسائل ایسے تباہ کن بن گئے ہیں کہ انہوں نے انسان کو اصل مقصد سے

منزلوں دور کر دیا ہے اور خلق خدا کی حقیقی خوشحالی و فارغ البالی اس کشمکش کی نذر ہو کر رہ گئی ہے۔ حالانکہ تاریخ شاہد ہے کہ عالمگیر انقلابات اور طبقاتی فسادات کی جڑ ہمیشہ یہی مسائل رہے ہیں۔ انہی کے غلط تصور نے اکثر ایسے انسانیت سوز نتائج پیدا کئے کہ ایک طرف بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے دولت و سامان عیش کی ناقابل تصور فراوانی ہو گئی تو دوسری طرف محنت و مشقت کے باوجود ذلت و کلبت سے اموات کا بھیانک اور لرزادینے والا منظر۔

(۹) اسلامی نظریہ ملکیت

اسلام نے اس بحث کو ایک لفظ ”خلافت“ سے ختم کر دیا ہے کہ کھیتی باڑی کی کیا خصوصیت ہے؟ زمین و آسمان کی ہر چیز کا مالک اللہ ہے اور یہ ساری چیزیں بحیثیت ”خلیفہ“ انسان کو بطور ”امانت“ استعمال کیلئے دی گئی ہیں اور ہر ”امین“ کو ان کے استعمال کا حق اسی وقت تک ہے جب تک اس سے مفاد عامہ میں خلل پڑنے کا اندیشہ نہ ہو۔ ورنہ خلافت کو اس کا جائز حق پائمال کئے بغیر ہر تصرف کا اختیار دیا گیا ہے۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ط (النساء: ۱۳۲)

”اور (بے شک) اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔“

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (یونس: ۱۴)

”پھر ان امتوں کے بعد ہم نے تمہیں ان کا جانشین بنایا تاکہ دیکھیں تمہارے کام کیسے ہوتے ہیں؟“

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلْنٰكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ (الحدید: ۷)

”اور اس مال میں سے خرچ کرو جس پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔“

اس حق استعمال اور حق انتفاع کو ”ملکیت“ سے تعبیر کریں تو مضائقہ نہیں ہے اور نہ اس سے کسی کلیہ پر زد پڑتی ہے بلکہ اسلام میں جہاں کہیں بھی شخصی و اجتماعی ملکیت کا ذکر ہے، اس سے اس قسم کی ملکیت مراد ہے۔ اس توضیح کے بعد اب یہ بات رہ جاتی ہے کہ پیداوار کی تقسیم کس طرح کی جائے؟ کہ جس سے اصل مقصد حاصل ہو۔

(۱۰) تقسیم پیداوار کی بنیاد، عدل و احسان ہے

اس سلسلہ میں اسلام نے دو اصول مقرر کئے ہیں: (۱) عدل اور (۲) حسن عمل کی جزاء۔ ضرورت اور صلاحیت کے لحاظ سے تقسیم رزق میں عدل ہو اور ”حسن عمل“ کی بناء پر انعام و اکرام، تاکہ ایک طرف ہر شخص کو اس کی ضروریات زندگی فراہم ہوتی رہیں اور دوسری طرف جدوجہد اور سعی

و عمل کے میدان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبہ بھی سرد نہ ہونے پائے۔
اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (النحل: ۹۰)

” (مسلمانو!) اللہ حکم دیتا ہے کہ (ہر معاملہ میں) انصاف کرو، (سب کے ساتھ) بھلائی کرو۔“

وَمَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرَّٰزِقِيْنَ (سبا: ۳۹)

”اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے، وہ اس کی جگہ تمہیں اور عطا فرمادے گا اور وہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔“

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ (الحدید: ۷)

”پس جو لوگ تم میں سے ایمان لے آئیں اور مال خرچ کریں، ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔“

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيِّنٰتٍ لَّهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ

(الزخرف: ۳۲)

”ہم نے دنیاوی زندگی میں ان کے درمیان ان کی معیشت تقسیم کر دی اور ایک کو کئی درجے دوسرے پر بلند کیا۔“

وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَا اَتٰكُمْ ط (الانعام: ۱۶۵)

”اور تم میں سے بعض کو بعض پر (اعمال کے لحاظ سے) مرتبے دیئے تاکہ جو کچھ (اختیار) تمہیں دیا گیا ہے، اس میں تمہیں آزمائے (اور طلب اور کوشش کے مواقع دے، اے پیغمبر!)۔“

(۱۱) روٹی اور ملکیت کے وحشیانہ تصور سے نجات

یہ ہے ”زرعی نظام“ کی روح جو قرآن حکیم نے ”وادی غیریذی زہر“ سے پیش کی ہے، تاکہ انسان ”روٹی“ اور ملکیت کے وحشیانہ تصور سے نجات حاصل کر کے اپنا فطری حسن و جمال اور ”جوہر افادیت“ نمایاں کر سکے اور زمین پر بحیثیت مجموعی ”خلیفۃ اللہ“ کا درجہ حاصل کر لے۔

چنانچہ خلافت الہی میں ایک طرف تو ”ماذا ینفقون“ کا جواب ”العفو“ ہے کہ جو کچھ ضرورت سے زائد اور مفید ہے، اسے خلق اللہ کے لیے خرچ کر دو اور دوسری طرف ”ایک نعبد وایک نستعین“ کی تعلیم ہے، یعنی اس بات پر ایمان پیدا کر لیا گیا ہے کہ سرچشمہ رزق کا حقیقی مالک اللہ ہے اور اسی کے قبضہ قدرت میں رزق کے خزانے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اس حقیقت کو پالینے کے بعد نہ ”ملکیت“ کی آڑ میں جو رواستبداد کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے اور نہ ”روٹی“ کی خاطر انسان غیر اللہ کی غلامی پر مجبور ہو سکتا ہے۔

(۱۲) امین اللہ کی ذمہ داری

چونکہ خلافت الہی کا خلیفہ ”امین اللہ“ ہوتا ہے اور خدا کی حاکمیت و جلال و جبروت کے سامنے جوابدہ۔ اس لیے وہ ”جو“ کے سوکھے ٹکڑے کھاتے ہوئے بھی بے چینی محسوس کرتا ہے اور لرزتا ہے کہ کہیں اس وقت مملکت کا کوئی فرد بھوکا نہ رہ گیا ہو اور اس کے متعلق رب العلمین کے سامنے جوابدہی کرنی پڑے۔ جواب دہی کا دراصل یہ وہ بنیادی و حقیقی تصور ہے کہ اس کو گوشہ ستہائی میں بھی کسی کی معمولی حق تلفی کے خیال سے باز رکھتا ہے اور اسی کے پیش نظر وہ ذرائع پیداوار کو اس طرح استعمال کرتا ہے کہ اس سے اللہ کی مخلوق کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچ سکے، اس میں سے نہ کوئی چیز بیکار رہنے پائے اور نہ ضائع ہو۔

خلاصہ بحث

- ۱۔ اسلام ایک نظام حیات ہے جس کی بنیاد ”اللہ“ کا اقتدارِ اعلیٰ ماننے پر ہے۔
- ۲۔ اسلامی نظریہ کے مطابق کائنات کی ہر شے کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اور انسان اس کا نائب ہے اس لیے ساری چیزیں ”بطور امانت“ اس کو استعمال کے لیے دی گئی ہیں، اور اسے اس وقت تک انہیں استعمال کرنے کا حق ہے جب تک مفادِ خلق میں خلل نہ پڑے اور کسی کی حق تلفی کا باعث نہ بنے۔
- ۳۔ مملکت کی ہر تنظیم و تقسیم میں بنیادی حیثیت سے ”رو بیت“ کا نظریہ کار فرما ہونا چاہیے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوق کو رزق پہنچانے کا ذمہ دار ہے اسی لیے اس نے دنیا میں ہمہ قسم کا سامان رزق پھیلا رکھا ہے اور قانون و اصول کے ذریعہ یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ مملکت کی ہر دولت میں تمام انسانوں کے ”حقوق“ مساوی ہیں۔ اب حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ دولت کے اس طرح تنظیم و تقسیم کرے کہ تمام اہل ملک اور ان کی آنے والی نسلیں اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ نہ کسی کو محروم رکھا جائے اور نہ کوئی بے کار و بے روزگار رہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس دولت پر سرمایہ داروں، زمینداروں اور جاگیرداروں کا قبضہ ہو جائے اور ملک کا ایک بڑا طبقہ طبقاتی کشمکش کا شکار ہو کر در بدر کی ٹھوکری کھاتا پھرے۔
- ۴۔ ذرائع پیداوار کی تنظیم و تقسیم ایک مقصد کے پیش نظر ہونی چاہیے اور وہ مقصد یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق کو رزق حلال میسر ہو اور اس کی بنیادی ضروریات پوری ہوں۔

افراد میں ذرائع پیداوار اور تقسیم کرنے سے یہ مقصد پورا ہوتا ہے تو خلافت کو اختیار ہے کہ انہیں افراد میں ذرائع پیداوار تقسیم کر دے اور اجتماعی طور سے ذرائع پیداوار کو استعمال کرانے میں کامیابی کی توقع ہو تو اس کے لیے بھی کوئی روک نہیں ہے۔

مولانا عمر احمد عثمانی

اسلام کا تصور ملکیت

زکوٰۃ، اسلام کے پانچ ارکان میں سے دوسرا بہت اہم رکن ہے۔ قرآن کریم میں اقبیو الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ کے الفاظ بار بار آئے ہیں اور زیادہ تر ایک ساتھ آئے ہیں۔

انسانی زندگی کے دو اہم اجزاء ہیں: روح اور جسم اور یہ دونوں ساتھ ساتھ ہوں تو اسی کو زندگی کہتے ہیں۔ اگر جسم نہیں ہے صرف روح ہی روح ہے (جو موت کے بعد بھی فنا نہیں ہوتی) تو اسے بیکار سمجھا جاتا ہے۔ وہ اس دنیا کی چیز ہی نہیں رہی، وہ عالم آخرت کی ایک چیز ہے اور اگر صرف جسم ہے اور روح نہیں ہے تو وہ بھی بیکار محض ہے۔ اسے بیکار سمجھ کر منوں مٹی کے نیچے دبا دیا جاتا ہے۔

صلوٰۃ سے ہماری روحانی بالیدگی ہوتی ہے اور زکوٰۃ سے ہماری جسمانی بالیدگی ہوتی ہے۔ روحانی بالیدگی سے ہماری مراد وہ روحانیت نہیں ہے جو صوفی ازم کی روح ہے بلکہ اخلاقی، ایمانی، عقائدی اور نظریاتی بالیدگی مراد ہے۔ اس سے ایمان کی پختگی، خوفِ خدا، تقویٰ اور دوسرے تمام اخلاقِ حسنہ پیدا ہوتے ہیں اور اخلاقِ سیئہ سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ خدا، یومِ آخرت، عذاب و ثواب یعنی مکافاتِ عمل کا ہمہ وقت تذکرہ حاصل ہوتا ہے اور زکوٰۃ سے قوم کی معاشی اور معاشرتی ہم آہنگی اور بہتری پیدا ہوتی ہے۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے زیادہ تر دونوں کا تذکرہ ساتھ ساتھ فرمایا ہے۔

زکا البہال والذرع یزکوا: جانوروں اور کھیتی کا پھلنا پھولنا، نشوونما پانا ہے۔ ازی اللہ البہال: خدا نے مال کو نشوونما دی، بڑھایا۔ زکا الرجل یزکوا: آدمی آسودہ اور خوش حال ہو گیا، اس کی زندگی سرسبز و شاداب ہو گئی، اس کی صلاحیتوں میں نشوونما آگئی۔ لہذا زکا کے بنیادی معنی نشوونما پانا، بڑھنا، پھلنا پھولنا ہیں۔ الزکوٰۃ کے معنی ہیں: نشوونما، بالیدگی، پھلنا پھولنا، ترقی پانا۔ پاکیزگی کا مفہوم بھی اس میں داخل ہے۔ (تاج العروس وغیرہ)

قرآن کریم جس قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمان اخلاقی طور پر بلند یوں پر فائز ہوں، ان میں خدا ترسی اور تقویٰ بدرجہ اتم موجود ہو، جن نظریات پر وہ ایمان و ایقان پیدا کرنا چاہتا ہے، ان میں وہ پوری طرح پختہ ہوں اور افرادِ معاشرہ ایک دوسرے کے محتاج نہ رہیں، انہیں اپنی ذات اور طبعی زندگی کی نشوونما کا پورا سامان بغیر کسی مشقت اور جان کا ہی کے بہ سہولت حاصل ہوتا ہے۔ سورہ حج میں ہے:

الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ (ن: ۳۱)

”یہ (جماعت مؤمنین) وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں زمین پر اقتدار حاصل ہو گا تو وہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے۔“

لہذا زکوٰۃ وصول کرنا اور مستحق لوگوں تک اسے پہنچانا حکومت کا فریضہ ہے۔ وہی لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرے گی اور مستحق لوگوں تک اسے پہنچائے گی۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس باب میں حکومت کے ساتھ تعاون کریں بشرطیکہ حکومت اسلامی ہو اور وہ اسلام کے پورے نظام کو قائم کرنے کی پابند ہو۔ ایسی غیر مسلم حکومت یا ایسی مسلمانوں کی حکومت جو اسلام کے پورے نظام کو قائم کرنے کی پابند نہ ہو، نہ مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کر سکتی ہے اور نہ مسلمان ایسی حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے کے پابند ہیں۔

ملکیت کا تصور

زکوٰۃ کے سلسلہ میں ایک بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہر قسم کے اموال جو انسان کی تحویل میں ہوتے ہیں، قرآن کریم کے نقطہ نظر سے ان کی حیثیت کیا ہوتی ہے؟ کیا انسان ان کا مالک ہے اور اُسے اپنی ملکیت میں ہر نوع کے تصرفات کا پورا پورا حق حاصل ہے یا وہ ان کا بالکلیہ مالک نہیں ہے یعنی اسے اپنے مال میں تصرفات کے کئی اختیارات نہیں ہیں؟

آج دنیا میں دو قسم کے نظریے پائے جاتے ہیں: ایک نظریہ تو یہ ہے کہ انسان کو انفرادی ملکیت کا حق حاصل ہے اور اسے اپنے مال میں ہر تصرف کا حق حاصل ہے۔

دوسرا نظریہ اس کے مقابلہ میں یہ ہے کہ انسان کو انفرادی ملکیت کا حق حاصل نہیں ہے، ہر چیز اجتماعی ملکیت میں ہوتی ہے۔ لہذا افراد کو ان پر تصرف کا حق بھی حاصل نہیں ہے۔ بجز ان محدود اشیاء کے جن پر اجتماع اسے تصرفات کا حق دیدے، مثلاً دونوں وقت کی غذا، سر ڈھانپنے اور موسمی اثرات سے بچنے کو لباس وغیرہ۔ البتہ تصرفات کے کئی حقوق اجتماع کو حاصل ہیں، کیونکہ وہی سب کا مالک ہے۔ پہلا نقطہ نظر سرمایہ دارانہ نظام کہلاتا ہے اور دوسرا نقطہ نظر سوشلسٹ نظام کہلاتا ہے۔ اسلام کا اپنا الگ نظام ہے جو نہ سرمایہ دارانہ ہے اور نہ سوشلسٹ ہے۔

پہلے نقطہ نظر والے کہتے ہیں کہ ہر انسان اپنی محنت اور لیاقت سے مال پیدا کرتا ہے جس میں کسی دوسرے کو دخل اندازی کا کوئی حق نہیں ہے۔ جس نے مال پیدا کیا ہے اسے اپنے مال میں ہر تصرف کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ یہ وہی نقطہ نظر ہے جو قارون نے پیش کیا تھا۔ قرآن کریم نے اس نقطہ نظر کو رد کر دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسَى فَبَغَى عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولَى الْقُوَّةِ ۚ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ۖ وَابْتَغِ فِيمَا

أَتَيْتَكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفُسَادَ فِي الْأَرْضِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٤٠﴾ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي ۖ أَوَلَمْ يَعْلَم أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ قُوَّةً وَأَكْثَرُ جَعًا ۖ وَلَا يُسْئَلُ عَنْ دُونِهَا الْمُبْرِمُونَ (القصص: ۷۶ تا ۷۸)

”بلاشبہ قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھا۔ چنانچہ اس نے اسراہیلیوں پر زیادتی کی۔ ہم نے اُسے اتنے خزانے دیئے تھے کہ اس کی کنجیاں کئی طاقت ور آدمی مشکل سے اٹھاپاتے۔ یاد کرو جب اس کی قوم نے قارون سے کہا کہ زیادہ اترنا نہیں۔ یقیناً اللہ اترنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ اور جو کچھ اللہ نے تجھے دیا ہے اس میں عالم آخرت کی بھی جستجو کر اور (ساتھ ہی) دنیا سے بھی اپنے حصہ کو فراموش نہ کر۔ اور جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان فرمایا ہے تو بھی لوگوں کے ساتھ (ضرورت مندوں کی مدد کر کے) احسان کیا کر اور زمین میں فساد کی خواہش نہ کر۔ بلاشبہ اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ قارون نے جواب دیا کہ جو کچھ مجھے دولت ملی ہے وہ میری اس ہنرمندی کی وجہ سے ہے جو میرے پاس ہے (اور تمہارے پاس نہیں ہے)۔ کیا اس نے اتنا بھی نہیں جانا کہ اللہ نے اس سے پہلے ایسی ایسی اُمّتوں کو ہلاک کر دیا ہے جو اس سے کہیں زیادہ قوت میں مضبوط و مستحکم تھیں اور زیادہ سے زیادہ جمعیتیں اپنے ساتھ رکھتی تھیں اور (جب تباہی کا وقت آتا تو) ہجر موموں سے ان کے جرائم کے متعلق پوچھا نہیں جاتا۔“

آپ نے دیکھا کہ حق تعالیٰ نے قصہ کی ابتدا ہی ان الفاظ سے فرمائی ہے:

وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ ”اور اسے اتنے بڑے بڑے خزانے ہم نے دیئے تھے۔“

لیکن قارون کا دعویٰ یہ تھا کہ ”مجھے جو کچھ دولت ملی ہے، وہ میری اس ہنرمندی سے ملی ہے جو میرے پاس موجود ہے۔ اس میں کسی دوسرے کا کوئی حق نہیں ہے۔“ لیکن قرآن کریم نے اس کے دعوے کو تسلیم نہیں کیا اور گزشتہ قوموں کی تباہیوں کو دلیل میں پیش کر دیا ہے جو قارون سے کہیں زیادہ طاقتور تھیں۔ یہ دلیل ایسی ہے جس سے کوئی ذی عقل اور ہوشمند انکار نہیں کر سکتا۔ ایسے واقعات آج بھی ہمارے سامنے پیش آتے رہتے ہیں۔ بہر حال آیات سے معلوم ہو گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے کہ آدمی جو کچھ کماتا ہے، وہ بالکلیہ اسی کی ہنرمندی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

استدلال کا دوسرا جزویہ تھا کہ آدمی کو اپنی کمائی ہوئی دولت میں اپنی مرضی کے مطابق ہر تصرف کا پورا پورا حق حاصل ہے، اس پر کسی کو کوئی قدغن لگانے کا حق نہیں ہے۔ قرآن کریم نے اس جزو کی بھی تردید کر دی ہے۔ قوم شعیب علیہ السلام کے واقعہ میں ہے:

قَالُوا يٰشُعَيْبُ أَصْلَوكَ تَأْمُرُكَ أَنْ تَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَنْ تَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ ۚ إِنَّكَ لَأَنْتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ (هود: ۸۷)

”قوم نے کہا، اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں کی پرستش چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے آئے ہیں یا اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم اس تصرف کو چھوڑ دیں جو ہم اپنے مالوں میں اپنی مرضی کے مطابق کرتے ہیں۔ یقیناً آپ تو بردبار اور سمجھ دار آدمی ہیں۔“

یعنی کیا آپ کی نماز اور روزہ اور آپ کی یہ دینداری ہمیں اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرفات کرنے سے بھی روکتی ہے؟ آپ تو بڑے بردبار اور سمجھ دار آدمی تھے۔ یہ آپ کو کیا ہوا کہ آپ ایسی بیوقوفی کی باتیں کرنے لگے۔ مال ہمارے ہیں۔ ہم ان میں جو چاہیں تصرف کریں۔ دینداری اور مذہبیت کو اس سے کیا واسطہ؟ لیکن حق تعالیٰ نے ان کی اس دلیل کو تسلیم نہیں فرمایا بلکہ کہا:

وَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِنَّا وَأَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةَ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جُثُمِينَ (هود: ۹۴)

”اور جب ہمارا حکم آپہنچا تو ہم نے شعیب کو اور ان لوگوں کو جو اُن کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت سے بچالیا اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا انہیں ایک زبردست چیخ نے پکڑ لیا، چنانچہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔“

چنانچہ اس جہت بازی کے نتیجے میں پوری قوم ہی ختم کر دی گئی۔ بہر حال قرآن کریم نے سرمایہ دارانہ نظام کا جو استدلال تھا جس کے دو اجزاء تھے کہ: (۱) جو دولت ہم کماتے ہیں وہ ہماری ہنر مندی اور صلاحیت سے پیدا ہوتی ہے، لہذا ہم اس کے پوری طرح مالک ہیں۔ اور یہ کہ: (۲) ہمیں اپنی دولت میں ہر تصرف کا حق حاصل ہے۔ دین اور مذہب کا اس میں کیا دخل ہو سکتا ہے، ہم جسے چاہیں دیں اور جسے چاہیں نہ دیں۔ ہم اسے جمع کر کے رکھیں یا خرچ کر دیں۔

ان دونوں اجزاء کو قرآن کریم قبول نہیں کرتا۔

رہ گیا دوسرا نظریہ جسے اشتراکیت یا سوشلسٹ نظریہ کہا جاتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ افراد کو انفرادی ملکیت کا حق حاصل نہیں ہے۔ ہر چیز اسٹیٹ کی ملکیت ہے، کیونکہ اسٹیٹ ہی اجتماع کی نمائندہ ہوتی ہے۔ وہی دولت میں ہر تصرف کی حقدار ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ محض بیوقوف بنانے والی بات ہے۔ اسٹیٹ یا اجتماع افراد قوم کے نام پر چند افراد کا مجموعہ ہوتا ہے جو لوگوں کو زور زبردستی یا دھونس اور دھاندلی سے مجبور کر کے ان کی نمائندگی کا حق حاصل کر لیتے ہیں یا لوگوں کو بیوقوف بنا کر ان کے ووٹوں سے منتخب ہو جاتے ہیں اور پوری قومی دولت پر قابض ہو جاتے ہیں۔ ملکیت کے مدعی انفرادی طور پر الگ الگ افراد ہوں یا اجتماعی طور پر چند افراد کا مجموعہ ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بات وہی رہتی ہے کہ ملکیت کا حق افراد کو حاصل ہو جاتا ہے۔ جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے وہ افراد کی ملکیت کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی تعلیم اور ہدایت تو یہ ہے کہ:

بَلْ لَّهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (البقرہ: ۱۱۶)

”بلکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ اسی (اللہ ہی) کی ملکیت ہے۔“

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ط (البقرہ: ۲۸۴)

”اللہ ہی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔“

وَلِلّٰهِ مِيزَانُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (آل عمران: ۱۸۰)

”اور اللہ ہی کے لئے ہے میراث آسمانوں اور زمین کی۔“

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (آل عمران: ۱۸۹)

”اور اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کی حکومت اور ملکیت ثابت ہے۔“

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ط (المائدہ: ۱۷)

”اور اللہ ہی کے لئے ثابت ہے ملکیت اور حکومت آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کی بھی۔“

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (المائدہ: ۴۰)

”کیا تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی ملکیت اور حکومت۔“

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ط (المائدہ: ۱۲۰)

”اور آسمانوں اور زمین اور جو کچھ بھی ان میں ہے، سب کی ملکیت و حکومت اللہ ہی کے لئے ہے۔“

قُلْ لِّمَنۡ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط قُلْ لِلّٰهِ ط (الانعام: ۱۲)

”اے پیغمبر اسلام! کہئے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ آپ کہئے کہ اللہ ہی کا تو ہے۔“

اَلَا اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (یونس: ۶۶)

”یاد رکھو! حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ ہی کا ہے۔“

صرف آسمانوں اور زمین کے اموال، ساز و سامان، دولت وغیرہ ہی نہیں بلکہ جو مخلوق ان میں آباد ہے خواہ انسان ہوں یا کچھ اور، وہ بھی اللہ کی ملکیت ہیں۔

اَلَا اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ط (یونس: ۲۲)

”یاد رکھو! اللہ ہی کی ہیں وہ مخلوقات بھی جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔“

وَلَهُۥ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (الانبیاء: ۱۹)

”اسی کی ہے وہ سب مخلوق جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔“

لَهُ مَقَالِيدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ (اشوری: ۱۲)

”آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اسی کی ہیں، وہ جس کی روزی چاہتا ہے، کشادہ کر دیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے، تنگ کر دیتا ہے۔“

وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (المنافقون: ۷)

”آسمانوں اور زمین کے سارے خزانے اللہ ہی کے لئے ہیں۔“

وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهُۥ وَمَا نُنَزِّلُهُۥ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ (الحجر: ۲۱)

”اور ایسی کوئی چیز نہیں ہے جس کے خزانے صرف ہمارے ہی پاس نہ ہوں اور ہم کوئی چیز نازل نہیں کرتے لیکن صرف مقرر اندازے کے مطابق۔“

قرآن کریم میں یقیناً ان آیات کے علاوہ بھی بہت سی اس مفہوم کی آیات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے، وہ خدا ہی کا ہے اور ہر چیز اسی کی ملکیت ہے۔ میں نے صرف چند آیات نقل کر دی ہیں۔ اس کے علاوہ ایسی آیات بھی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ افراد کی کچھ بھی ملکیت نہیں۔ مثلاً:

لَا يَمْلِكُونَ مِقْدَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ (الب: ۲۲)

”وہ آسمانوں اور زمین میں ذرہ برابر کسی چیز کے بھی تو مالک نہیں ہیں۔“

یہ ان ہستیوں کے لئے ہے جن کو لوگ اپنی حاجت روائی کے لئے پکارتے تھے۔ رہ گئے پکارنے والے تو وہ بدرجہ اولیٰ اس کے مصداق ہیں۔ حتیٰ کہ خود آنحضرت ﷺ سے یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ:

قُلْ لَا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ ۚ (یونس: ۴۹)

”اے پیغمبر اسلام! آپ کہہ دیجئے کہ میں خود اپنے نفس کے لئے کسی فائدہ اور نقصان کا مالک نہیں ہوں بجز اس کے جو خدا ہی چاہے۔“

بعینہ یہی مضمون سورہ اعراف ۱۸۸ آیت میں آیا ہے۔ ان تمام آیات پر غور کرنے کے بعد یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ہر چیز کی ملکیت تو حق تعالیٰ کو حاصل ہے، انسانوں کے لئے ملکیت کا حق ثابت نہیں ہے۔ انسان جو کچھ اپنی محنت و کاوش سے کماتا ہے، وہ اس کی ملکیت نہیں ہوتی کہ وہ اس میں اپنی مرضی سے جو چاہے تصرف کرے، بلکہ وہ قانون الہی کے ماتحت ہی تصرفات کر سکتا ہے۔ جتنا قانون الہی نے اسے اختیار دیا ہے، وہ اسے استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن قانون الہی سے ہٹ کر وہ کوئی تصرف نہیں کر سکتا۔

عوامل پیداوار

موجودہ معاشیات کی رو سے عوامل پیداوار (FACTORS OF PRODUCTION) چار تسلیم کئے گئے ہیں: (۱) زمین (۲) محنت (۳) سرمایہ (۴) اور آجر۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو زمین کے علاوہ جو باقی تین عوامل ہیں وہ زمین ہی سے حاصل شدہ خام اشیاء (RAW MATERIAL) پر کام کر کے کچھ کماتے ہیں۔ مزدور اسی خام مال پر کام کرتا ہے، سرمایہ اسی خام مال سے اشیائے صرف کو تیار کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ آجر یا منتظم اسی خام مال سے اشیاء صرف کو حاصل کرنے کے لئے صنعت و حرفت کے عوامل کو منظم کرتا ہے۔ لہذا بنیادی عامل محض اور محض وہ خام مال ہی ہے جو ہمیں زمین سے حاصل ہوتا ہے۔ لہذا پیداوار کا منبع اور سرچشمہ صرف زمین ہی ہوتی ہے۔ لہذا ایوں کہنا چاہیے کہ مال و دولت خواہ وہ کسی قسم کا بھی ہو، اس کا منبع اور سرچشمہ زمین اور صرف زمین ہی ہے۔ اسی سے انسان اپنی تمام ضروریات حاصل کرتا ہے۔ پھل، غذائی اجناس، لباس، ہر قسم کی دھاتیں، ہر نوع کی معدنیات زمین اور صرف زمین سے حاصل ہوتی ہیں حتیٰ کہ پانی، بجلی اور ہر قسم کی ضروری گیسیں زمین ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ جتنے پیداواری ذرائع ہیں ان سب کا مرجع زمین ہی ہے۔

زمین پر ملکیت

لیکن زمین کس کی ہے؟ کیا وہ انسانوں کی ہے؟ ظاہر ہے کہ زمین نہ تو انسان نے پیدا کی ہے اور نہ وہ اس کا محافظ ہے، اس کی پیدائش اور حفاظت سب کچھ اللہ ہی کی مرہون منت ہے۔ زمین سے جو چیزیں حاصل ہوتی ہیں، وہ سب کچھ حق تعالیٰ ہی کی پیدا کردہ ہیں۔

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَن فِيْهَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (المؤمنون: ۸۴)

”اے پیغمبر اسلام! آپ ان سے کہیے کہ آخر یہ زمین اور تمام زمین والے کس کے ہیں؟ اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ۔“

قَالَ مُّوسٰى لِقَوْمِهٖ اَسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۚ

يُّوْرِ ثَمَّهَا مَنۢ يَّشَاءُ ۚ مِّنۢ عِبَادِهٖ ۚ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۸۵﴾ (الاعراف: ۱۲۸)

”موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ سے مدد طلب کرو اور صبر سے کام لو۔ یقیناً زمین تو اللہ ہی کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ اور (اچھا) انجام تو پرہیز گاروں ہی کے لئے ہے۔“ لہذا اساری زمین حق تعالیٰ کی ملکیت ہے، جسے اس نے کسی خاص فرد، قوم یا جماعت کے لئے پیدا نہیں کیا ہے بلکہ اس پر تمام انسانوں کا حق ہے، وہ پوری بنی نوع انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

وَالْاَرْضُ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۚ فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۚ وَالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ۚ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ

وَالرَّيْحَانُ (الرحمن: ۱۳۱)

”اور اللہ نے پوری زمین کو نوع انسانی کے لئے رکھا ہے۔ اس میں طرح طرح کے پھل ہیں، غلافوں والی کھجوریں ہیں، بھوسے والے اناج ہیں اور طرح طرح کے پھول ہیں۔“

پھل پھول، غلے ساری چیزوں کا تذکرہ کرنے سے غالباً اس طرف اشارہ ہے کہ صرف زمین ہی ساری نوع انسانی کے لئے نہیں ہے بلکہ اس کی تمام پیداوار بھی پوری نوع انسانی کے مفاد کے لئے عطا فرمائی گئی ہے۔

نیز سورہ حم سجدہ میں ہے:

قُلْ اِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْاَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ اَنْدَادًا ۚ
 ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيًّۭا مِنْ فَوْقِهَا وَبَرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ
 فِيْهَا اَقْوَامًا ۚ اِنَّ رَبَّكُمْ لَاسْمٰعِيْلٌ ۝ (نجم سجدہ: ۹ تا ۱۰)

”اے پیغمبر اسلام! آپ کہیے کہ کیا تم اس ذاتِ حق کے ساتھ کفر کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن (ادوار) میں پیدا کیا اور تم اس کے لئے شریک ٹھہراتے ہو، وہی تو تمام جہانوں کا پروردگار ہے اور اسی نے زمین میں اوپر سے مضبوط پہاڑ کھڑے کر دیئے اور زمین میں برکتیں رکھ دیں اور اس میں غذائی اجناس کا مقرر اندازہ چار دن (ادوار) میں مقرر کر دیا جو تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں ہے (یعنی اس پر سب کا حق ہے)۔“

ویسے بھی اگر غور کیا جائے تو زمین پر افراد کی ملکیت کا تصور بہت بعد میں خود پیدا کردہ اور بے بنیاد ہے۔

زید نے عمر سے زمین خریدی اور اس نے اسے معاوضہ دے کر لی۔ لیکن یہ زمین عمر کے پاس کہاں سے آئی تھی؟ ہو سکتا ہے کہ یہ زمین اسے اپنے آباؤ اجداد سے ملی ہو یا اس نے بھی کسی سے خریدی ہو۔ لیکن یہ خرید و فروخت کا سلسلہ کہیں نہ کہیں ضرور ختم ہو گا اور ماننا پڑے گا کہ جس نے اس قطعہ زمین پر سب سے پہلے قبضہ کیا تھا اس نے اسے بلا معاوضہ ہی ہتھ لیا تھا۔ آج کسی ایسے جزیرہ میں جو بالکل غیر آباد ہو، اگر کوئی انسان پہنچ جائے اور وہ زمین پر کھیتی باڑی شروع کر دے تو ظاہر ہے کہ وہ اس زمین کو کسی سے خریدتا تو نہیں بلکہ وہ بلا معاوضہ ہی اس پر قبضہ کرتا ہے اور ایک قطعہ زمین پر یوں مفت سفت قبضہ کر لینے کے بعد جب دوسرے آبادکار وہاں پہنچتے ہیں تو وہ بھی یوں بلا معاوضہ مفت سفت زمینوں پر قبضہ جمالتے ہیں۔ اور اس قبضہ کے بعد اگر کوئی اس قطعہ زمینوں کو جس پر اس نے قبضہ کیا تھا کسی دوسرے کی طرف منتقل کرتا ہے تو اگر تمام مزرعہ زمینوں پر اس طرح لوگ قبضہ کر چکے ہیں تو اب وہ اس انتقال کا معاوضہ لینا شروع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ مفت قبضہ حاصل کرنے کے لئے اب وہاں مزرعہ زمین باقی نہیں رہی۔ یہ حقیقت ہے اس مالکانہ حقوق کی جس پر ہمارا جاگیردارانہ نظام قائم ہے۔ آج بھی غیر آباد اور بنجر زمینیں خود حکومتی لوگوں کو زراعت وغیرہ کے لئے یوں ہی مفت یا معمولی معاوضہ پر دیدیتی جاتی ہیں۔ اسلام نے بھی اپنے قوانین میں یہ گنجائش رکھی ہے کہ جو شخص کسی غیر آباد زمین کو آباد کرے، وہ زمین اسی کی ہو جاتی ہے جس نے اسے آباد کیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ زمینیں ان کو یوں ہی مفت سفت بلا معاوضہ ملتی ہیں۔

بعینہ یہی صورت ان تمام زمینوں کی بھی ہے جن کی آج بڑی بڑی قیمتیں وصول کی جاتی ہیں کہ انہیں بھی جن لوگوں نے پہلے پہل حاصل کیا تھا بلا معاوضہ ہی حاصل کیا تھا، کیونکہ انہوں نے حق تعالیٰ کو جس نے وہ زمین پیدا کی تھی، کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا تھا، لہذا بنیادی طور پر زمین خدا ہی کی ہے۔ لوگوں نے اس پر قبضہ جما کر اپنی ملکیت بنا لیا ہے۔

کیا کسی دوسرے کی چیز پر محض قبضہ کر لینے سے آپ مالک بن سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ آپ ایک مکان بنا کر اسے کرایہ پر چڑھا دیتے ہیں۔ اب اس مکان پر آپ کا قبضہ نہیں رہا بلکہ قبضہ کرایہ دار کا ہے۔ تو کیا اس قبضہ کرنے پر کرایہ دار کو مکان کا مالک سمجھ لیا جائے؟ جاگیردارانہ نظام میں زمینوں پر قبضہ تو کسان اور ہاری کا ہوتا ہے۔ وہی اس میں کھیتی باڑی کرتا ہے اور وہی اس کی دیکھ بھال اور حفاظت کرتا ہے تو کیا اس قبضہ کی بنا پر کسان اور ہاری کو زمین کا مالک سمجھ لیا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں سمجھا جاتا کیونکہ محض قبضہ ہونا ملکیت کی دلیل نہیں ہے۔ تو زمینوں پر جو اسی طرح قبضہ کر لیا گیا تھا، وہ ملکیت کی دلیل کس طرح بن سکتا ہے؟ لہذا اصولی طور پر بھی یہ تصور بالکل بے بنیاد ہے کہ زمین کسی کی ملکیت ہو سکتی ہے۔ زمین کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی اور جب زمین خدا کی ہے، کسی انسان کی نہیں تو اس کی پیداوار (PRODUCTION) بھی اسی کی ہے جس کی وہ زمین ہے۔

اور جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا ہے کہ دولت خواہ وہ کسی قسم کی بھی کیوں نہ ہو، اس کا منبع، ماخذ اور سرچشمہ زمین اور صرف زمین ہے۔ اور زمین صرف خدا کی ملکیت ہے، لہذا زمین سے پیدا شدہ ہر چیز بھی خدا کی ہی ملکیت ہے۔ لہذا دنیا کی کسی چیز پر بھی انسانوں کا حق ملکیت ثابت نہیں ہوتا۔

زمین اور اشیاء کائنات پر تصرف کی نوعیت

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس زمین پر انسان کی کیا حیثیت ہے اور اشیائے کائنات پر اس کے تصرفات کی کیا نوعیت ہے؟ اس سوال کا جواب بھی قرآن کریم نے دیدیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتا ہے کہ:

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعٰيِشَ ۚ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (الاعراف: ۱۰)

”اور ہم نے تمہیں زمین میں اقتدار و اختیار دیدیا ہے اور اس میں تمہارے لئے سامان زیست رکھ دیا ہے۔ (لیکن) تم بہت کم اس کا شکر ادا کرتے ہو۔“

یعنی ہم نے تمہارے لئے زمین میں روزی کے تمام سامان رکھ دیئے ہیں اور تمہیں اتنی قوت اور قدرت عطا کر دی ہے کہ تم اس سے سامان ہائے زیست حاصل کر لو۔ یہ اقتدار و اختیار کس نوعیت کا ہے؟ اسے سمجھنے کے لئے مکتا کے لفظ پر غور کر لینا چاہیے۔ یہی لفظ قرآن کریم میں دوسرے موقعوں پر بھی استعمال ہوا ہے۔ جس سے اس اقتدار و اختیار کی نوعیت متعین ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورہ یوسف میں ہے:

وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ ۖ (يوسف: ۵۶)

”اسی طرح ہم نے یوسف کو سر زمین مصر میں اقتدار اور اختیار عطا فرمایا دیا تھا۔“

ظاہر ہے کہ یوسف علیہ السلام مصر کی زمینوں کے مالک نہیں تھے۔ وہ وہاں وزیر خزانہ مقرر ہو گئے تھے۔ فرعون مصر کو ان کا یہ مشورہ خود قرآن کریم میں مذکور ہے:

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۚ إِنِّي حَفِيظٌ عَلَيْهَا (يوسف: ۵۵)

”یوسف نے (بادشاہ مصر سے) کہا کہ مجھے سر زمین مصر کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے، یقیناً میں ان کا محافظ اور حفاظت کے طریقوں سے واقف ثابت ہوں گا۔“

اس سے پہلے خود فرعون مصر کا یہ اعتراف موجود ہے کہ:

فَلَمَّا كَلَّمَهَا قَالَ إِنَّكَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ (يوسف: ۵۴)

”جب فرعون نے یوسف سے گفتگو کر لی تو اس نے کہا کہ تم آج ہمارے نزدیک واقعی صاحب قدرت اور امانت دار ہو۔“

یہی لفظ سورہ کہف میں ذوالقرنین کے متعلق بھی آیا ہے:

إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا (الکہف: ۸۴)

”یقیناً ہم نے ذوالقرنین کو زمین میں اقتدار بخشا تھا اور اسے ہر چیز کا ساز و سامان عطا فرمایا تھا۔“

اس آیت کریمہ میں بھی ذوالقرنین کو زمین کا مالک نہیں بتایا گیا بلکہ انہیں زمین کا اقتدار و اختیار عطا فرمانے کا ذکر ہے۔ سورہ یوسف کی آیت ۵۴-۵۵ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اس تمکین (اقتدار و اختیار بخشنے) کی علت یہ تھی کہ بقول یوسف علیہ السلام کے ان میں مصری خزانوں کی حفاظت کی اہلیت تھی۔ کیونکہ وہ حفاظت کے طریقوں کو جانتے تھے اور بقول فرعون مصر کے یوسف علیہ السلام میں قوت و قدرت اور دیانت و امانت موجود تھی۔ یہ اوصاف تھے جن کی بناء پر ان کو سر زمین مصر میں اقتدار و اختیار عطا کیا گیا تھا۔ یہی لفظ ملت اسلامیہ کے سلسلہ میں بھی استعمال ہوا ہے، چنانچہ سورہ حج میں ہے:

الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْعُرُوفِ وَهُمْ أَعْيُنُ الْمُنْكَرِ ۖ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (الحج: ۴۱)

”وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں اختیار و اقتدار عطا کر دیا تو یہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور نیک کاموں کا حکم دیں گے اور بُرے کاموں سے روکیں گے اور سب امور کا انجام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔“

یعنی ملت اسلامیہ کو زمین کی تمکین عطا فرمادی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ نیکیوں کو فروغ دیں گے اور

برائیوں کا خاتمہ کریں گے۔ یہ نہیں ہو گا کہ وہ بڑے بڑے جاگیر دار اور زمیندار بن جائیں۔ ان تمام آیات سے واضح ہے کہ تمکین کا مطلب کیا ہے اور اس سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد، محض اقتدار و اختیار ہے۔ زمین اور اشیائے زمین کی ملکیت نہیں ہے۔ اس پوری تفصیل سے سورہ اعراف کی مذکورہ بالا آیت (الاعراف: ۱۰) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے کہ زمین میں انسانوں کو محض یہ قدرت اور قوت بخشی گئی ہے کہ زمین میں جو روزی اور رزق کے سامان قدرت نے ودیعت کر دیئے ہیں، وہ ان کو حاصل کر سکیں اور اوصاف یوسفی کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی حفاظت کریں۔ یہ تمام سامان زیست ان کی تحویل میں ہے، وہ اس کے امین ہیں، مالک نہیں۔ اس مضمون کو سورہ احزاب میں اور واضح کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (الاحزاب: ۷۲)

”بلاشبہ ہم نے فریضہ امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تھا تو انہوں نے اس ذمہ داری کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور وہ اس سے ڈر گئے لیکن انسان نے اس بار امانت کو اٹھالیا، بلاشبہ وہ بڑا ظالم اور نادان تھا۔“

ہم نے آیت کریمہ کا ترجمہ وہی کیا ہے جو عام طور پر مروج ہے۔ اگرچہ بعض حضرات نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ:

”انہوں نے اس امانت میں خیانت کرنے سے انکار کر دیا یعنی خیانت نہیں کی۔ مگر انسان نے اس میں خیانت کا ارتکاب کیا۔“

کیونکہ حمل الامانة کے معنی امانت میں خیانت کرنے کے بھی آتے ہیں۔^۱ لیکن ترجمہ کے اس اختلاف سے نفس مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں نے اٹھایا ہی نہیں یا اس میں خیانت نہیں کی، مال دونوں کا ایک ہی ہے۔ اگر اٹھایا ہی نہیں تب بھی خیانت نہ کرنا ثابت ہے اور انسان نے اس میں خیانت کی یا یوں کہیں کہ اس نے اٹھالیا اور پھر ظلم اور نادانی سے کام لیا یہ بھی خود خیانت کرنے ہی کا ثبوت ہے۔ بھر حال مال دونوں ترجموں کا ایک ہی ہے، کہ چاروں پر فریضہ امانت کو پیش کیا گیا تھا اور انسان نے اس امانت میں خیانت کی اور ظلم و نادانی کا ثبوت دیا۔ اب سوال یہ کہ وہ فریضہ امانت تھا کیا جس میں انسان نے ظلم و نادانی کا ثبوت دیتے ہوئے خیانت کا ارتکاب کیا؟ اس میں کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ کہا اور یوں

شہد پریشان خواب من از کثرت تعبیر ہا

مثلاً بعض حضرات نے فرمایا کہ امانت سے مراد انسان کی عقل اور اس کا شعور و ادراک ہے۔ بعض نے

فرمایا کہ انسان کے اختیار و ارادہ کی آزادی ہے۔ بعض نے فرمایا کہ قوانین فطرت یعنی ہدایات خداوندی کی اطاعت ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک لفظ امانت کا تعلق ہے تو وہ اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی کے بھروسہ پر اسے عاریۃ دیدی جائے۔ (محیط الحیط) صاحب منجد نے امانت کے معنی یہ بھی لکھے ہیں کہ جو کچھ حق تعالیٰ نے بندوں پر فرض قرار دیا ہے، وہ بھی امانت کہلاتا ہے۔ (المنجد) ابن فارس نے لکھا ہے کہ امن مادہ کے بنیادی معنی (۱) خیانت کی ضد (۲) اطمینان قلب اور (۳) تصدیق کرنے کے ہوتے ہیں۔ (اسی امن مادہ سے امانۃ کا لفظ بنا ہے۔)

میں سمجھتا ہوں کہ امانت کی مراد متعین کرنے کے لئے ہمیں دور از کار توجیہات کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لفظ امانت کے جو سامنے کے معنی ہیں اس سے انحراف بلا وجہ ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے آسمانوں و زمین کی تمام چیزوں پر انسان کو اقتدار و اختیار عطا فرما کر سب چیزیں انسان کی تحویل میں بطور امانت دیدیں اور اس سے مطالبہ کیا کہ ان چیزوں کا وہ منشائے الہی کے مطابق استعمال کرے۔ لیکن انسان نے مرضی الہی کو بالائے طاق رکھ دیا اور یہاں اپنی مرضی چلائی شروع کر دی۔ آسمان و زمین کی تمام چیزیں انسان کی تحویل اور امانت میں دی گئی تھیں لیکن وہ ان کا مالک بن بیٹھا۔

ظلم کے معنی وَضْعُ الشَّيْءِ عَنِ غَيْرِ مَحَلِّهِ (چیز کو اپنے محل میں نہ رکھنا اور اس کو غلط طور پر استعمال کرنا) ہوتے ہیں۔ انسان نے کائنات کی چیزوں کو غلط طور پر استعمال کیا اور منشائے الہی کی پیروی نہیں کی، اس لئے وہ ظلوٹ ہے اور اس نے یہ نہیں سمجھا کہ اس غلط استعمال کے نتائج عالم انسانیت کے لئے تباہی اور بربادی کا باعث ہوں گے، اس لئے وہ جہول ہے۔

اشیائے کائنات میں انسان کی حیثیت بعینہ وہی ہوتی ہے جو ایک سرکاری افسر کی اپنے دفتر میں ہوتی ہے۔ اسے ایک آفیس دیا جاتا ہے، قالین، میز، کرسی، اسٹیشنری، چیراسی، ٹیلیفون، ٹائپ رائٹر، اسٹینو، ٹائپسٹ، ماتحت عملہ۔ غرضیکہ ضرورت کی تمام چیزیں مہیا کر دی جاتی ہیں۔ اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کو گورنمنٹ کی ہدایات کے مطابق استعمال کرے۔ انہیں اپنی ذاتی ضرورتوں میں اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق استعمال نہ کرے۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں اس کی تحویل میں ہیں، وہ ان کا مالک نہیں ہے۔ وہ صرف امین ہے۔ اگر وہ ان چیزوں کو غلط طریقہ پر خلاف قانون استعمال کرتا ہے تو وہ ظلوٹ ہے اور چونکہ وہ اس غلط استعمال کے برے نتائج سے اپنی آنکھیں بند کئے ہوئے ہے، اس لئے وہ جہول بھی ہے۔

بعینہ یہی صورت کائنات میں انسان کی بھی ہے کہ ارض و سموات کی تمام چیزیں اس کی تحویل میں بطور امانت کے دے دی گئی ہیں، وہ ان کا مالک نہیں ہے۔ (تفصیل اوپر گزر چکی ہے) اسے ان پر اقتدار و اختیار دیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (لقمان: ۲۰)

”کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے جتنی چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں، سب کو تمہارے لئے

مسخر (تابع فرمان) کر دیا ہے۔“

وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً ط (لقمان: ۲۰)

”اور تم پر ظاہری اور باطنی ہر طرح کی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔“

اس ہمہ قسم نعمتوں کی تکمیل خود حق تعالیٰ نے فرمائی ہے۔ وہی منعم حقیقی ہے اور تم ان نعمتوں کے امین ہو۔ کیونکہ تمہیں ان نعمتوں سے کچھ عرصہ تک منفعت اور فائدہ اٹھانے کا حق دیا گیا ہے، مالک نہیں بنادیا گیا ہے۔ قوانین الہی کے ماتحت ان کو استعمال کر سکتے ہو۔

وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُمْسَقَةٌ وَمَتَاعٌ اِلٰی حَیٰثٍ (البقرہ: ۳۱)

”اور تمہارے لئے زمین رہنے کی جگہ ہے اور اس کی چیزوں سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے (صرف) ایک مدت تک۔“

یہ فائدہ اٹھانے کا حق صرف تمہیں ہی نہیں بلکہ تمہارے چوپایوں اور پالتوں جانوروں کو بھی ہے۔

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلَا تَعْمَلُكُمْ (النزعت: ۳۳)

”(یہ چیزیں) تمہارے لئے اور تمہارے چوپایوں کے لئے فائدہ اٹھانے کیلئے ہیں۔“

متاع کے معنی وہ چیز ہے جس سے تھوڑا فائدہ حاصل کیا جائے لیکن وہ باقی رہنے والی نہ ہو بلکہ جلد ختم ہو جائے۔ (محیط الحیط) ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنی کچھ مدت تک اس سے نفع اٹھانے کے ہیں۔ نیز جس فائدہ میں لذت کا پہلو بھی مضمر ہو یا جس میں ارتقاء اور ترقی ہو۔ بہر حال اس میں فائدہ اٹھانے کا مفہوم قدر مشترک ہے۔ (ابن فارس)

بہر حال دنیوی نعمتوں سے انسان کو متمتع ہونے اور ان سے نفع اٹھانے کا حق دیا گیا ہے۔ اور آخری آیت یعنی (النزعت: ۳۳) سے یہ وضاحت بھی ہو گئی ہے کہ یہ متمتع کا حق ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ تمہارے چوپایوں کو ہوا کرتا ہے کہ وہ محض استفادہ کرتے ہیں مالک نہیں ہوتے۔ نیز ان آیات سے اس حقیقت کی بھی تائید ہو جاتی ہے کہ انسان کو کائنات میں امین بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اسے کائنات کی چیزوں پر اختیار و اقتدار محض بطور امانت کے سونپا گیا ہے، وہ ان کا مالک نہیں ہے۔

شبہات کی وضاحت

پہلا شبہ

اس کے بعد ان بعض شبہات کی وضاحت بھی ضروری ہے جو اس ضمن میں پیدا ہوتے ہیں۔

سب سے پہلا شبہ تو یہ ہے کہ قرآن کریم میں جگہ جگہ مال کو ان ضماز کی طرف مضاف کر کے لایا گیا ہے جو انسانوں ہی کی طرف راجع ہیں، مثلاً

الَّذِي يَجْعَلُ مَالًا وَعَدَدَةً (صمرہ: ۲)

وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ (ایل: ۱۱)

فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ (البقرہ: ۲۷۹)

أَمْمَّا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (الانفال: ۲۸)

شَغَلَتْكُمْ أَمْوَالُهُمْ وَالْأَهْلُوتَا (التح: ۱۱)

فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ (التوبہ: ۵۵)

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (الذريت: ۱۹)

فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ (المعارج: ۲۴)

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (التوبہ: ۱۰۳) وغیر ذلک

ان تمام آیات میں یہی فرمایا ہے کہ اس کا مال، تمہارا مال، ان کا مال۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مال انسانوں کی ملکیت ہوتا ہے، اگر مال و دولت انسانوں کی ملکیت نہ ہوتا بلکہ اللہ کی ملکیت ہو کر تا تو اسے یوں ہر جگہ ”انسانوں کا مال“ نہ کہا جاتا بلکہ اسے حق تعالیٰ کا مال بتایا جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مال و دولت در حقیقت انسانوں ہی کی ملکیت ہوتا ہے۔ دراصل یہ شبہ اس لئے ہوتا ہے کہ ہم نے اوپر ایک مثال دی تھی کہ حکومت کے ملازمین کو اپنے دفتروں میں حکومت کی طرف سے بے شمار چیزیں استعمال کے لئے دی جاتی ہیں، تاکہ دفتری ضروریات ان سے پوری کریں۔ وہ تمام چیزیں ان کی تحویل اور امانت میں ہوتی ہیں، ان کی ملکیت میں قطعاً نہیں ہوتیں۔ لیکن ان سب چیزوں کی نسبت انہی کی طرف کی جاتی ہے۔ اور یہی کہا جاتا ہے کہ: ”یہ فلاں صاحب کا دفتر ہے۔“ ”صاحب کی میز پر میرا فائل رکھا ہوا ہے۔“ ”میری میز پر ایک قلم رکھا ہوا ہے، وہ لے آؤ۔“ ”صاحب نے اپنے اسٹینو کو بلایا۔“ ”میرا ٹائپ رائٹر کہاں گیا؟“ وغیر ذلک۔

حالانکہ ان میں سے کوئی سی چیز بھی ان کی ملکیت نہیں ہوتی۔ لہذا اس سے یہ مفہوم اخذ کرنا کہ یہ چیزیں ان کی ملکیت ہوتی ہیں، صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اضافت ملکیت کی دلیل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے ادنیٰ ملاہست اور ادنیٰ تعلق کافی ہوتا ہے، چنانچہ خود ان آیات ہی میں:

فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ (التوبہ: ۵۵)

شَغَلَتْكُمْ أَمْوَالُهُمْ وَالْأَهْلُوتَا (التح: ۱۱)

أَمْمَّا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (الانفال: ۲۸)

اموال کے ساتھ اولاد اور اہل کو بھی انہی ضمیروں کی طرف مضاف کیا گیا ہے جن کی طرف اموال کو مضاف کیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اولاد اور اہل و عیال انسانوں کی ملکیت نہیں ہوتے۔

دوسرا شبہ

سورہ یس کی ان آیات کریمہ سے کیا جاتا ہے جن میں فرمایا گیا ہے کہ:

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ آيَاتُنَا أَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مِلْكُونَ (۵) وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ

فِي مَنَازِلٍ مُّكُونٍ (۶) وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبٌ (۷) أَفَلَا يَشْكُرُونَ (یس: ۷۳)

”اور کیا انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لئے ان چیزوں میں سے جنہیں ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے، چوپائے پیدا کئے تو وہ ان کے مالک بن بیٹھے اور ہم نے ہی انہیں ان کا مطیع بنایا تھا تو ان پر سواری بھی کرتے ہیں اور ان ہی سے کھاتے بھی ہیں۔ اور ان کے لئے ان میں دوسری منفعتیں بھی ہیں اور پینے کی چیزیں بھی ہیں۔ (مثلاً دودھ وغیرہ) تو کیا وہ اس پر شکر نہیں کرتے؟“

اس آیت میں حق تعالیٰ نے انسانوں کو چوپایوں کا مالک قرار دیا ہے۔ چوپائے بھی خدا کی مخلوق ہیں جیسا کہ باقی مال و دولت کی چیزیں خدا کی مخلوق ہیں۔ اگر چوپایوں کے انسان مالک ہیں تو اور چیزوں کے بھی مالک ہو سکتے ہیں۔

اس آیت کریمہ سے یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے جیسا کہ ہم نے خود ترجمہ میں واضح کر دیا ہے۔ یہاں انسانوں کو چوپایوں کا مالک نہیں بتایا گیا ہے بلکہ اس تصور کی تردید کی گئی ہے اور طنزیہ انداز بیان اختیار فرما کر اس کی غلطی واضح کی گئی ہے۔ آیت میں بتایا گیا ہے کہ دنیا کی ہر چیز ہم نے بنائی ہے اور ”اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے“ فرما کر اس کی مزید تاکید فرمائی گئی ہے۔ ان ہی مخلوقات میں سے چوپائے بھی ہیں۔ انہیں بھی ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ انسان کی مجال نہیں تھی کہ وہ ان چوپایوں سے کچھ کام لے سکتا لیکن ہم نے ہی ان کو اس کا مطیع و منقاد بنا دیا کہ وہ ان پر سواری کر سکتا ہے، ان کا گوشت کھا سکتا ہے اور طرح طرح کی منفعتیں ان سے حاصل کر سکتا ہے۔ ان کا دودھ پی سکتا ہے وغیر ذلک۔ تو کیا ان انعامات و احسانات کا وہ شکر نہیں کرنا چاہتا؟ کہ سب کچھ تو ہم نے کیا اور وہ خود ان کا مالک بن بیٹھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ آیت مذکورہ میں ملکیت کی تصدیق نہیں فرمائی گئی ہے۔ جیسا کہ سمجھا گیا ہے بلکہ ملکیت کے تصور کی تردید فرمائی گئی ہے، لہذا یہ آیت خود ہماری تائید میں ہے۔

تیسرا شبہ

یہ کیا جاسکتا ہے کہ معاشیات کے اصول کے مطابق عوامل پیداوار (FACTORS OF PRODUCTION)

چار ہیں: (۱) زمین (۲) محنت (۳) سرمایہ (۴) اور آجر۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ زمین خدا کی ملکیت ہے اور زمین کی پیداوار یعنی خام مال وہ بھی خدا کی ملکیت ہے لیکن مزدور کی محنت اور آجر کی صلاحیت تنظیم تو انسان کی اپنی ہوتی ہے۔ کیا یہ دونوں عامل انسان کو پیداوار کا مالک نہیں بنادیتیں؟ چونکہ انسان اپنی محنت اور صلاحیت و قابلیت کے بل بوتے پر ہر قسم کی پیداوار

شبہات کا قرآنی جواب

اس نوع کے شکوک و شبہات کا جواب خود قرآن کریم نے سورہ واقعہ میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ نہایت ہی بلیغ انداز میں دے دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

نَحْنُ خَلَقْنَكُمْ فَلَوْلَا تَصَدَّقُونَ ﴿٥٠﴾ أَفَرَأَيْتُمْ مَا تُمْنُونَ ﴿٥١﴾ أَأَنْتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ ﴿٥٢﴾ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ﴿٥٣﴾ عَلَى أَنْ تَبَدَّلَ امْأَلَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٥٤﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٥٥﴾ أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ ﴿٥٦﴾ أَأَنْتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ﴿٥٧﴾ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطًا مَّا فَظَلُمْتُمْ تَفَكَّهُونَ ﴿٥٨﴾ إِنَّا لَبَغْرُمُونَ ﴿٥٩﴾ بَلْ نَحْنُ حَزَّوْمُونَ ﴿٦٠﴾ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ﴿٦١﴾ أَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ ﴿٦٢﴾ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ جَارًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ﴿٦٣﴾ أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ﴿٦٤﴾ أَأَنْتُمْ أَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُونَ ﴿٦٥﴾ نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذَكُّرًا وَمَتَاعًا لِلْبَغْوِينَ (الواقعه: ٥٤-٦٥)

”ہم نے ہی تو تمہیں پیدا کیا ہے۔ تو تم اس بات کی تصدیق کیوں نہیں کرتے؟ تو کیا تم نے دیکھا ہے کہ جو کچھ تم منی (کانطفہ) ٹپکاتے ہو، کیا تم اسے پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ موت کو کبھی تو ہم نے ہی تمہارے درمیان مقدر کر رکھا ہے اور ہم عاجز و درماندہ نہیں ہیں کہ ہم تمہارے بدلہ میں تمہارے ہی جیسے دوسرے آدمی لے آئیں اور تمہیں کسی ایسی دنیا میں اٹھا کھڑا کریں جو تم نہیں جانتے اور تم (اپنی) پہلی پیدائش کو تو خوب جان چکے ہو۔ تو تم غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟ تو کیا تم نے دیکھا ہے کہ جو کچھ تم کاشت کرتے ہو، کیا تم اسے اگاتے ہو یا لگانے والے ہم ہی ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے ہم روندی ہوئی خشک گھانٹس پھونس بنادیں اور تم باتیں بناتے رہ جاؤ۔ ہائے ہائے ہم پر تو بڑا اتاوان پڑ گیا بلکہ ہمارے تو نصیب ہی پھوٹ گئے۔ تو کیا تم نے اس پانی کو دیکھا ہے جو تم (روز) پیتے ہو، کیا اس پانی کو بادل سے تم نے اتارا ہے یا اسے اتارنے والے صرف ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس پانی کو کھاری اور شور بنادیں۔ تو آخر تم شکر کیوں نہیں کرتے؟ تو کیا تم نے اس آگ کو دیکھا ہے جسے تم (صبح و شام گھروں میں) سلگاتے ہو، کیا ان (لکڑیوں) کے درخت تم نے پیدا کئے تھے یا ان کو پیدا کرنے والے ہم ہی ہیں؟ اس آگ کو ہم نے ہی تو یاد دہانی کا ذریعہ اور جنگلوں میں رہنے والوں کے لئے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بنادیا ہے۔“

نزول قرآن کا عہد نہ صنعتی تھا اور نہ اس عہد میں بھاپ، بجلی اور ایٹم اور شمسی توانائی کی دریافتیں سامنے آئی تھیں۔ اس عہد میں اگر ان قوائے فطرت (ENERGIES) کی بات کی جاتی تو کوئی بھی کچھ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس زمانہ میں زمین، مٹی، پانی اور آگ یہی طاقتیں دریافت ہوئی تھیں۔ لہذا قرآن کریم نے انہی کا تذکرہ فرمایا ہے۔ بہر حال یہ ایک مثال ہے۔ اسی پر ہم اپنے زمانہ کی نو دریافت شدہ قوتوں کو بھی قیاس کر سکتے ہیں۔

حاصل کرتا ہے تو وہ اس کی ملکیت ہونی چاہیے۔ اس شبہ کا جواب بھی واضح ہے۔ آدمی میں محنت و مشقت کی صلاحیت بھی حق تعالیٰ کی پیدا کردہ اور عطا کردہ ہے۔ یہی دعویٰ قارون نے بھی کیا تھا کہ میں نے جومال و دولت پیدا کی ہے، وہ اپنی محنت اور صلاحیت و قابلیت سے پیدا کی ہے۔ لیکن قرآن کریم نے اس دلیل کو تسلیم نہیں کیا۔ کیونکہ یہ صلاحیت و قابلیت بھی تو انسان کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہے۔ وہ بھی تو حق تعالیٰ ہی کا عطیہ ہے۔ مزدور محنت کرتا ہے، اس لئے کہ اس کے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں اور کام کرتے ہیں، لیکن دنیا میں ایسے لوگوں کی بھی تو کمی نہیں ہے کہ جن کے ہاتھ پاؤں نہیں چلتے اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ آج ایک پہلوان سے پہلوان پر فالج کا حملہ ہو جائے تو اس کے ہاتھ پاؤں جواب دے جائیں۔ وہ کون سی ہستی ہے جو اسے اپنا ج ہونے سے بچا رہی ہے۔ یہ تو جسمانی صلاحیت کا رکھنا حال ہے، ذہنی اور دماغی صلاحیت و قابلیت کا جہاں تک تعلق ہے، وہ بھی حق تعالیٰ ہی کا عطیہ ہے۔ جہاں تک جسمانی قوت و صلاحیت کا تعلق ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ ضَعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ ضَعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ ضَعْفًا وَشَيْبَةً ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ (الروم: ٥٢)

”اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں کمزوری و ناتوانی سے پیدا کیا پھر کمزوری و ناتوانی کے بعد تمہارے لئے قوت پیدا کر دی پھر اس قوت و طاقت کے بعد (دوبارہ) ناتوانی و کمزوری اور بڑھاپا دیا۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کر تا رہتا ہے۔“

لہذا آدمی کی اپنی جسمانی قوت و صلاحیت یہ خود عطیہ الہی ہے، انسان کی پیدا کردہ یا حاصل کردہ نہیں ہے۔ رہ گئی ذہنی و دماغی صلاحیت سودہ بھی حق تعالیٰ ہی کی پیدا کردہ اور عطا فرمودہ ہے، اس پر بھی انسان کو غرور کرنے کا حق نہیں ہے۔ سورہ نحل میں ہے:

وَاللَّهُ آخِرَ جُزْأَيْنِ مِنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا ۖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ
وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (النحل: ٨)

”اور اللہ ہی نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا تھا کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے او (اس کے بعد) اس نے تمہارے لئے کان، آنکھیں اور دل (کیونے اور سننے و سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں) بنا دیئے کہ شاید تم اس کا شکر ادا کرو۔“

یہی مضمون سورہ سجدہ (السجدہ: ۹) اور احقاف (الاحقاف: ۲۶) میں وارد ہوا ہے، لہذا یہ کہنا کہ محنت اور صلاحیت و قابلیت تو ہماری ہی تھی، اس لئے ان کے ذریعے سے جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے، وہ ہمارا ہے اور ہم اس کے مالک ہیں، قرآنی نقطہ نظر سے صحیح نہیں ہے۔

ان آیات میں بات یہاں سے شروع کی گئی ہے کہ ہم نے ہی تمہیں پیدا کیا ہے، تم خود پیدا نہیں ہو گئے۔ تم اس حقیقت کو مانتے ہو یا نہیں؟ تم اس کی تصدیق کیوں نہیں کرتے؟ یہ واقعہ ہے کہ انسان کی پیدائش قطرہ مٹی سے عمل میں آئی ہے۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ اس قطرہ مٹی کو جو تم مادر میں ٹپکاتے ہو، اسے تم پیدا کرتے ہو یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ قطرہ مٹی کے اندر بار آوری کی صلاحیت کون پیدا کرتا ہے؟ ہزار ہا مثالیں ایسی ہیں کہ لوگوں کے قطرات مٹی میں بار آوری کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی، ہزار کوششوں کے باوجود وہ اس میں بار آوری کی صلاحیت پیدا نہیں کر پاتے۔ تو خالق کون ہوا؟ تم ہوئے یا ہم ہیں؟ پھر پیدا ہو جانے کے بعد بھی تمہیں کون زندہ رکھتا ہے؟

انسانوں کو لئے موت ایک مقدر کردہ یقینی چیز ہے۔ خود انسان کی زندگی اتنی یقینی نہیں ہے جتنی اس کی موت یقینی ہے۔ حق تعالیٰ کو اس سے کون روک سکتا ہے کہ وہ یہاں سے اٹھا کر کسی اور دنیا میں پہنچا دے اور تمہاری جگہ دوسرے تم جیسے ہی آدمی تمہاری جگہ لے لیں۔ ایسے واقعات دنیا میں روز ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی اچھبے کی بات نہیں ہے۔ بہر حال اس دنیا میں تمہیں زندہ رکھنا بھی ہمارا ہی کام ہے۔ کوئی آدمی اپنی سعی و کوشش سے نہ آج تک زندہ رہا ہے نہ رہ سکتا ہے۔ تمہاری اولین پیدائش تمہارے سامنے ہے۔ تو اس پر تمہیں تعجب تو نہیں ہو سکتا کہ ہم تمہاری جگہ تم جیسی ہی دوسری مخلوق لے آئیں اور تمہیں کسی دوسرے عالم میں پہنچا دیں۔ یہ تو خود تمہاری اپنی زندگی کی بات ہوئی جو بالکل ہی بنیادی بات ہے۔ اب ذرا اپنی معاشی زندگی کی طرف آ جاؤ۔ زمین سے تم اپنی معاش حاصل کرتے ہو اور اسی کے بل بوتے پر تم زندہ ہو۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ جس زمین میں تم کھیتی باڑی کرتے اور اس سے غذائی سامان حاصل کرتے ہو، کیا یہ زمین تمہاری پیدا کی ہوئی ہے؟ زمین ہماری ہے، پانی ہم برساتے ہیں، کھیتوں کو روشنی اور حرارت ہم بہم پہنچاتے ہیں۔ نہ پانی تمہارا پیدا کردہ ہے۔ نہ سورج اور چاند تمہارے پیدا کردہ ہیں جن سے کھیتوں کو روشنی اور حرارت حاصل ہوتی ہے۔ تم نے تو صرف اتنا کام کیا ہے کہ زمین میں بل چلا کر بیج بکھیر دیا تھا، وہ بیج بھی تم نے پیدا نہیں کیا تھا، وہ بھی ہمارا ہی پیدا کردہ تھا اور جو بل تم نے چلایا ہے، وہ جس لکڑی اور لوہے سے بنا ہے، وہ بھی ہمارے ہی پیدا کردہ ہیں، جس جانور کے کندھے پر تم نے بل چلایا ہے، وہ بھی تم نے پیدا نہیں کیا تھا۔ اب بتاؤ تو سہی کہ یہ کھیتی باڑی تم کمر رہے ہو یا ہم کمر رہے ہیں؟

آگے چلو! کھیتی پروان چڑھ رہی ہے تم پھولے نہیں سمارہے ہو، لیکن ذرا غور کرو کہ اس کھیتی کو اپنے آخری مرحلہ تک کون پہنچا رہا ہے۔ تم پہنچا رہے ہو یا ہم پہنچا رہے ہیں؟ روزانہ اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ اولے پڑ گئے، پالا پڑ گیا، طوفان باد و باران آ گیا اور لہلہاتی کھیتیاں سوکھا گھانس پھونس بن کر رہ گئیں۔ اس کے بعد واویلا کرتے اور آہیں بھرتے رہ جاتے ہو کہ ہائے ہم تباہ ہو گئے، برباد ہو گئے، ہماری ساری پونجی ضائع ہو گئی، ہمارے نصیب پھوٹ گئے۔ یہاں تم بالکل بے بس ہو جاتے ہو۔ تو بتاؤ ان کھیتوں کو کون پروان

چڑھاتا ہے؟ تم پروان چڑھاتے ہو یا ہم پروان چڑھا رہے ہیں؟
اس کے بعد پانی پر آ جاؤ! پانی بادلوں سے برساتا ہے۔ ان بادلوں سے پانی کون برساتا ہے؟ تم برساتے ہو یا ہم برساتے ہیں؟
پانی حیات ارضی میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط (الانبیاء: ۳۰)

”اور ہم نے پانی ہی سے ہر چیز کو زندگی عطا کی ہے۔“

اور یہ زندگی بخش چیز بھی ہم ہی بادلوں سے برسا کر تمہیں، تمہارے چوپایوں اور تمہارے کھیتوں کو سیراب کرتے ہیں۔ پھر غور کرو کہ اگر ہم اس پانی کو نمکین اور شور بنادیں، تو ہمارے لیے کیا مشکل ہے؟ سمندر کا پانی جس کے بخارات بن کر اڑنے سے بادل بنتے ہیں اور پانی برساتا ہے۔ نمکین اور شور ہی ہوتا ہے، جسے نہ تم پی سکتے ہو، نہ اپنے جانوروں کو پلا سکتے ہو، نہ اس سے کھیتوں کو سیراب کر سکتے ہو۔ اس پانی کو فلٹر کر کے شیریں کون بنا دیتا ہے؟ تم بنا دیتے ہو یا ہم بناتے ہیں؟ تو آخر تم خدا کا شکر کیوں نہیں کرتے؟
اس کے بعد جو تھی اہمیت کی چیز آگ ہے جس سے تم ہزار کام لیتے ہو۔ یہ آگ جو تم جلاتے ہو، اس کا بندھن یعنی لکڑیاں، جن درختوں سے تم کاٹتے ہو، وہ تمہارے پیدا کردہ ہیں یا ہم نے انہیں پیدا کیا ہے؟
ہم نے ان چیزوں کو تمہارے لئے خدا کی طرف متوجہ ہونے کا ذریعہ بنایا ہے، حتیٰ کہ شہری تو شہری جنگلوں میں رہنے والے بھی ان کے فوائد و منافع سے بے نیاز نہیں ہیں۔

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا تھا کہ یہ محض ایک مثال ہے۔ اسی پر قیاس کر کے ہم اپنے زمانہ کی تمام ایجادات و اختراعات اور تمام قوائے فطرت کی حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں۔ بجلی، قسمی توانائی، ایٹمی توانائی، ہر قسم کا خام مال جن سے ہم قسم قسم کی صنعتیں قائم کرتے ہیں، یہ آخر کس نے پیدا کئے ہیں؟ کوئلہ، پیٹرول، پانی جن سے ہم بجلی حاصل کرتے ہیں، وہ کس نے پیدا کئے ہیں، یہ سب چیزیں خدا کی پیدا کردہ ہیں یا انسانوں کی؟ انسان کا کام تو صرف اتنا ہے کہ قوانین قدرت کو معلوم کر کے جو خود خدا کے پیدا کردہ ہیں، اسی کی پیدا کردہ چیزوں سے قوانین قدرت کے مطابق ان سے کام لیتا ہے اور طرح طرح کی منفعتیں اور فوائد حاصل کرتا ہے۔

بلاشبہ قوانین قدرت کا علم حاصل کرنا اور خدا کی پیدا کردہ چیزوں کو قوانین قدرت کے مطابق استعمال کر کے وہ منافع و مفادات حاصل کرنا جو نوع انسانی کی لئے ارتقاء کا باعث بن سکیں، یہ بھی ایک کام ہے، اس کے لئے بڑی جستجو، محنت اور کوشش درکار ہے اور حق تعالیٰ تمہارے عمل، محنت و کوشش کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔
إِنِّي لَأَظُنُّكَ عَمَلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ (آل عمران: ۱۹۵)

”یقیناً ہم کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع اور بے نتیجہ نہیں کرتے، خواہ کوئی مرد کرے یا کوئی عورت کرے۔“

لیکن اس دنیا کا یہ عظیم الشان کارخانہ ہم نے بنایا ہے اور اس میں تمام وہی چیزیں استعمال ہو رہی ہیں جو خود ہماری ہی پیدا کردہ ہیں۔ تم اس کارخانہ میں کام کر رہے ہو۔ تم عامل ہو (محنت کش اور کاریگر) مگر اس کے مالک نہیں ہو۔ سرمایہ ہمارا ہے، تم کام کرتے ہو، لہذا ہمارا حصہ ہمیں دید و اور اپنا حصہ لے لو۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (التوبہ: ۱۲۰)

”یقیناً اللہ تعالیٰ اچھے کام کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔“

اشتراکی اور اسلامی معاشی نظام میں فرق

خود نوع انسانی ہی میں تمہارے بے شمار بھائی ایسے بھی ہیں جو جسمانی طور پر یا ذہنی طور پر نیز معاشی طور پر کمزور، در ماندہ اور پس ماندہ بھی ہیں، وہ بھی ہماری ہی مخلوق ہیں اور تمہارے ہی بھائی ہیں۔ جتنا حصہ ہمارا بنتا ہے وہ تم اپنے ان بھائیوں کو دیدو۔ ہمیں تمہارے مال و دولت کی ضرورت نہیں ہے لیکن تمہارے ان بھائیوں کو ضرورت ہے۔ اس سے معاشرہ کی نشوونما اور بالیدگی ہو سکے گی، تم اسی معاشرہ کا جزو ہو اور کل کی نشوونما اور بالیدگی سے ہی اسی کے اجزاء کی نشوونما اور بالیدگی ہوتی ہے۔ معاشرہ کی نشوونما اور بالیدگی میں خود تمہاری نشوونما اور بالیدگی بھی مضمر ہے۔ یہ ہے مختصر الفاظ میں اسلام کا معاشی فلسفہ اور زکوٰۃ کا مفہوم۔ اسلام کے معاشی فلسفہ اور اشتراکیت کے معاشی فلسفہ میں ایک فرق تو یہ ہے کہ اشتراکیت بقدر ضرورت افراد کو لینے کا حق دیتی ہے اور اسلام بقدر محنت اپنا حصہ لینے کا حق دیتا ہے۔ اور بقدر محنت اپنا حصہ لینے کے بعد اپنی مرضی اور خوشی سے زائدہ از ضرورت دولت کو افراد سے دلو انا چاہتا ہے جبکہ اشتراکیت میں مرضی اور خوشی کا سوال ہی نہیں ہوتا وہاں ہر چیز جبراً منوائی جاتی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ اشتراکیت میں جو کچھ افراد سے لیا جاتا ہے، چونکہ وہ ان کی مرضی سے نہیں لیا جاتا، اس لئے ایسا کرنے لئے ان میں کوئی جذبہ محرکہ بھی نہیں ہوتا۔ اسلام کے اس فلسفہ میں ایک جذبہ محرکہ (INCENTIVE) اپنی ذات کی نشوونما اور بالیدگی کی خواہش بھی ہوتی ہے۔ ایک شتر کی ذہن میں بار بار یہ جذبہ انگڑائیاں لیتا ہے جس کا ذکر قرآن کریم نے ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ انْفِقُوا حَتَّىٰ رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالُوا الَّذِينَ كَفَرُوا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْطَعِمُ مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَنْطَعِمَهُ أَلا تَعْلَمُونَ (النحل: ۱۰۷)

”اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے تمہیں رزق دیا ہے، اس میں سے کچھ (اپنی بنی نوع کے

لئے) خرچ کرو تو جن لوگوں نے (الہی ہدایات کا) انکار کیا ہے وہ ان لوگوں سے جو (اللہ پر) ایمان لے آئے ہیں، (جو اب) کہتے ہیں: کیا ہم ان لوگوں کو کھلائیں جنہیں اگر اللہ چاہتا تو خود ہی کھلا دیتا۔ (جنہیں خدا نے محروم رکھا ہے انہیں دینے والے ہم کون ہوتے ہیں؟) تم لوگ تو کھلی ہوئی گمراہی میں ہی پڑے ہوئے ہو۔“

کہ ایسی بے تکلی باتیں کرتے ہو۔ مال ہم نے کمایا ہے، ہم دوسرے لوگوں کو کیوں دیں؟ ہم نے انہیں منع تو نہیں کیا کہ وہ محنت و مشقت نہ کریں اور کچھ نہ کمایا کریں۔ وہ خود کیوں نہیں کماتے، وہ خود کیوں کوشش نہیں کرتے؟ وہ مفت کے ٹکڑوں پر کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟ جس طرح ہم کماتے ہیں انہیں بھی کمانا چاہیے۔

وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ معاشرہ میں تمام لوگ اکتساب رزق کی صلاحیتوں میں مساوی درجہ کے نہیں ہوتے۔ کچھ میں اس مقصد کے لئے جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں زیادہ ہوتی ہیں کچھ میں کم ہوتی ہیں۔ کچھ معذور اور اپانچ بھی ہوتے ہیں جو اکتساب رزق کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ اسلام پیشہ ور بھکاریوں اور موٹے مسٹروں کو کھلانے کو نہیں کہتا۔ وہ تو ضرورت اور در ماندہ لوگوں کی مدد کرنے کو کہتا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۖ فَمِمَّا الَّذِيْنَ فَضَّلُوا بِرِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَمْلَكَةٍ آتَمَّائِهِمْ فَبِهِمْ سَوَاءٌ ۖ أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ (النحل: ۱۷)

”اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق کے معاملہ میں برتری بخشی ہے۔ لیکن جن لوگوں کو برتری دی گئی ہے وہ اپنا رزق ان لوگوں پر نہیں لوٹاتے جو ان کے ہاتھ کے نیچے (زیر دست) ہیں کہ وہ بھی رزق میں ان کے برابر آجائیں۔ تو کیا یہ لوگ اللہ کے احسان و انعام کا انکار کرنا چاہتے ہیں؟“

بہر حال ایک اشتراکی ذہن جو آسمانی ہدایات پر اصلاً یقین نہیں رکھتا وہ اس قسم کے شکوک و شبہات میں ہمیشہ گرفتار رہتا ہے اور ایک اسلامی ذہن اس قربانی کے لئے ہمہ وقت آمادہ رہتا ہے، کیونکہ وہ اسی میں اپنا فائدہ اور دیر پا نفع دیکھتا ہے۔ یہ ہے دونوں نظام ہائے زندگی میں فرق۔

بہر حال اسلام کا معاشی فلسفہ یہ ہے۔ اسی پر اس کے صدقات و زکوٰۃ کے نظام مبنی ہیں۔

مورخ اسلام شیخ الحدیث مولانا محمد میاںؒ

ملکیت کی حقیقت اور حقیقی مالک

ملکیت

مسئلہ ملکیت ان ذہنوں میں الجھا ہوا ہے جو خدا شناسی کی روشنی سے محروم ہیں۔ جو صاحب عقل و بصیرت خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں، جن کو یقین ہے کہ پوری کائنات اور کائنات کی ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، وہ یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ مالک وہی ہے جو خالق ہے، جو رب ہے، جو پروردگار ہے۔

اگر شیئر ہولڈروں اور کمپنی کے حصہ داروں کو اس لیے مالک مانا جاتا ہے کہ انہوں نے رقم لگائی، میٹیریل فراہم کیا، مزدوری کی ادائیگی یا مزدوروں کی ملکیت کا دعویٰ اس لیے کیا جاتا ہے کہ محنت، پیداوار کی اصل ہے، انہوں نے محنت کر کے مال تیار کیا۔ جو مال تیار کرنے والا ہے، وہی مالک ہونا چاہیے۔ تو ان دلائل کی بنیاد پر حقیقی مالک اس کو کیوں نہیں مانا جائے جس نے مال تیار کرنے والے کو تیار کیا، جس نے میٹیریل پیدا کیا، جو سرمایہ دار اور مزدور دونوں کا خالق ہے۔ جس نے سرمایہ دار کو سرمایہ بخشا تو مزدور کو وہ قوت عطا فرمائی جس سے وہ مزدوری کرتا ہے، اس کے ہاتھ پیر اور وہ تمام اعضاء بنائے جن سے وہ کام لیتا ہے۔

توحید

توحید یہ ہے کہ جس طرح پوری کائنات کی ہر شے کا خالق خدا کو مانا جائے ایسے ہی ہر شے کا مالک بھی اسی کو مانا جائے۔ یہ صرف اسی کی عطا ہے کہ اس نے ہمیں نیست سے ہست کیا یعنی نیست کو جامہ وجود پہنایا۔ یہ صرف اسی کا کرم ہے کہ کائنات ہستیاں ہمارے لیے مخصوص کر دیں۔ ہمیں ان پر اقتدار بخشا اور ان کے استعمال کا حق عطا فرمایا۔ قرآن پاک اسی فلسفہ کو ذہنوں میں پیوست کرتا ہے اور صاحب ایمان کا ذہن اسی فلسفہ کو حق سمجھتا ہے۔ ان حقائق کا کون انکار کر سکتا ہے جن کی طرف قرآن پاک نے تقریباً ڈیڑھ سو آیتوں میں اشارہ فرمایا ہے، جن میں سے چند یہ ہیں:

اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (الزمر: ۶۲)

”اللہ پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کا۔“

خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ (الانعام: ۱۰۱)

”ہر چیز کو پیدا کیا۔“

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ (فاطر: ۳)

”کیا کوئی پیدا کرنے والا ہے اللہ کے سوا؟“

فَأَرُونِي مَاذَا خَلَقَ النَّبِيُّ مِنْ دُونِهِ (لقمان: ۱۱)

”پس مجھے دکھاؤ وہ کیا ہے جس کو اللہ کے علاوہ دوسروں نے پیدا کیا؟“

وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ (الصافات: ۹۶)

”اللہ نے بنایا تم کو اور ان چیزوں کو جن کو تم بناتے ہو۔“

جب وہ انسان کا خالق، اس کی معمولات و مصنوعات کا خالق، انسان کے علاوہ کائنات کی ہر چیز کا خالق ہے تو لا محالہ ہر چیز کا مالک بھی وہی ہے، جو چیز بھی ہے وہ اسی کی ہے اور صرف اسی کی ہے۔

لِلَّهِ مَنَافِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنَافِي الْاَرْضِ (البقرہ: ۲۸۴)

”اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔“

لِلَّهِ خَزَاٰئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (النافقون: ۷)

”اللہ ہی کے ہیں آسمانوں اور زمین کے تمام خزانے۔“

یہ اس کا احسان و کرم ہے کہ اس نے حضرت انسان کو اپنا خلیفہ بنایا اور عالم مشاہدہ کی ہر چیز اس کے کام میں لگادی۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَنَافِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنَافِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (الحاشیہ: ۱۳)

”جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں، ان سب کو اپنی طرف سے تمہارے کام میں لگادیا۔“

جب زمین و آسمان کی ہر چیز اس لاڈلے خلیفہ (انسان) کے کام میں لگادی گئی تو اس خلیفہ کو حق ہو گیا کہ وہ اپنے طور پر بھی اگر کسی چیز کو کام میں لاسکتا ہے تو کام میں لے آئے۔ یعنی زمین و آسمان کی جس چیز کو مسخر کر سکتا ہے، جس چیز پر وہ قابو پا سکتا ہے، اس کو اپنے قابو میں کر لے، یہ چیز اس کی ہو جائے گی۔ مالک حقیقی نے عام اجازت دے رکھی ہے۔

”جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں، مینا اسی کا ہے۔“

یہ ہے انسانی ملکیت کی بنیادی حقیقت۔ چنانچہ بنی نوع انسان، یعنی اقوام عالم کا مسلمہ دستور بھی یہی ہے کہ مالک وہ ہے جو سب سے پہلے پہنچے اور اپنے قابو میں لے آئے۔ سب سے پہلا قبضہ، ملکیت مانا جاتا ہے۔

زمین کے کسی خطہ کی مالک وہ قوم ہے جس نے سب سے پہلے اس پر قبضہ کیا۔ پہاڑ کی کسی چوٹی پر جس نے پہلے قابو پایا وہ اس کی ہو گئی۔ سمندر پر حضرت انسان نے قابو پایا وہ انسان کا ہو گیا۔ فضا پر قابو پایا وہ اس کی ہو گئی۔ جو قوم چاند پر سب سے پہلے قابو پالے گی وہ اس کی مالک ہو جائے گی، جو مریخ یا سورج پر سب سے پہلے

قابو پالے گی وہ اس کی مالک ہو جائے گی۔ یہ قومی ملکیت کی صورت ہے۔ افراد کے لیے بھی یہی صورت ہے۔ قدرت کی تمام چیزیں انسان کے لیے مباح ہیں۔ سمندر کی مچھلیاں، فضا کے پرندے، جنگلوں کے جانور، انسان کے لیے مباح ہیں۔ سمندر سے موتی جو پہلے نکال لے گا وہ اس کا ہے۔ نافہ مشک، لعل بد خشاں اور کوئی بھی ہیرا، قیمتی سے قیمتی پتھر جو اب تک قدرت کی تحویل میں تھا، جو انسان پہلے اس پر قبضہ کرے گا وہ اس کا ہو جائے گا۔

مگر قبضہ کے کیا معنی؟ صرف یہ کہ بلا شرکت غیر یہ اس کو اپنے کام میں لاسکتا ہے۔ نفع کے سلسلہ میں تبادلہ بھی ایک نفع ہے۔ غوطہ زن نے سمندر سے موتی نکالا اور کوہ کن نے پہاڑ کی چٹان چھاڑ کر کوئی لعل برآمد کیا۔ ان دونوں کو حق ہے کہ آپس میں تبادلہ کر لیں۔ اسی کا نام خرید و فروخت اور انتقال ملکیت ہے، مگر حقیقی ملکیت کس کی ہے اور حقیقی مالک کون ہے؟ ظاہر ہے حقیقی مالک وہ ہے جس نے پیدا کیا، بنایا، بڑھایا، جس نے ابر نیساں کی ایک بوند کو سیپ میں بند کر کے پالا اور پرورش کیا، یہاں تک کہ وہ قطرہ باراں آبدار قیمتی موتی ہو گیا۔ انسان کی ملکیت یہ ہے کہ اس کو اپنے کام میں لاسکتا ہے، اس سے نفع اٹھا سکتا ہے، کسی دوسرے انسان کو روکنے کا حق نہیں پہنچتا۔ علماء اسلام نے ملکیت کی تعریف میں اسی مفہوم کو ادا کیا ہے۔

علامہ الامام قرانی۔ متوفی ۶۸۴ھ ۱۲۸۵ء کے الفاظ یہ ہیں:

الملك اباحتہ شرعیۃ فی عین او منفعة تقتضی تبکن صاحبها من الانتفاع بتلك العین او المنفعة
او اخذ العوض عنها من حیث هی کذلک (انوار البروق فی انواع الفروق، مطبوعہ یورپ ص ۲۴۴ ج ۳، بحوالہ الملکیۃ فی الاسلام
لسید ابی نصر احمد الحسینی)

”ملک، شریعت کی طرف سے کسی چیز میں یا کسی چیز کے نفع میں ایک ایسی اجازت ہے جس کا تقاضا ہوتا ہے کہ یہ شخص جس کو یہ اجازت حاصل ہے، خاص اس چیز سے یا اس کی منفعت سے نفع حاصل کرے یا اسی حیثیت میں کہ شریعت نے اجازت دی ہو، اس چیز کا یا اس کی منفعت کا بدلہ لے لے۔“

قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) عبید اللہ بن مسعود الحنفی المتوفی ۲۵ھ، ۱۳۴۴ء صاحب شرح الوقایہ عرف ”صدر الشریعۃ الثانی“ نے یہ تعریف کی:

هو اتصال شرعی بین الانسان و بین شی یكون مطلقا تصرفه فیہ وحاجز اعن تصرف الغیر فیہ
(شرح الوقایہ۔ کتاب العتاق)

”ملک، انسان اور کسی چیز کے درمیان شریعت کا تجویز کردہ ایسا تعلق ہے جو اس شخص کے لیے جائز قرار دیتا ہے کہ وہ اس میں تصرف کرے اور دوسرے کے تصرف کو روکتا ہے۔“

شارح ہدایہ علامہ کمال الدین ابن الہام متوفی ۸۶۱ھ، ۱۴۵۷ء کی تعبیر یہ ہے:

الملك قدرة یثبتها الشارع ابتداء علی التصرف الالبان (بحوالہ الاشیاء والنظائر ص ۵۳۱، القول فی الملک۔ الفن الثالث)

”ملک، تصرف کرنے کی وہ قدرت ہے جو شریعت نے بلا واسطہ ثابت کی ہو بشرطیکہ کوئی مانع نہ ہو۔ یعنی ایسی قدرت کہ اگر کوئی شرعی (قانونی) رکاوٹ نہ ہو تو ہر طرح کا تصرف کر سکتا ہے۔ (تصرف کی طاقت وکیل کو بھی ہوتی ہے، مگر بلا واسطہ ہوتی بلکہ موکل کی عطا کردہ ہوتی ہے، لہذا وکیل کو مالک نہیں کہا جائے گا۔“

ایک دیوالیہ جس کو عدالت نے نوٹیس دے دیا کہ وہ کوئی چیز بیچ نہیں سکتا۔ وہ اگرچہ تصرف نہیں کر سکتا مگر وہ اپنے اثاثہ کا مالک ہے۔ ہندوستان کے مشہور ماہی ناز فیلسوف اسلام حضرت شاہ ولی اللہ المحدث ادہلوی، المتوفی ۱۷۶ھ، ۱۷۶۳ء کے الفاظ نہایت مختصر اور واضح ہیں، وہ فرماتے ہیں:

معنی الملك فی حق الادمی کونہ احق بالانتفاع من غیرہ (جزیۃ اللہ البالغہ، ابواب ابتغاء الرزق ج ۲ ص ۹۶)

”آدمی کے حق میں ملک کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کے مقابلے میں اس کو نفع اٹھانے کا حق زیادہ ہے۔“

بہر حال جب کہ ملکیت انسانی کی حقیقت صرف یہ نکلی کہ اس نے ایسا قابو پالیا یا اس کو ایسی قدرت میسر آگئی جس سے اس کو نفع حاصل کرنے کا حق ہو گیا، تو ایمانداری یہ ہے کہ اس مقبوضہ کو انسان امانت یا عاریت سمجھے، اس کے اصل مالک کو پہنچانے اور اپنے تصرف اور انتفاع کو مالک حقیقی کی ہدایت کے ماتحت رکھے۔ جن حقیقت شناس خدائے سیدہ بزرگوں نے قرآن اور مذہب کی روشنی میں اسلام اور احکام اسلام کے فلسفہ کو سمجھا پھر اس کو فارسی زبان کے شیشہ میں ڈھالا۔ ان میں سے ایک شعر ہے:

در حقیقت مالک ہر شے خدا است

ایں امانت چند روزہ نزد ماست

یہ شعر مسلمانوں کے عقیدہ کے عین مطابق ہے، اس لیے ہر باذوق مسلمان کی زبان پر ہوتا ہے اور وہ جب اپنی اور ان چیزوں کی حقیقت پر غور کرتا ہے جن کو وہ اپنی سمجھتا ہے تو خاص جذبہ اور کیف کے ساتھ اس شعر کو گنگنا تاتا رہتا ہے۔

انفرادی ملک کی ضرورت

امانت یا عاریت کو ملک کی حیثیت کیوں دی جاتی ہے؟

گائے، بیل وغیرہ جتنے بھی جانور ہیں ان کے سامنے صرف پیٹ بھرنے یعنی بقاء حیات کا مسئلہ ہے، قدرت ان کی رہنمائی کرتی ہے اور یہ جانور قدرتی ذخیروں سے پیٹ بھر لیتے ہیں۔ یہاں ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اگر انسان کے سامنے بھی صرف بقاء حیات کا مسئلہ ہوتا تو قطعاً ضرورت نہیں تھی کہ انسان کے حق میں ملک۔ ملک کی حیثیت اور اس کی ضرورت پر بحث کی جاتی، لیکن انسان کے سامنے پیٹ سے پہلے خود انسانیت کا مسئلہ ہے۔ انسان ہے تو لا محالہ اس میں انسانیت ہونی چاہیے۔ انسانیت کیا ہے، انسانیت کیسے پیدا کی جائے؟ ان مسائل کو اگر پیٹ کے مسئلہ سے مقدم نہ رکھا جائے تو انسان اور حیوان میں فرق نہ رہے۔

مسئلہ انسانیت اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک قدرت کی پیدا کردہ چیزوں پر قدرت کی طرف سے افراد انسان کے لیے ایسے تصرفات کا حق نہ تسلیم کیا جائے جن کو مالکانہ تصرفات اور مالکانہ اختیارات کہا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان سماج چاہتا ہے اور سماج یا معاشرہ ہی ایسی خصوصیت ہے جو انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتی ہے اور تعمیراتی و تمدنی ترقی کی بنیاد بنتی ہے۔ انسانیت ایسی خصوصیتوں اور خصلتوں کا نام ہے جن سے معاشرہ اور سماج میں خوبی اور عہدگی پیدا ہو، جن کے ذریعہ ایک انسان بہترین سماج کا معمار بن سکے، ورنہ کم از کم کسی باعزت اور شریف سوسائٹی کا رکن بن سکے۔

معاشرہ اور سماج کے لیے باہمی تعاون اور امن بنیادی شرط ہے۔ ان شرطوں کے بغیر سماج کا وجود ہی نہیں ہو سکتا اور اگر بالفرض وجود ہو جائے تو وہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اور اچھا سماج وہ ہے جس کے افراد باہمی رابطہ انسانیت اور محبت کے رشتہ میں جکڑے ہوئے ہوں۔ ہمدردی کی پہنچ اس رشتہ کے اندر سرایت کیے ہوئے ہو، رحم اور شفقت کے پودے لگے ہوئے ہوں جو بڑھ چڑھ کر سماج کو انسانیت اور شرافت کا گلشن بنارہے ہوں۔

اسباب محبت

محبت روحانی تعلیم سے بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ ماں باپ کی محبت فطری ہوتی ہے، لیکن سماج اور معاشرہ کا ہر ایک فرد دوسرے کاماں باپ نہیں ہوتا، ان میں برابر کے بھائی بہن بھی ہوتے ہیں اور ایسے اجنبی بھی ہوتے ہیں جن سے خون کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا، یا اگر ہوتا ہے تو بہت دور کا۔ روحانی تربیت بھی ہر ایک کا حصہ نہیں ہے۔ حسن کا چرچہ بہت ہے، جس کے لیے عشق و محبت کا سرمایہ لٹایا جاتا ہے، مگر اس متاع پر جان قربان کرنے والے بہت کم ہیں۔ حضرات شعراء کو دنیا کے شعریں صرف ایک ہی مجنوں ملا ہے مگر اس کا بھی حسب نسب معلوم نہیں اور نہ یہ معلوم کہ کس ملک کا رہنے والا تھا۔ لفظ مجنوں عربی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحرائے عرب کا ہو گا۔

بہر حال مخصوص صورتوں اور نادر مثالوں کو چھوڑ کر عام بات یہی ہے کہ محبت اور انسانیت ثمرہ ہوتا ہے احسان کا، نتیجہ ہوتا ہے لطف و کرم کا، ایثار اور قربانی کا۔ داد و دہش اور سخاوت کے پودوں پر محبت کے پھول کھلا کرتے ہیں۔ ہدیہ اور تحفہ کی ڈالیوں پر عنایت و شفقت کے غنچے چٹا کرتے ہیں۔ لیکن یہ اسباب محبت جب ہی وجود میں آسکتے ہیں اور معاشرہ و سماج وجود پذیر ہو کر بہتر جب ہی بن سکتا ہے، جب افراد کو مالکانہ اختیارات حاصل ہوں اور جن چیزوں کو قدرت کی امانت کہا گیا ہے وہ ان افراد کے لیے مملوک کی حیثیت رکھیں۔ سخاوت جب ہی ہو سکتی ہے جب اپنے پاس کچھ ہو۔ تب ہی کسی پر احسان ہو سکے گا، تب ہی ایثار اور قربانی کی حقیقت کھل کر سامنے آئے گی، کہ آپ ضرورت مند کی ضرورت کو مقدم رکھتے ہیں یا اپنے بنک بیلنس کی خیر مناتے ہیں۔

اسلام ایک خاص قسم کا سماج رو نما کرنا چاہتا ہے۔ قرآن شریف کی ہدایت اور تعلیم کے بموجب اس کے افراد ایسے ہونے چاہئیں:

جو خرچ کرتے رہتے ہوں خوشی میں اور تکلیف میں۔ جو دبا لیتے ہوں غصہ اور معاف کرتے ہوں لوگوں کو۔ (آل عمران: ۱۳۴)

جو نماز کو پوری شان کے ساتھ ادا کریں اور اللہ تعالیٰ نے جو ان کو دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر (ہر طرح) خرچ کرتے رہیں۔ (الرعد: ۲۲)

جو یتیم، مسکین اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں ایسی حالت میں جب کھانا خود ان کو محبوب ہو۔ (وہ خود ضرورت مند ہوں اور نیت یہ ہو کہ) ہم صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کھانا کھلاتے ہیں۔ تم سے (بھوکوں اور ضرورت مندوں سے) نہ اس کا کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔ (الدھر: ۹)

جن کی کروٹیں اوقات شب میں بستروں سے جدا رہیں، خدا کا خوف رکھتے ہوئے، اس کی رحمت کی امید لگاتے ہوئے اپنے رب کو یاد کرتے رہیں اور جو کچھ اللہ نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہیں۔ (البقرہ: ۱۶)

جورات کو بہت کم سوئیں، اوقات سحر میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہیں۔ جن کے مالوں میں سائل کا بھی حق ہو اور اس کا بھی جو محروم ہے (مگر سوال نہیں کرتا)۔ (الذاریات: ۱۹ تا ۲۱)

جو خدا کے عہد کو پورا کریں، اس کو توڑیں نہیں اور ان سے جوڑے رکھیں جن سے جوڑنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ جو اپنے رب سے ڈرتے رہیں اور اندیشہ رکھیں برے حساب کا۔ جو اپنے رب کی رضا حاصل کرنے کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں۔ (الرعد: ۲۱)

جو پورا کرتے ہیں منت کو اور ڈرتے ہیں اس دن سے جس کی برائی پھل پڑے گی۔ (الدھر: ۷)

برائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہوں۔ (الرعد: ۳۸)

جو کام کریں آپس کے مشورہ سے اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہیں۔ (اشوری: ۳۸)

جو صبر کرنے والے ہوں، سچے ہوں، حکم بجالانے والے، خرچ کرنے والے اور گناہ بخشوانے والے پچھلی رات (اوقات سحر) میں۔ (آل عمران: ۱۷)

اس طرح کا معاشرہ اور سماج ہر ایک اصلاحی تحریک کا مقصد اور نصب العین ہونا چاہیے، لیکن اسی طرح کے سماج کی تشکیل و تخلیق میں جو چیز بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، وہ ”انفاق“ ہے یعنی اپنی دولت کو خرچ کرنا۔ احسان اور لطف و کرم جب ہی ہوتا ہے جب کوئی اپنی جیب سے خرچ کرے، یہی خرچ دوسرے کو متاثر کرتا ہے۔ اپنی ضرورت کو پیچھے ڈال کر جب دوسرے کی ضرورت مقدم سمجھی جائے گی اور اس پر عمل کیا جائے گا تو اس کا ثمرہ جذبہ شکر گزاری ہو گا، جو شکر گزار جاں نثار بھی بنا سکتا ہے اور اس کا اثر وہ نظم و ضبط بھی ہو گا جو جذباتِ جاں نثاری کے نتیجہ میں پیدا ہو سکتا ہے کہ احسان کرنے والا قدرتی طور پر فرمانروا بن

جاتا ہے، جس کی حکومت دلوں پر ہوتی ہے۔

لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (الزخرف: ۳۲)

تسخیر کا بہترین عمل احسان ہے۔ خصوصاً وہ احسان جس میں ایثار بھی ہو۔

الانسان عبد الاحسان

(۲)

اگر اخلاق کی دنیا میں ایسا انقلاب آجائے کہ بخل، حرص، طمع، انسانیت کے جوہر مانے جائیں، کمزوری، کمزوری سے فائدہ اٹھانا، دانشمندی، کاروباری کمزور فربہ۔ جھوٹا پروپیگنڈہ اور نمائش فنی کمالات سمجھے جائیں۔ ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور شاطرانہ چالوں سے استحصال پر فخر کیا جائے۔ خود غرضی اور زبردستی کو مذہب اور دھرم بنا لیا جائے تو اس سے پہلے کہ ہمارے دلائل کے قلعے مسمار ہوں ہم خود بحث کا دروازہ بند کر دیں گے۔ لیکن اگر انسانیت اور شرافت کا اتنا وجود اور نمود باقی ہے کہ گرتے کو سنبھالنا، کمزور کی مدد کرنا، بے لوث اور بے غرض ہو کر کام کرنا، دوسرے کے فائدے کے لیے اپنے فائدہ کو پیچھے ڈال دینا، سیر چشتی، سخاوت، فرخ حوصلگی، معاملہ کی صفائی، سچائی، دیانتداری جیسے اوصاف و خصائل انسانیت کے جوہر اور انسان کے کمالات مانے جاتے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ انفرادی ملکیت کو ختم کر دیا جائے، تو کیا کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ یہ کمالات ظاہر ہوں اور انسانیت اور شرافت کا سر بلند ہو؟

بیشک انفرادی ملکیت ختم ہونے سے چند خرابیاں ختم ہو جائیں گی، مثلاً چور بازاری، ملاوٹ اور جھوٹے پروپیگنڈے کا موقع نہیں رہے گا، مگر اس خوبی کے ساتھ پہلی خرابی یہ ہے کہ چور بازاری وغیرہ کا عمل اگرچہ ختم ہو جائے گا، مگر وہ جذبہ جو چور بازاری یا ملاوٹ وغیرہ کا (محرم) ہوتا ہے، ختم نہ ہو گا اور ممکن ہے وہ اپنی تسکین کے لیے کوئی دوسری راہ نکال لے، جو اس سے زیادہ شرمناک اور پر خطرہ ہو۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ وہ پاک جذبات جو مکارم اخلاق یعنی رحم و کرم اور صداقت و دیانت کا سبب اور محرک ہوا کرتے ہیں، وہ افسردہ ہو کر بے نام و نشان ہو جائیں گے اور انسانیت میں ہم پلہ حیوانیت بن کر رہ جائے گی۔

(۳)

ہمیں حریت اور آزادی کا بھی تجزیہ کرنا ہے جو انسان کا پیدا نشی حق ہے اور جس کے لیے ہر قربانی نہ صرف صحیح بلکہ لازم اور واجب مانی جاتی ہے۔

جمہوریت کو عمل اور تجربہ کی کسوٹی پر کسا گیا تو یہ ناقابل انکار حقیقت سامنے آئی کہ خود اپنی رائے اور ووٹ سے اپنے معاملات کی تکمیل کو چند افراد کے ہاتھ میں دے دینے کا نام جمہوریت ہے۔ جمہوریت کو اگر جال کھدیا جائے تو غلط نہ ہو گا، اگرچہ اس جال کے بننے والے جمہور ہی ہوتے ہیں اور اس جال کی رسی چند افراد کے حوالے کرتے ہیں۔ یہ جال برا نہیں بہت اچھا ہے، بشرطیکہ یہ ذمہ دار افراد سچائی اور دیانت داری

کے ساتھ دستور کی پابندی کریں اور صحیح معنی میں اپنے آپ کو جوابدہ سمجھیں۔ لیکن اگر انفرادی ملکیت کو بھی اس جال کی ڈوریوں میں لپیٹ دیا جائے تو پھر دیکھنا ہو گا کہ فرد کی حیثیت باختیار اور آزاد رہتی ہے یا فرد ایک مشین کا پرزہ بن جاتا ہے جو ”مشین مین“ کے اشاروں پر گردش کے لیے مجبور ہو جاتا ہے اور حریت فکری یا شخصی آزادی تو درکنار، ہوش و حواس سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

حلقہ در گردنم افگندہ دوست

مے برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ (یوسف: ۶۷)

”فیصلہ صرف اللہ کا۔“

یہی وہ ممتاز مقام اور حد فاصل ہے جو اسلام کے مالی نظام کو ایک طرف کمیٹیٹلزم اور سرمایہ دارانہ نظام سے اور دوسری طرف کمیونزم، اشتراکیت اور اشتمالیت سے جدا کرتی ہے۔

در کف جام شریعت در کف زندان عشق

ہر ہوسنا کے نداند جام وسنداں بافتن

اسلام فرد کو ملکیت عطا کرتا ہے، مگر یہ گوارہ نہیں کرتا کہ کسی وقت بھی فرد اس حقیقت کو فراموش کر دے کہ یہ ملک در حقیقت امانت ہے، جس کو ملکیت کی تعبیر مستعار دیدی گئی ہے۔ اسلام، دولت کی تقسیم خود کرتا ہے، تقسیم کے بعد فرد کو جو کچھ دیتا ہے وہ بھی اس شرط پر کہ باقی ماندہ میں بھی اس کو فیصلہ خداوندی کی تعمیل کرنی ہوگی۔ اسلام نے فیصلہ کے اصول مقرر کر دیے ہیں، جن کے ماتحت تفصیلات کو مرتب کرنا اور ان کو نافذ کرنا اس نظام کے حوالہ ہوتا ہے جس کو خلافت کہا جاتا ہے، جو ایک طرف حاکم علی الاطلاق یعنی خداوند عالم کی نیابت ہوتی ہے کہ وہ ذمہ داریاں پوری کرے جو رب العالمین نے اپنی مخلوق کے بارے میں اپنے اوپر لی ہیں۔ مثلاً ارشاد ہے:

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ (ہود: ۶)

”اور کوئی نہیں پاؤں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر ہے اس کی روزی۔“

دوسری طرف وہ بندگان خدا کی نیابت ہوتی ہے، تاکہ وہ خدمات انجام پاسکیں جن کے لیے جماعتی طاقت اور فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

خليفة صرف مخلوق کے سامنے نہیں بلکہ خالق کے سامنے بھی جوابدہ ہے اور اسی لیے وہ پابند ہے کہ جس طرح مخلوق کے معاملات میں وہ شوری سے مدد حاصل کرے اسی طرح وہ خالق کے عطا کردہ قانون اور دستور کے منشاء کو سمجھنے میں بھی شوری سے مدد حاصل کرے۔

قرآن حکیم سے احکام شریعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت کا ثبوت

طریق نزول سے استدلال

قرآن حکیم دفعۃً نہیں نازل ہوا بلکہ ۲۳ سال کی مدت میں حسب ضرورت و مصلحت بتدریج اس کا نزول ہوا ہے، یعنی جیسی ضرورتیں پیش آئیں اور جس قسم کے مصالح کی رعایت ناگزیر ہوئی، ان کی مناسبت سے احکام کا نزول ہوتا رہا۔ اس طریق نزول سے ایک طرف حالات و زمانہ کی رعایت کا ثبوت ملتا ہے تو دوسری طرف زندگی اور قانون میں باہمی ربط کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضہ فرماتی ہیں:

انما نزل اول۔ انزل سورة من الفصل فيها ذكر الجنة والنار حتى اذا تاب الناس الى الاسلام نزل الحلال والحرام ولونزل اول ما نزل لاتشبهوا الخمر لقالوا الاندع الخمر ابدوا لولونزل لاتزنوا لقالوا الاندع الزنا ابدوا

”پہلے مفصل (سورہ حجرات سے آخر قرآن تک) کی وہ سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت و دوزخ (ترغیب و ترہیب) کا ذکر ہے، پھر جب لوگ اسلام پر قائم ہو گئے تو حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے، مثلاً اگر شراب نہ پینے کا حکم پہلے ہی نازل ہو جاتا تو لوگ کہہ دیتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے اسی طرح اگر ابتدا ہی میں زنا کی ممانعت کا حکم نازل ہو جاتا تو لوگ اس کے چھوڑنے سے ہی انکار کر دیتے۔“ (الشاطبی)

احکام کے انداز بیان سے استدلال

قرآن حکیم نے احکام کے بیان کا جو انداز اختیار کیا ہے، اس سے بھی حالات و زمانہ کی رعایت کا ثبوت ملتا ہے۔

مثلاً بعض احکام میں صرف مقاصد بیان کیے گئے ہیں اور ان کی شکل و صورت نہیں متعین کی گئی ہے اور بعض میں صرف حدود اربعہ ذکر کیے گئے ہیں اور شکل و صورت سے بحث نہیں ہے۔ اسی طرح بہت سے احکام میں اصولی اور عمومی انداز کی گفتگو ہے اور جزئیات کی تشریح نہیں ہے اور بعض جگہ جزئیات کی تشریح کے باوجود موقع و محل کے تعین کی اجازت دی گئی ہے، فقہاء نے اسی صورت حال کو دیکھ کر کہا ہے:

ان الله انزل من الاحكام ما يصلح لكل زمان ومكان فنبهنا مناصص عليه نصا صريحا ومنها قواعد عامة يسكن تطبيقها حسب ظروف الناس واحوالهم وهيئاتهم

”اللہ نے بعض وہ احکام نازل فرمائے ہیں جن میں ہر زمان و مکان کی صلاحیت موجود ہے اور بعض وہ قواعد عامہ نازل کیے جن کے ذریعہ لوگوں کے ظروف، ان کے احوال اور ماحول کی مطابقت ممکن ہے۔“

(الفقہ علی المذاہب الاربعہ مقدمہ ثانیہ، ص ۱۷)

ایک اور موقع پر ہے:

فلا بد من حدوث وقائع لاتكون منصوصا على حكمها ولا يوجد لاولين فيها اجتهاد وعند ذلك فاما ان يترك الناس فيها مع احوالهم او ينظر فيها بغير اجتهاد شرعي وهو ايضا اتباع وذاك كله فساد

”یہ بات ضروری ہے کہ ایسی نئی نئی صورتیں پیش آئیں جن کا حکم نہ صراحتاً موجود ہو اور نہ پہلے لوگوں نے اجتہاد کیا ہو، ایسی حالت میں اگر لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ من مانی کارروائی کریں یا اجتہاد شرعی کے بجائے محض اٹکل کے تیر چلائیں تو یہ سب فساد اور ہلاکت ہے۔“ (الموافقات ج ۴، ص ۱۰۴)

تکمیل ہدایت و جامعیت کا مطلب

فالقرآن على اختصار جامع ولا يكون جامعاً الا المجموع فيه امور کلیات لان الشريعة تم نزوله لقوله تعالى: اكملت لكم دينكم (الموافقات ج ۴، ص ۳۶۷)

”قرآن اپنے اختصار کے باوجود جامع ہے اور جامع اسی صورت میں ہے کہ اس میں امور کلیہ کا بیان ہے، کیونکہ شریعت قرآن کے نزول کے ساتھ مکمل ہو گئی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: الیوم اکملت لکم دینکم۔“

اس صورت حال سے نہ تکمیل ہدایت پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ قرآن حکیم کی جامعیت پر کسی قسم کی زد پڑتی ہے، بلکہ غور سے دیکھا جائے تو جامعیت اور تکمیل کی یہی صورت ممکن ہے، نہ وہ جس کی نمائندگی عام طور پر ہو رہی ہے اور نتیجتاً الہی شریعت ایک خاص دور اور زمانہ میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

مالیاتی تنظیم و تقسیم کی کوئی شکل متعین نہیں

انداز بیان سے احکام میں حالات و زمانہ کی رعایت کی چند مثالیں یہ ہیں:

(۱) مالیات کی تنظیم و تقسیم:

قرآن حکیم نے اس کی کوئی خاص شکل و صورت متعین نہیں کی، صرف مقصد پر زور دیا ہے کہ اللہ کی مخلوق کو رزق حلال میسر ہو اور بدلے ہوئے حالات کے مطابق عدل و انصاف کے ساتھ اس کی حاجتیں پوری ہوتی رہیں۔ انفرادی و اجتماعی ملکیت کی بحث چونکہ طریق کار سے متعلق تھی جس میں حالات و زمانہ کی رعایت ناگزیر ہے، اس بنا پر اس بحث کو کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ امانت دنیا کا تصور دے کر ہمیشہ کے لیے اس بحث کو ختم کر دیا ہے کہ ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ ہے اور انسان کو ساری چیزیں نائب ہونے کی حیثیت سے بطور امانت استعمال کے لیے دی گئی ہیں۔

عمومی انداز کی چند آیتیں

اس سلسلہ کی چند آیتیں عمومی انداز کی یہ ہیں:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا (النساء: ۵۸)

”بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات کا حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل تک پہنچا دو۔“

آیت میں ”امانات“ سے تمام حقوق واجبہ اور ہمہ قسم کی ذمہ داریاں مراد ہیں:

ان الامانات جمع امانة يعم الحقوق المتعلقة بدمتهم من حقوق الله تعالى وحقوق العباد۔

(اسلام کا زرعی نظام ص ۲۹۲)

”امانت جمع امانت کی ہے جو تمام حقوق واجبہ کو عام ہے خواہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد ہوں۔“

دوسری جگہ ہے:

وَأَنْفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَعْلِفِينَ فِيهِ ط (الحديد: ۷)

”اور اس میں سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تمہیں خلیفہ بنایا ہے۔“

تنظیم و تقسیم کے بعض احکام ذکر کرنے کے بعد ہے:

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ط (الحشر: ۷)

”تاکہ دولت تمہارے مالداروں کے درمیان سمٹ کر نہ رہ جائے۔“

خرچ کے بارے میں ایک موقع پر سوال کا جواب یہ دیا گیا:

قُلِ الْعَفْوَ ط (البقرہ: ۲۱۹)

”آپ کہہ دیجئے! جو ضرورت سے فاضل ہو سب خرچ کر دو۔“

دوسرے موقع پر یہ جواب مذکور ہے:

قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّهِ الدِّينُ وَالْآقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ

”آپ کہہ دیجئے! جو بھی تم اپنے مال سے نکال سکتے ہو نکالو تو اس کے مستحق تمہارے ماں باپ، عزیز و اقرباء، یتیم، مسکین اور مسافر ہیں۔“ (البقرہ: ۲۱۵)

جواب کا یہ اختلاف معاشرتی ضرورت کے لحاظ سے تقسیم کے حدود میں فرق کو ظاہر کرتا ہے اور

”الغفو“ سے تو اس حد تک ثبوت ملتا ہے کہ حالات کے زیادہ دباؤ کے وقت ضرورت سے فاضل اموال میں

کوئی حق نہیں ہے۔

ان آیتوں کے علاوہ بہت سے مقامات پر خرچ کرنے کی تاکید ہے اور مستحقین کی تفصیل ہے لیکن

مقدار اور تقسیم کی نوعیت سے کوئی بحث نہیں ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کے احکام حالات

و زمانہ کی رعایت سے بدلتے رہتے ہیں۔

خاص شکل کے تعین سے ہر دور کی ضرورتیں نہیں پوری ہو سکتی ہیں

جس طرح معاشرتی زندگی کے حالات ہر دور میں یکساں نہیں ہوتے اسی طرح عدل و توازن پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کے قوانین میں بھی یکسانیت نہیں ملحوظ رہ سکتی۔

جب قوم طبقاتی کشمکش میں مبتلا ہو، سرمایہ ایک طبقہ میں سمٹ کر رہ گیا ہو اور دوسرا طبقہ وسائل معاش سے محروم ہو کر نان جوئی کا محتاج ہو تو ایسی حالت میں عدل و توازن پیدا کرنے کے قوانین اس وقت سے یقیناً مختلف ہوں گے جب کہ قوم خوشحال ہو اور معاشرتی عدم توازن محرومی کی حد تک نہ پہنچا ہو۔ ایسی صورت میں قرآن حکیم اگر تنظیم و تقسیم کے کسی ایک طریقہ کی نشان دہی کر دیتا یا مروجہ انفرادی و اجتماعی ملکیت کی بحث کو اصولی اور بنیادی قرار دیتا تو اس کی عالمگیریت پر کس قدر زبردستی؟ اور تکمیل ہدایت کی بات کس حد تک تشنہ رہ جاتی؟

مقصود عدل کا قیام ہے، طریق کار سے بحث نہیں

علامہ ابن قیمؒ کہتے ہیں:

ان مقصود اقامة العدل بين عبادة وقيام الناس بالقسط فأى طريق استخراج بها العدل والقسط فهي من الدين ليست مخالفة له (الطرق الحكمية: ص ۱۴)

”شریعت سے اللہ کا مقصود بندوں کے درمیان عدل و انصاف کا قیام ہے، جس طریق کے ذریعہ عدل

و انصاف قائم کیا جائے گا وہی دین ہو گا۔ اس کو دین کے خلاف نہ کہا جائے گا۔“

ایک اور جگہ علامہؒ نے اس حقیقت کو دوسرے انداز میں بیان کیا ہے:

فان الشريعة مبنيها واساسها على الحكم ومصالح العباد في البعاش والبعاد وهي عدل وكلها ومصالح كلها

وحكمة كلها وكل مسئلة خرجت من العدل الى الجور وعن الرحمة الى ضدها وعن المصلحة الى المفسدة

وعن الحكمة الى العبث فليست من الشريعة وان ادخل فيها بالتاويل (اعلام الموقعين، ج ۳، ص ۲۷)

”شریعت کا مدار حکمتوں اور دنیوی و اخروی زندگی کی مصلحتوں پر ہے، وہ مجسمہ عدل و رحمت اور کل

حکمت و مصلحت ہے۔ جو مسئلہ بھی عدل سے جور کی طرف، رحمت سے زحمت کی طرف، صلیحت سے مفسدہ کی

طرف اور حکمت سے عبث کی طرف خروج کرے گا، وہ شریعت کا مسئلہ نہ ہو گا اگرچہ تاویل کے ذریعہ شریعت

میں داخل کر لیا جائے۔“

یہ عبارت باب تغیر الفتویٰ کی ہے جس میں علامہ نے بہت سی مثالوں کے ذریعہ حالات و زمانہ کی

رعایت ثابت کی ہے اور کہا ہے:

لهذا فصل عظیم النفع جدًا وقع بسبب الجهل به غلط عظیم على الشيعة اوجب من الحرج والبشقة وتكليف مالا سبيل اليه (اعلام الموقعين ج ۳ ص ۲۷)

”یہ فصل نہایت نفع دینے والی ہے، اس سے جہالت کی وجہ سے شریعت کے بارے میں بڑا مغالطہ ہو گیا ہے اور لوگ طرح طرح کی تنگی و مشقت میں مبتلا ہو گئے ہیں جن سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔“

معاشرتی حالات کے لحاظ سے عدل و توازن کے قوانین میں تفاوت

معاشرتی حالات کے لحاظ سے عدل و توازن کے قوانین میں جو تفاوت ہوتا ہے، اس کی کسی قدر تفصیل یہ ہے: فقہاء نے دنیوی مصالح کے تین درجے بیان کیے ہیں:

۱۔ ضروریات ۲۔ حاجات اور ۳۔ تکیلات۔ (ادنیٰ، اوسط اور اعلیٰ)

ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کھانے پینے، لباس، مکان، نکاح، سواری وغیرہ کی اس قدر سہولت حاصل ہو کہ بس ان کے ذریعہ کام چلتا رہے۔ اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ عمدہ غذا، بہترین لباس، عالی شان مکان، اچھی قسم کی سواریاں اور خوبصورت عورتوں سے شادی وغیرہ کا سر و سامان ہو۔ اوسط درجہ ان دونوں کے بین بین ہے، یعنی نہ اس قدر وسعت ہو کہ تکیلات کے درجہ کو پہنچ جائے اور نہ اس قدر تنگی ہو کہ ضروریات کے درجہ میں رہ جائے۔ (قواعد الاحکام فی مصالح الانام ج ۱، ص ۶۸)

فقہاء نے اوسط درجہ کی مصالح کو حاجات سے تعبیر کیا ہے:

تقدير النفقات بالحاجات مع تفاوتها عدل وتسوية من جهة ان سوى بين المنفق عليه في دفع حاجاتهم لان في مقادير ما وصل اليهم لان دفع الحاجات هو المقصود الاعظم في النفقات وغيرها من اموال المصالح (قواعد الاحکام ج ۱ ص ۲۸)

”نفقات میں عدل و مساوات کا اعتبار حاجات کے لحاظ سے ہوگا، یعنی یہ ضروری ہے کہ سب کی حاجتیں رفع ہوں، یہ ضروری نہیں ہے کہ سب کو ایک مقدار دیا جائے، کیونکہ نفقات وغیرہ میں شریعت کا مقصود اعظم لوگوں کی حاجتیں رفع کرنا ہے۔“

طریق کار میں کافی وسعت اور گنجائش ہے

اس مقصود اعظم کو حاصل کرنے اور عدل تک پہنچنے کے لیے جس قسم کی تنظیم و تقسیم درکار ہوگی اور جیسے قوانین وضع کرنے ہوں گے، وہ سب شرعی اور اسلامی ہوں گے۔

طریق کار کے لیے ضروری نہیں کہ اس کا ثبوت رسول اللہ ﷺ سے ہو یا اس کے مطابق وحی نازل ہوئی ہو، کیونکہ اس میں حالات و زمانہ کی رعایت سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

فاذا اظهرت امارات الحق وادلت به بأى طريق فذا لك من شهر ودينه ورضاه وامره (اعلام ج ۳)
”جب حق کی علامتیں اور دلیلیں ظاہر ہوں تو جس طریقے سے بھی ہوں، وہ شرع اور دین ہوگا اور اسی میں اللہ کی رضا اور اس کا حکم ہوگا۔“

معاشرہ کو مذکورہ درجہ تک پہنچانے کے لیے طریق کار میں اگر انفرادی حقوق کی پائمانی ہو تو شریعت میں اس کی پوری گنجائش ہے اور حقوق ملکیت کے ہر گورکھ دھندے کو توڑنے کی اجازت ہے۔

لان اعتناء الشہام بالمصالح العامة اوفر واكثر من اعتناؤه بالمصالح الخاصة (قواعد الاحکام: ص ۸۰)
”کیونکہ شریعت میں مصالح خاصہ کے مقابلہ میں مصالح عامہ کا بہت زیادہ لحاظ کیا گیا ہے۔“

اجتماعی نظم و قوانین کی بھی پوری اجازت ہے

ظاہر ہے کہ معاشرتی عدم توازن جب محرومی کی حد تک نہ ہوگا تو مذکورہ درجہ کے لیے بنیادی تبدیلی کرنی پڑے گی اور نہ مقابلہ زیادہ سخت قوانین بنانے کی ضرورت ہوگی، لیکن اگر معاشرہ کا یہ حال ہو کہ ایک طبقہ وسائل حیات سے محروم ہو اور دوسرا ہر قسم کے عیش و عشرت میں مشغول ہو تو اس وقت عدل و توازن پیدا کرنے کے لیے نہ صرف سخت قوانین درکار ہوں گے بلکہ تنظیم و تقسیم کے نظام میں بنیادی تبدیلی بھی ناگزیر ہوگی حتیٰ کہ اگر اجتماعی نظم و قوانین سے مقصود حاصل ہونے کی توقع ہوگی تو اس سے گریز، جرم قرار پائے گا اور لوگوں کی حق تلفی کا باعث بنے گا۔

ليس لابن آدم حق في سوا هذا الخصال: بيت يسكنه وثوب يوارى به عورته وجلف الخبز والباء
”انسان کا تین چیزوں کے علاوہ اور کسی میں کوئی حق نہیں ہے: (۱) رہنے کے لیے گھر (۲) تن ڈھکنے کے لیے کپڑا اور (۳) پانی روٹی کا ٹکڑا۔“
اسی طرح ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

من كان معه فضل ظهر فليعد به على من لا ظهر له ومن كان له فضل من زاد فليعد على من لا زاد له۔
قال تذكر من اصناف المال حتى رأينا انه لاحق لاحد منافي فضل

”جس کے پاس زائد سواری ہو وہ اس کو دیدے جس کے پاس سواری نہیں ہے اور جس کے پاس زائد زاد راہ ہو وہ اس کو دیدے جس کے پاس نہیں ہے۔ (راوی ابو سعید خدری) کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت مختلف قسم کے اموال کا ذکر کیا یہاں تک کہ ہم لوگوں نے سمجھا کہ زائد مال میں ہمارا کوئی حق نہیں ہے۔“
ایک موقع پر حضرت عمرؓ نے فرمایا:

لو استقبلت من امرى ما استندبرت لآخذت فضول اموال الاغنياء فقسمتها على فقراء المهاجرين
”جس بات کا آج اندازہ ہوا ہے اگر پہلے سے ہوتا تو مالداروں سے فاضل اموال لے کر فقراء المهاجرين

میں تقسیم کر دیتا۔“

اسی طرح حضرت علیؑ نے فرمایا:

ان الله تعالى فرض على الاغنياء في اقواتهم بقدر ما يكفي فقراءهم فان جاءوا وعروا وجهه وافيئتم الاغنياء
وحق على الله تعالى ان يحاسبهم يوم القيامة ويعذبهم عليه (مسلم وشكوة والحي لابن حزم)

”اللہ تعالیٰ نے مالداروں پر فقراء کی کفالت فرض کر دی ہے۔ اگر وہ بھوکے ننگے رہے یا اور کسی معاشی پریشانی میں مبتلا ہوئے تو اس بنا پر کہ مالداروں نے ان کا حق نہیں دیا ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے حساب لے گا اور ان کو عذاب دے گا۔“

غرض حکومت و خلافت کو معاشرتی زندگی میں عدل و توازن پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے ہر طریق کار اختیار کرنے اور ہر قسم کے قوانین وضع کرنے کی اجازت ہے خواہ اسکی پہلے سے مثال موجود ہو یا نہ ہو۔

مذہب کے بقا کے لئے معاشی حالت کی اہمیت

مذہب کی ترویج و تبلیغ میں جب تک دنیوی مصالح کو خاص اہمیت نہ دی جائے گی اس وقت تک نہ مذہب کی حفاظت و بقا کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ اقامت دین خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے۔

واعلم ان مصالح الآخرة لا تتم الا بمعظم مصالح الدنيا كالسكك والبشارب والمناكح وكثير من المنافع (تواعد الاحکام: ص ۷۴)

”یاد رکھو کہ آخرت کے مصالح اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے ہیں، جب تک دنیا کے اہم مصالح کا لحاظ نہ کیا جائے جیسے کھانا پینا، شادی بیاہ اور دیگر بہت سے مصالح کا حصول۔“
دوسری جگہ ہے:

واما الاموال فحق الله فيها تابعم لحقوق العباد (تواعد الاحکام: ص ۷۴)

”اموال میں اللہ تعالیٰ کا حق بندوں کے حقوق کے تابع ہے۔“

مسلم ممالک میں اسلامی اجتماعیت کے بغیر چارہ نہیں ہے

موجودہ دور میں مسلم ممالک جن حالات سے دوچار ہیں اور طبقاتی کشمکش کی جس منزل پر پہنچے ہوئے ہیں، ان میں اگر مذہبی پلیٹ فارم سے انفرادی ملکیت کی آڑ میں سرمایہ داری و جاگیر داری نظام کی تائید و تبلیغ کی جاتی رہی تو لازمی طور سے وہ اشتراکیت کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوں گے جیسا کہ بعض ممالک میں رد عمل کے طور پر یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

مسلمانوں میں اگر لاندہیت کے دہارے کو روکنا اور مذہبی کاز کو تقویت پہنچانا ہے تو اسلامی اجتماعیت کی

تبلیغ کرنی ہوگی اور بدلے ہوئے حالات کے مطابق اجتماعی تنظیم و تقسیم کا نظم قائم کرنا پڑے گا۔

اگر وقت کی اس ضرورت و نزاکت کو ملحوظ نہ رکھا گیا اور سرمایہ داری و جاگیر داری سے بدستور غذا اور تقویت حاصل کی جاتی رہی تو وہ دن دور نہیں ہے کہ جو زبانیں آج انفرادی ملکیت کی آڑ میں سرمایہ داری و جاگیر داری کو ”اسلام“ ثابت کر رہی ہیں، کل وہی زبانیں اشتراکیت کو اسلام ثابت کرنے میں پیش پیش ہوں گی۔

جو تبدیلی اسلام کے نام پر آسکتی ہے، اگر مذہبی نمائندے اس کو قبول کرنے کے لیے کسی مصلحت سے تیار نہ ہوئے تو بدترین شکل میں اس سے کہیں زیادہ تبدیلی ہو کر رہے گی، نہ تاریخ کی فطری رفتار کو کوئی بدل سکتا ہے اور نہ کسی کی خواہش و آرزو حالات کے دباؤ کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

حکومت کی شکل متعین نہیں ہے

۲۔ حکومت

قرآن حکیم نے حکومت کی کوئی خاص شکل و صورت متعین نہیں کی بلکہ حیثیت، مقصد اور بنیادی اصول کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ مثلاً:

حکومت میں اللہ کا قہر ہو گا

(۱) حکومت کی بنیاد اللہ کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرنے پر ہوگی۔

لَهُ الْمُلْكُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ (الزمر: ۶)

”اس کا ملک ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔“

(۲) عدل و رحمت کے قوانین تمام مخلوق کے لیے یکساں ہوں گے

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَهُ وَفِي الْأَرْضِ إِلَهُ (الزخرف: ۸۴)

”اللہ ہی ہے جو آسمان میں بھی معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے۔“

اللہ کی حکمت عملی منعکس ہوگی

(۳) تنظیم و تقسیم کے قوانین میں صرف اللہ کی حکمت عملی منعکس ہوگی۔ یعنی جس طرح باران رحمت عام ہوتی ہے اور ہر شے اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق مستفید ہوتی ہے اسی طرح ذرائع و مواقع سب کے لیے مہیا ہوں گے اور مقررہ نظم و عدل کے ساتھ سب مستفید ہو سکیں گے۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ (النحل: ۹۰)

”بے شک اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔“

کلام عرب میں عدل اور احسان کے دو لفظ نہایت وسیع اور جامع ہیں، چنانچہ فقہ میں ہے:

اجمع آية في القرآن للحدث على البصالح كلها والزجر عن البفساد بالرها

(القواعد للعلامة ابن عبد السلام از تعليل الاحكام: ص ۲۷۸)

”اس آیت میں تمام مصالح کے حصول اور مفاسد کے دفع پر ابھارا گیا ہے۔“

دوسری جگہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کو رحمت عامہ کے ظہور سے تعبیر کیا گیا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانباء: ۱۰۷)

”اے پیغمبر! ہم نے آپ کو محض اس لیے بھیجا ہے تاکہ رحمت عامہ کا ظہور ہو۔“

اس آیت کے ضمن میں ہے:

فهذا اخبار منه جل وعلا بان ارسال الرسول ﷺ رحمة للناس ومن الرحمة الاذن لهم على لسانه

ﷺ في جلب البصالح ودفع البفساد عنهم ومعلوم ان للناس مصالح يتجدد بتجدد الايام فلو وقف

الاعتبار على المنصوص فقط لوقع الناس في الحرج الشديد وهو مناف للرحمة (تعليل الاحكام: ص ۲۸۸)

”یہ اللہ بزرگ و برتر کی طرف سے اس حقیقت کا اعلان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا لوگوں

کے لیے رحمت ہے اور رسول اللہ کی زبان مبارک پر جلب مصالح اور دفع مفاسد کی اجازت دینا رحمت سے

ہے۔ یہ معلوم ہے، کہ ایام کے بدلنے سے نئے نئے مصالح پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر منصوص

ہی کا اعتبار کیا گیا تو لوگ سخت قسم کے حرج میں مبتلا ہو جائیں گے اور رحمت کے منافی بات لازمی آئے گی۔“

ہر چیز بطور امانت ہوگی

۴۔ کائنات کی ساری چیزیں بطور امانت استعمال کے لیے ہوں گی اور ہر فرد کی حیثیت ”امین“ کی ہوگی

حتیٰ کہ حکومت خود امانت ہوگی جو دوسری تمام امانتوں کی نگرانی کرے گی۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا

بِالْعَدْلِ (النساء: ۵۸)

”بیشک اللہ تمہیں اس بات کا حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے اہل تک پہنچا دو اور جب لوگوں کے

درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔“

اس آیت کے ذیل میں حضرت زید بن اسلم فرماتے ہیں:

ان هذا الخطاب لولاة الامران يقوموا برعاية الرعية وحملهم على موجب الدين والشريعة وعدوا من

ذلك تولية المناصب مستحقها

”آیت کریمہ میں حاکموں کو خطاب ہے کہ وہ رعایا کا مکمل بندوبست کریں، دین و شریعت کے مقتضیات

کا ان کو پابند بنائیں۔ امانت کی ادائیگی میں یہ بھی شمار ہے کہ عہدے صرف ان کے مستحقین کو دیے جائیں۔“

علامہ بن تیمیہؒ کہتے ہیں: وهو كان سبب نزول الآية ”حاکم ہی آیت کے نزول کا سبب ہیں۔“

(الجامع: ص ۳)

شورائی طرز کا نظام ہوگا

۵۔ حکومت شورائی طرز کی ہوگی اور اہل حل و عقد کے مشورہ سے نظم و نسق پر مامور ہوگی۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشورى: ۳۸)

”ان کے معاملات باہمی مشورے سے ہوتے ہیں۔“

خود رسول اللہ ﷺ کو حکم ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ (آل عمران: ۱۵۹)

”اس طرح کے معاملات میں ان سے مشورہ کر لیا کرو۔“

۶۔ مملکت کے تمام افراد بلا تخصیص حقوق میں مساوی ہوں گے، ذات پات، رنگ و نسل، زبان و وطن،

مذہب و ملت کی بنا پر کوئی امتیاز نہ ہوگا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ

أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاهُمْ (الحجرات: ۱۳)

”اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور مختلف برادریاں و قبیلے اس

لیے بنائے ہیں کہ آپس میں تعارف ہو، (ورنہ اللہ کے نزدیک اصل اعتبار کردار کا ہے۔) تم میں شریف اور

معزز وہ ہے جو پرہیزگار ہو۔“

یہ ”تنوع“ قدرت کی نشانیوں میں سے ہے نہ کہ فرق و امتیاز کے لیے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّالْمُونَ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ (الرود: ۲۲)

”زمین و آسمان کی پیدائش اور زبانوں و رنگوں کا اختلاف، اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے۔“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: الناس بنو آدم و آدم خلق من تراب (الطبری)

”سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے ہیں۔“ ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے

فرمایا: الناس كلهم اخوة (مسلم والبوداد) ”سب انسان بھائی بھائی ہیں۔“

سب کے لیے یکساں مواقع ہوں گے

۷۔ کائنات کی چیزیں سب کے لیے ہیں اور استحقاق و استفادہ میں سب مساوی ہیں۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (البقرة: ۲۹)

”اللہ ہی ہے جس نے تم سب کے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کی ہیں۔“
دوسری جگہ ہے:

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرِزْقَيْنَ (الحج: ۲۰)

”تم سب کے لیے ہم نے زمین میں زندگی کے ساز و سامان (وسائل و ذرائع) بنائے اور ان کے لیے بھی جن کو تم روزی نہیں دیتے ہو۔“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: الخلق کلہم عیال اللہ فاحبہم الی اللہ انفعہم لعیالہ

”تمام مخلوق اللہ کی عیال ہے، اللہ کو زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو اس کی عیال کو زیادہ نفع پہنچانے والا ہے۔“

۸۔ حکومت ذرائع پیداوار کی اس طرح تنظیم و تقسیم پر مامور ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کی صفت رزاقی کا مظہر ہے اور دیے ولینے کے پیمانہ میں تخصیص و ترجیح کی صورت نہ پیدا ہونے پائے۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (ہود: ۶)

”زمین میں کوئی جانور ایسا نہیں جس کی روزی کا انتظام اللہ پر نہ ہو۔“

حضرت علیؑ نے ایک موقع پر فرمایا:

اموالہم کاموالنا ودمائہم کدمائنا (نصب الراية: ج ۳، کتاب السیر)

”ان (غیر مسلموں) کے مال مثل ہمارے مال کے ہیں اور ان کی جانیں مثل ہماری جانوں کے ہیں۔“

غیر مسلموں سے تعلقات کی اصل صلح و امن ہے

۹۔ غیر مسلموں سے جنگ اور ارتداد کی سزا وغیرہ ان کے ظلم و زیادتی اور بغاوت کی بنا پر ہے، نہ کہ کفر و شرک اور اختلاف مذہب کی بنا پر۔

أَذِنَ لِلَّذِينَ يُقَتِّلُونَ بِأَنفُسِهِمْ ظَلَمُوا (ج: ۳۹)

”جن (مومنوں) کے خلاف ظالموں نے جنگ کر رکھی ہے، اب انہیں بھی جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔“

فَإِنْ قَتَلُواكُمْ فَاقْتُلُواهُمْ ط (البقرة: ۱۹۱)

”اگر تم سے قتل و قتال کریں تو تم بھی ان سے کرو۔“

جنگ و سزا کی ضرورت اس لیے ہے کہ:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَاسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ (البقرة: ۲۵)

فِيهَا أَنْعَمَ اللَّهُ كَثِيرًا (الحج: ۲۰)

”اگر اللہ بعض کے ذریعہ بعض کی مدافعت نہ کرتا رہتا تو کسی قوم کی عبادت گاہ زمین پر محفوظ نہ رہتی،

خائفان ہیں، گرجے، عبادت گاہیں، مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، وہ سب ڈھا دیے جاتیں۔“

فقہ میں ہے: والقتل امان يكون للمحاربة كما يقوله علماءنا وللشرك كما يقول الخصم

(المبسوط: ج ۱ ص ۳۰)

”اور قتل و قتال، یا جنگ کی وجہ سے ہے جیسا کہ ہمارے علماء کہتے ہیں یا شرک کی وجہ سے ہے جیسا کہ فریق مقابل کہتا ہے۔“

امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ، علامہ ابن تیمیہؒ کا یہ مسلک ہے:

واما من لم يكن من اهل السبائعة والبقائلة فلا يقتل عند جمهور العلماء (الجوامع: ص ۵۵)

”جو منع کرنے والے اور جنگ کرنے والے نہ ہوں، انہیں جمہور علماء کے نزدیک نہ قتل کیا جائے۔“

”الہی شریعت میں غیر مسلموں سے تعلق کی اصل، صلح و امن ہے نہ کہ جنگ و پیکار۔“

(حیات ابن تیمیہ از ابو زہرہ: ص ۵۷۶)

مرتد کی سزا بغاوت کی بناء پر ہے

چنانچہ ارتداد کی سزا کے بارے میں فقہ کی عبارتیں یہ ہیں:

ان القتل باعتبار المحاربة (المبسوط: ج ۱۰، ص ۱۱۰)

”قتل جنگ جوئی کے اعتبار سے ہے۔“

دوسری جگہ ہے: فيقتل لدفع المحاربة (ایضاً) ”قتل کیا جائے گا جنگ کے دفعیہ کی غرض سے۔“

ایک اور جگہ ہے: لان قتل ليس بجزاء على الردة (ایضاً) ”قتل مرتد ہونے کی سزا نہیں ہے۔“

بلاشبہ شریعت میں تبدیل مذہب اور کفر بڑا گناہ ہے لیکن یہ معاملہ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہے۔ (ایضاً)

حکومت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ حکومت صرف بغاوت کی بنا پر سزا دے سکتی ہے جس میں غیر مسلم کی کوئی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ جس کی طرف سے بھی بغاوت پائی جائے گی اس کے خلاف کارروائی ضرور ہوگی۔

وقتل التتار ولو كانوا مسلمين هو قتال الصديق مانعي الزكاة (الاختيارات العلية: ص ۱۷۶)

”تاتاریوں سے جنگ اگرچہ وہ مسلمان ہیں ایسی ہی ہے جیسے حضرت ابو بکرؓ کی جنگ مانعین زکات سے تھی۔“

یمن کے اکثر مانعین زکوٰۃ نے نفس زکوٰۃ سے انکار نہیں کیا تھا بلکہ مرکز کے حوالے کرنے سے انکار کیا تھا۔

حتى قالوا والله ما كفرنابعد ايماننا ولكن شححناعلى اموالنا (الاحكام السلطانية: ص ۴۷)

”ان لوگوں نے کہا: واللہ! ہم نے ایمان کے بعد کفر نہیں کیا لیکن اپنے اموال پر حرص کیا ہے۔“
جو شخص زکوٰۃ مرکز کے حوالے نہ کرے وہ بھی باغی ہے اور اس سے قتال واجب ہے۔

ولو امتنع من ادائها الى الامام العادل مع الاعتراف بوجوبها كانوا من بغاوت المسلمين يقاتلون
على المنع منه (ایضاً)

”اگر امام عادل کو زکوٰۃ نہ دیں، اس کے وجوب کا اگرچہ اعتراف کرتے ہوں تو بھی باغیوں میں شمار ہوں
گے اور قتال واجب ہو گا۔“

حکومت مقصد نہیں ہے

حکومت مقصد نہیں ہے بلکہ وعدے الہی پورا کرنے کا ذریعہ ہے، ایمان و عمل صالح کے نتیجے میں وعدہ
الہی یہ ہے:

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ
أَمْنًا (النور: ۵۵)

”تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیے، اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ انہیں زمین میں
خلیفہ (حاکم) بنائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو (اسی بنا پر) خلیفہ بنا چکا ہے اور جس دین کو اللہ نے ان
کے لیے پسند کیا ہے، اسے مضبوطی کے ساتھ جمادے گا اور خوف کے بدلے انہیں امن عطا کرے گا۔“
استخفاف اور تمکین فی الارض جس کا آیت میں وعدہ ہے، ظاہر ہے کہ وہ حکومت و اقتدار کے بغیر نہیں
پورا ہوتا ہے لیکن پہلے ایمان و عمل صالح ہے، اس کے بعد حکومت و اقتدار ہے۔

غرض حکومت کے لیے قرآن حکیم کے اشارات ملتے ہیں، طریق کار اور ذرائع وغیرہ کی کوئی تفصیل
نہیں ملتی ہے کہ وہ موجودہ طرز کی جمہوری ہو یا صدارتی، شاہی ہو یا فوجی ڈکٹیٹر شپ، اسی طرح انتخاب کی کیا
شکل ہو؟ شوریٰ نظام کا انعقاد کس طرح ہو وغیرہ؟

قرآن حکیم کو مقصد اور بنیادی اصول سے بحث ہے

قرآن حکیم کو اصل بحث مقصد اور بنیادی اصولوں سے ہے جن کی ہر دور میں ضرورت رہتی ہے، ذرائع
اور طریق وغیرہ چونکہ حالات و زمانہ کی رعایت سے بدلتے رہتے ہیں، اس بنا پر ان کو حالات و زمانہ ہی پر چھوڑ
دینا مناسب تھا۔

بالفرض اگر زمانہ نزول میں کسی ایک طریقہ اور ذریعہ کی نشان دہی کر دی جاتی تو بعد میں حالات کی

تبدیلی سے اس میں تبدیلی ناگزیر ہوتی اور پھر قرآن حکیم کے ثبات و دوام کی کوئی صورت باقی نہ رہتی۔
اس تبدیلی کی طرف خود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

الناس اشبه بزمانهم من اسلافهم (البیان والتبيين: ج ۲)

”اپنے اسلاف کے مقابلہ میں لوگ اپنے زمانہ کے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔“

تنظیم و تقسیم میں حکومت کے اختیارات پر حد بندی نہیں ہے

قرآن حکیم نے جس طرح حکومت کی شکل و صورت متعین نہیں کی اسی طرح تنظیم و تقسیم میں
حکومت کے اختیارات پر بھی کوئی حد بندی نہیں قائم کی ہے بلکہ حالات و زمانہ کی رعایت سے عمومی اور کلی
انداز اختیار کیا ہے جس سے درج ذیل قسم کی وسعت کا ثبوت ملتا ہے:

۱۔ حکومت کا حق ہے کہ اسراف اور فضول خرچی سے بچانے اور عدل و اعتدال پیدا کرنے کے لیے
آمدنی و اخراجات کی ایک حد مقرر کر دے۔

فدولہ ان تستلهم لهذا التوجيه القرآن للحد من التبذير والامراف وحيل الناس على القصد والاعتدال
(دستور القرآن: ص ۱۰۱)

”قرآن نے اسراف و فضول خرچی سے روکا ہے اور لوگوں کو عدل و اعتدال کی زندگی پر ابھارا ہے،
حکومت کو حق ہے کہ ان توجیہات سے وہ حد بندی کا نتیجہ نکالے۔“

۲۔ سرمایہ کو پھیلانے اور مالداروں سے مال حاصل کرنے کے لیے مصالح عامہ کے پیش نظر حسب صوابدید
مختلف طریقے اختیار کرے۔

وتأخذ من الاغنياء ما تقتضيه الشؤون العامة ومصالح المسلمين من اموال لبخلف الاساليب
(ایضاً ص ۱۰۱)

”عام اور خاص مصالح کے پیش نظر مختلف طریقوں سے مال وصول کرے۔“

۳۔ زبردستی اسباب فروخت کرنے کا حکم نافذ کرے جیسا کہ علامہ ابن قیمؒ ایک حدیث سے استدلال
کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وصار اصلاقي جواز اخراج الشيء من ملك صاحبه قهراً ليشنه للمصلحة الراجحة (الطرق المحيية: ص ۲۰۹)
”بنا بر مصلحت عامہ کسی شخص کے قبضہ سے بذریعہ قیمت زبردستی اس کی چیز نکالنے کے بارے میں یہ
حدیث اصل ہے۔“

۴۔ ”بے خانواں اشخاص کو جبراً مکان دلوانے کی اجازت ہے، مزدور سے مناسب اجرت پر جبراً کام لینے کی
وسعت ہے“ (احمد: ص ۳۹۷)

ضرورت مند کے لیے ضروری اشیاء کی فراہمی صاحب استطاعت پر واجب ہے ویسے بھی اگر کسی کو مکان اور کپڑا وغیرہ کی سخت ضرورت ہو تو جس کے پاس موجود ہو دینا واجب ہے۔

وجہ علی صاحبہ بذلہ بلا نزاع

”بغیر نزاع کے اشیاء ضروریہ کا دینا واجب ہے۔ (الطرق الحمیہ: ص ۶۶۰)

”بعض محققین کے نزدیک ضروری اشیاء کا بغیر قیمت دینا واجب ہے، وہ اس صورت کو فویل للبصیدین کے تحت داخل کرتے ہیں۔“ (ایضاً)

۵۔ کھانا، کپڑا اور مکان وغیرہ یہ انسان کی ایسی ضرورتیں ہیں کہ جن میں سب مشترک ہیں اور ان کی فراہمی کے لیے حکومت ہر قسم کے قوانین نافذ کرنے کی مجاز ہے۔

وحاجة المسلبين الى الطعام واللباس وغير ذلك مصلحة عامة ليس الحق فيها لواحد بعينه (الطرق الحمیہ: ص ۲۶۲)

”کھانا، کپڑا وغیرہ کی ضرورت کا تعلق مصالح عامہ سے ہے اور بلا استثناء سب اس میں شریک ہیں۔“

اراضی میں حکومت کے اختیارات زیادہ وسیع ہیں

اراضی میں حکومت کے اختیارات زیادہ وسیع ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

لن ارقاب الارض (الاموال: ص ۲۷۹) ”زمین ہماری (حکومت کی) ہیں۔“

حضرت علیؓ نے ایک موقع پر فرمایا:

ان ارضك فلنا (احکام القرآن: ص ۵۳۲) ”تیری زمین ہماری ہے۔“

امام ابو حنیفہؒ کی یہ تصریح ہے:

ان نواحی دار الاسلام تحت ید امام المسلمین (المبوط: ج ۱ ص ۹۳)

”دار الاسلام کے اطراف امام المسلمین کے زیر اقتدار ہوتے ہیں۔“

”اس بنا پر احناف کا مسلک ہے کہ اگر حکومت مفاد عامہ کے پیش نظر زمین لینا چاہے تو صاحب زمین کی رضامندی ضروری ہے اور نہ معاوضہ ادا کرنا لازمی ہے۔ البتہ اس شخص کے بنیادی حقوق کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ وہ تلف نہ ہو جائیں۔“ (احکام القرآن: ج ۳، ص ۵۳۱ و ۵۳۳)

امام مالکؒ کا ارشاد ہے: تصدیر الارض للسلطان (الحلی: ج ۸) ”زمین بادشاہ (حکومت) کی ہوتی ہے۔“

ایک موقع پر علامہ عینیؒ کہتے ہیں: ان حکم الاراضی الامام (یعنی: ص ۲۹)

”زمین کا معاملہ امام (حکومت) کے سپرد ہے۔“

حکومت کو مفاد عامہ کے پیش نظر موقوفہ اراضی میں بھی واقف کی مقرر کردہ شرطوں کی مخالفت جائز ہے:

ان السلطان يجوز له مخالفة الشط اذا كان غالب جهات الوقف قری ومزارع فيعمل بامرہ وان غایر

شہ طالوقف لان اصلها لبیت المال (الدر المختار: ج ۱)

”جب وقف کی کثرت جہات گاؤں اور مزارع زمینیں ہوں تو بادشاہ (حکومت) اپنے صوابدید کے مطابق بندوبست کر لے اگرچہ واقف کی شرطوں کی مخالفت پائی جائے، کیونکہ گاؤں اور زمین دراصل بیت المال کی ہوتی ہیں۔“

غرض حکومت اپنے اختیارات میں کسی ایک طریق تنظیم و تقسیم کی پابند نہیں ہے بلکہ مفاد عامہ کے پیش نظر اس کے اختیارات کافی وسیع ہیں اور انفرادی و اجتماعی ہر طریق کی اجازت ہے، جیسا کہ قاضی ابویوسفؒ کہتے ہیں:

وار جوان یکون ذالک موسعا علیہ فکیف ماشاء من ذالک فعل (الخراج: ص ۵۶)

”مجھے امید ہے کہ حکومت جو بھی مناسب سمجھ کر کرے گی، اس کے لیے وسعت اور گنجائش ہے۔“

کفالت کے لحاظ سے حکومت کے اختیارات وسیع ہیں

ظاہر ہے کہ یہ سارے اختیارات اسی حکومت کے لیے ہیں جو خلق خدا کی کفالت کی ذمہ داری لیتی ہو۔

الہی شریعت میں حکومت کی ذمہ داریوں کے مطابق ہی اس کے اختیارات کی وسعت تسلیم کی گئی ہے۔ ذمہ داریوں کی وضاحت حضرت عمرؓ کے اس مثال سے ہوتی ہے:

انما مثلنا کمثل قوم سافروا فدفعوا نفقاتهم الى رجل منهم فقالوا له انفق فهل له ان يستأثر علیہم

بشیء قالوا لا (تاریخ عمر لابن ابوزی البواب: ص ۱۲۸)

”ہماری اور قوم کی مثال ایسی ہے جیسے لوگوں نے سفر کیا اور اپنے نفقات (سرمایہ حیات) اپنے میں سے کسی آدمی کے حوالے کر دیے اور کہا کہ ہمارے اوپر خرچ کرو! کیا ایسی صورت میں ان کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک روا ہو سکتا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا نہیں۔“

جس طرح حکومت کا فرض ہے کہ لوگوں کی حاجتوں اور ضرورتوں میں ان کی کفالت کرے اسی طرح اس کا حق ہے کہ لوگوں کے مقبوضہ اموال میں تصرفات کی وسعت ہو، جس طرح اللہ کے اوامر و نواہی کی پابند ہے اسی طرح خلق خدا کے مصالح کی نگہداشت کی بھی پابند ہے۔

فحق الله امره ونهيہ وحق العبد مصالحه (الفروق: ج ۱، ص ۱۱)

”اللہ کا حق اس کے اوامر و نواہی ہیں اور بندے کا حق اس کے مصالح ہیں۔“

مصالح میں دنیوی اور اخروی دونوں مصلحتیں شامل ہیں:

الاموال الذی یستقیم بہ فی اولاء و اخراء (تہذیب الفروق: ص ۱۲۰)

”وہ امور جن کے ذریعے دنیا اور آخرت میں استقامت پیدا ہو۔“

دنیوی مصالح بھی عبادت ہیں

شریعت نے دنیوی مصالح کو جو درجہ دیا ہے اس کی اہمیت کا اندازہ درج ذیل عبارت سے ہوتا ہے:

ان النفوس لاتقبل الحق الا بما يستعين به حظوظها التي هي محتاجة اليها فتكون تلك الحظوظ عبادة (الجوامع: ۶۱)

”دنیوی زندگی میں جن چیزوں کی احتیاج ہے اور جو مدد و معاون ہیں، ان کے بغیر لوگ حق کو نہیں قبول کرتے ہیں، اس بنا پر دنیوی حظوظ بھی عبادت میں شمار ہوں گے۔“

پھر آگے ہیں:

لان العبادات لاتؤدى الا بهذا وما لا يتم الواجب الا به فلهو واجب (ایضاً)

”کیونکہ عبادت ان کے بغیر پوری نہیں ہوتی ہے اور جس کے بغیر واجب کی ادائیگی نہ ہو، وہ بھی واجب ہے۔“

حکومت کی حیثیت نائب اور امین کی ہے

ہر ”اقدام“ میں حکومت کے پیش نظر یہ بنیاد رہنی ضروری ہے کہ خود اس کی حیثیت بھی مالک کی نہیں ہے، بلکہ نائب اور امین کی ہے۔

ولیس لولا الاموال ان يقسموها بحسب احوالهم كما يقسم المالك ملكه فانها هم امان و نواب (ایضاً)

”اموال کے منتظمین کے لیے جائز نہیں ہے کہ مالک کی طرح اپنی خواہشات کے مطابق اموال کو تقسیم کریں بلکہ وہ نائب اور امین ہیں، اپنی اس حیثیت کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں۔“

اب جب کہ مسلم معاشرہ میں لوگوں کے بنیادی حقوق تک پامال ہو رہے ہیں اور موجودہ نظم و نسق کے ذریعہ عدل و انصاف کے ساتھ اللہ کی مخلوق کو رزق حلال نہیں میسر ہو رہا ہے تو ایسی حالت میں شرعی لحاظ سے مسلم حکومت کا فرض ہے کہ اس پورے نظام کو بدل دے، حقوق ملکیت کے ہر گور کھ دھندے کو توڑ کر جس طرح بھی ممکن ہو اہل حقوق تک ان کے حقوق پہنچانے کا بندوبست کرے۔

مسلم حکومتوں اور مذہبی مسندوں کی غفلت

بد قسمتی سے حکومتیں ذاتی عیش و اقتدار برقرار رکھنے کے لیے تنظیم و تقسیم میں بنیادی تبدیلی کرنے کے لیے تیار ہیں اور نہ کسی تبدیلی سے دینی کار کو تقویت پہنچانا ان کے پیش نظر ہے، حالانکہ دینی راہ سے بنیادی

تبدیلی کرنے کے بعد موجودہ دور کے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔

ادھر مذہبی مسندوں اور خلافتوں کی حالت یہ ہے کہ لوگوں کے حقوق اور ان کی دنیوی ضرورتوں سے انہیں کوئی تعلق نہیں ہے اور اگر کسی قدر ہے تو بس زکوٰۃ و صدقات کا وصول تحصیل تک ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ کے الفاظ میں ان دونوں گروہوں کی راہیں فاسد ہیں:

وهذا السبيلان فاسدان السبيل من انتسب الى الدين ولم يكمله بهما يحتاج اليه من السلطان والجهاد والبال وسبيل من اقبل الى السلطان والبال والحرب ولم يقصد بذلك اقامة الدين هما

سبيل البغضوب عليهم والضالين (الجوامع: ص ۷۴۰)

”یہ دونوں راستے فاسد ہیں: (۱) ان لوگوں کا جو دین کی طرف منسوب ہیں لیکن قوت، جہاد اور مال سے جن کا دین خداوندی محتاج ہے دین کی تکمیل نہیں کرتے ہیں۔ (۲) دوسرا راستہ والیان حکومت کا ہے، جن کے پاس مال اور قوت موجود ہے لیکن ان کے ذریعہ اقامت دین کا کام نہیں لیتے ہیں۔ یہ دونوں راستے ان لوگوں کے ہیں جن پر غضب نازل ہوا یا گمراہ ہیں۔“

مالیات و حکومت کی طرح قرآن حکیم نے زندگی کے اور بہت سے مسائل و معاملات میں بھی اصولی اور عمومی انداز اختیار کیا ہے، شکل و صورت اور جزئیات کی تفصیل کو حالات و زمانہ کی رعایت پر چھوڑ دیا ہے، مثلاً حق اور محنت کی تنظیم، جنگ کی تیاری، معاملات و تعزیرات وغیرہ (جن کی نشان دہی کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔)

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی کوئی شکل متعین نہیں ہے

حتیٰ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے تنظیمی اور وجوبی حکم کی بھی شکل متعین نہیں کی ہے، جس کی بنا پر علماء کہتے ہیں:

ليس في القرآن تحديد لكيفية القيام بهذا الواجب وقد يتبادر من هذا ان الكيفية متروكة لحكمة

المسلمين وظروفهم (دستور القرآن)

”قرآن میں کیفیت کی تحدید نہیں ہے کہ کسی طرح اس واجب کی ادائیگی کی جائے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محض مسلمانوں کی مصلحت اور ان کے ظروف کی رعایت سے کیفیت کے بیان کو چھوڑا گیا ہے۔“

اس سلسلہ کی چند آیتیں

اس سلسلہ کی چند آیتیں یہ ہیں:

(۱) قرآن حکیم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ملی زندگی کا نصب العین ٹھہرایا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

(آل عمران: ۱۱۰)

”تم بہترین امت ہو کہ لوگوں کی ارشاد و اصلاح کے لیے ظہور میں آئی ہے۔ تم معروف کا حکم دینے والے، بُرائی سے روکنے والے اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو۔“

دوسری جگہ ہے: وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (آل عمران: ۱۰۴)

”ضروری ہے کہ تم میں ایک جماعت ایسی موجود ہو جو خیر کی طرف لوگوں کو دعوت دینے والی ہو اور معروف کا حکم دینے والی اور منکر سے روکنے والی ہو، ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔“

معروف و منکر کی تشریح

آیت میں ”دعوت الی الخیر“ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ امر بالمعروف کو علیحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں درج ذیل قسم کی چیزیں شامل کی جاتی ہیں:

کل هو متعارف علی انه صالح و خیر و نافع من اخلاق و عادات و اعمال تعود فائدتها و یرکتھا علی الافراد او المجموع و لیس فیھا جنف و لا بغی و لا افراط و تفریط (دستور القرآنی)

”ہر وہ کام و اخلاق و عادات جن کا فائدہ افراد یا سوسائٹی کو پہنچتا ہو اور ان میں ظلم و زیادتی اور افراط و تفریط نہ ہو بلکہ خیر و نافع ہونے میں متعارف ہوں۔“

قرآنی اصطلاح کے مطابق ”معروف“ میں صرف نماز و روزہ قسم کی عبادات ہی نہیں داخل ہیں، بلکہ یہ لفظ فرد و اجتماع کی جملہ ضرورتوں اور فائدہ پہنچانے والی تمام چیزوں کو شامل ہے، اسی طرح ”منکر“ میں صرف مشہور قسم کے بُرے کام نہیں داخل ہیں بلکہ اس میں ہر ضرر رساں چیز اور انسانی ضرورتوں سے گریز و فرار کی راہ بھی داخل ہے۔

شرعی نظم زندگی کی ایک حدیث سے وضاحت

الہی شریعت نے زندگی کا جو نظم قائم کیا ہے اور اس میں ایک دوسرے کی دینی و دنیوی ضرورتوں کی نگہداشت کو جس قدر ضروری قرار دیا ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ رسول اللہ ﷺ کی بیان کردہ درج ذیل مثال سے بخوبی ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا:

”فرض کرو ایک بحری جہاز ہے جس کے اوپر نیچے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور سب کی ضرورت کا سامان (پانی وغیرہ) جہاز کے بالائی حصہ پر رکھا ہوا ہے جس سے لوگ اپنی ضرورتیں پوری کرتے رہتے ہیں۔ نیچے

درجہ کے لوگ (مثلاً) پانی کے لیے اوپر آتے رہتے ہیں اور اوپر والے (جذبہ اشتراک کے تحت) پانی دیتے رہتے ہیں تو کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آتا بلکہ اطمینان کے ساتھ سب کا کام چلتا رہتا ہے۔ لیکن اگر اوپر والے پانی دینے سے انکار کرتے ہیں، تنہا اپنی ملکیت سمجھتے ہیں یا ان کی آمد و رفت سے معمولی تکلیف ناقابل برداشت ہوتی ہے تو وہ لوگ زیادہ دیر تک پیاس نہ برداشت کر سکیں گے، پانی کی فراہمی کے لیے دوسری تدبیریں کرنے پر مجبور ہوں گے۔ چار ناچار انہوں نے یہ سوچا کہ جہاز میں چھوٹا سوراخ کر کے سمندر سے تھوڑا پانی لے لیا جائے، چنانچہ وہ کرنے لگے۔

اب اگر اوپر والے نہ سوراخ کرنے سے روکیں اور نہ ان کے لیے پانی کا بندوبست کریں (ایسی حالت میں محض منع کرنے سے کام نہ چلے گا بلکہ پانی کا بندوبست ضروری ہوگا) تو ظاہر ہے جہاز میں سوراخ ہونے کے بعد اس میں پانی بھرے گا اور وہ ڈوب جائے گا، پھر نہ سوراخ کرنے والے بچیں گے اور نہ اس سے غفلت و چشم پوشی کرنے والے۔“

یہ حدیث زندگی کی نفسیات اور اس کے مطالبات کو سمجھنے کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے، زندگی کو سمندری جہاز پر سواری کے ساتھ تشبیہ دینا، اس کی ضروریات کو پانی جیسی اہم چیز کے ساتھ بیان کرنا۔ تکلیف کے باوجود تعاون و اشتراک کو ملحوظ رکھنا اور خلاف ورزی کی صورت میں جہاز میں سوراخ ہونا اور اس کے نتیجے میں جہاز ڈوب جانا وغیرہ یہ ساری باتیں نہایت غور و فکر کی مستحق ہیں۔ ایک اور موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ

”خوب غور سے سن لو! ہر شخص تم میں سے راعی ہے اور ہر شخص سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی۔“

کلام عرب میں ”راعی“ کے یہ معنی ہیں: حفظ الغیر لمصلحتہ (المنجد)

”دوسرے کی حفاظت اس کی مصلحت کے مطابق کرنا۔“

اس بنا پر ”راعی“ کے لیے دینی اور دنیوی دونوں قسم کی مصلحتوں کا لحاظ ضروری ہوگا۔

معاشی حالات کے دباؤ کی شدت

بسا اوقات انسان پر معاشی حالات کا دباؤ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ جب تک اس کا لحاظ نہ کیا جائے، تبلیغ و تلقین کی بات بے معنی رہتی ہے اور اگر بات مان بھی لی جاتی ہے تو اس کو قرار و استحکام نہیں حاصل ہوتا۔

قرآن حکیم نے درج ذیل انداز میں اس پہلو کو واضح کیا ہے: فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۚ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۚ فَكَّ رَقَبَةً ۚ أَوْ اطَّعِمَ فِي يَوْمٍ مِّنْ ذِي مَسْغَبَةٍ ۖ

يَتِيْبًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مَسْكِيْنًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ (البقرہ: ۱۷۷)

”پر وہ گھاٹی سے نہ گزرا۔ اے پیغمبر! آپ کو معلوم ہے کہ گھاٹی عبور کرنے سے کیا مراد ہے؟ یہ ہے کہ کسی کی گردن کا پھند چھڑانا، بھوکے قربات دار یتیم اور خاک آلودہ مسکین کو کھلانا، پھر وہ ان لوگوں سے ہو جو ایمان لائے ہوں اور ایک دوسرے کو صبر اور رحم کی تلقین کی ہوں۔“

آیات میں پہلے عملی ہمدردی و غم خواری کی شکلوں کو ”گھاٹی“ سے تشبیہ دی گئی ہے، کہ اس سے عبور کرنے کے لیے نفس کشی کی زیادہ ضرورت ہوتی اور صالحین و مبلغین کو ادھر توجہ دیے بغیر چارہ نہیں ہوتا ہے پھر اس کے بعد ایمان اور صبر و رحم کی تلقین کا تذکرہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات دینوی مصاح کا لحاظ کرنے سے پہلے محض زبانی تبلیغ و تلقین نتیجہ خیز نہیں ثابت ہوتی بلکہ حالات کا دباؤ پل بھر میں پوری عمارت ڈھا سکتا ہے۔

قرآن حکیم میں دوسری جگہ ایسے نمازیوں کے لیے سخت قسم کی دھمکی ہے جن پر نماز کے اثرات نہیں مرتب ہوتیں، جو ریاء و نمائش کرتے اور دوسروں کی دنیوی ضرورتوں کا لحاظ نہیں کرتے ہیں۔

فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُزْأَوْنَ ۝ وَيَمْنَعُوْنَ ۝ الْمَاعُوْنَ ۝ (الماعون: ۳-۷)

”ایسے نمازیوں کے لیے بڑی خرابی ہے جو اپنی نمازوں کو بھلا بیٹھتے ہیں، ریاء کاری کرتے اور ضروریات میں حقوق کی ادائیگی نہیں کرتے ہیں۔“

اسی طرح بہت سی آیتوں میں خیر و بھلائی کی ترغیب ہے اور غرباء و فقراء کو برسر کار لگانے کی تلقین ہے، جس کی بنا پر علما کہتے ہیں:

ان على المسلمين كافة افراد و جماعه كل في نطاق قدرته و امكانه ان يقوموا بواجب الامر بالمعروف والنهي عن المنكر والتضامن فيه حسب الحكمة والصلحة

”ہر مسلمان پر فرداً فرداً اور جماعتی حیثیت سے اپنے امکان بھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کی ادائیگی لازمی ہے اور اس ادائیگی میں ایک دوسرے کے احوال کی ضمانت و نگرانی کی صورت ہونی چاہئے نیز حکمت و مصلحت کے پیش نظر طریق کار اختیار کرنا چاہیئے۔“

غرض قرآن حکیم میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کوئی خاص شکل و صورت اور طریق کار متعین ہے اور نہ یہ حکم زندگی کے کسی ایک گوشہ تک محدود ہے، بلکہ حالات و زمانہ اور ضرورت کے لحاظ سے اس کی مختلف شکلیں اور مختلف راہیں ہیں۔

شریعت کا جادہ اعتدال

الہی شریعت میں جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں توازن و ہم آہنگی برقرار رہے، ورنہ افراط و تفریط کی صورت میں ایک طرف غلو اور تقشف کی زندگی نمودار ہوگی تو دوسری طرف آزادی و بے راہ روی کی زندگی کو فروغ حاصل ہو گا اور یہ دونوں راہیں شریعت کے جادہ اعتدال سے ہٹتی ہوئی ہیں۔

مسلم قوم کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ اس سے عدل و توازن رخصت ہو گیا ہے، ایک طرف دین اور دنیا کی تقسیم نے اسلام کو دوسرے مذہبوں سے مشابہ بنا دیا ہے اور دوسری طرف جماعت سازی و گروہ بندی نے اس زعم فاسد میں مبتلا کر دیا ہے کہ حق وہی ہے جو وہ کہتا ہے، کام وہی ہے جو وہ کرتا ہے، صالح وہی ہے جو اس کی جماعت میں ہے اور داعی وہی ہے جو اس جیسی بات کرتا ہے، قرآن حکیم نے اس ذہنیت کو درج ذیل آیت میں بیان کیا ہے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَنُصْرِيَ عَلَى شَيْءٍ. وَقَالَتِ النَّصْرَى لَنُصْرِيَ الْيَهُودَ عَلَى شَيْءٍ. وَهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتَابَ. كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ (البقرہ: ۱۱۳)

”یہود کہتے ہیں: عیسائیوں کے پاس کچھ نہیں ہے، عیسائی کہتے ہیں: یہودیوں کے پاس کیا رکھا ہے؟ حالانکہ اللہ کی کتاب دونوں پڑھتے ہیں۔ ٹھیک یہی بات مشرکین عرب بھی کہتے ہیں جن کے پاس علم نہیں ہے۔“

یہی وجہ ہے کہ کوئی گروہ معمولی تنقید برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور حق پر ثبات اور تقلیدی جمود میں کوئی فرق نہیں رہ گیا ہے۔

غرض جب تک یہ ذہنیت نہ بدلے گی، فکر و نظر میں وسعت نہ ہوگی اور دین کے نام پر ملت کی دنیوی ضرورتیں پوری نہ ہوں گی، اس وقت تک دینی انقلاب کی توقع بے سود ہے، صرف معمولی اصلاحات اپنے اپنے دائرہ میں ہوتی رہیں گی جو لادینیت کا معمولی جھوٹا بھی برداشت کرنے کی تاب نہ لاسکیں گی۔

معاشی مسئلہ کا اسلامی حل

سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلزم کے حالیہ جدید نظاموں سے قبل اسلام نے بھی انسان کے معاشی مسئلہ کا حل دیا ہے۔ یہ حل وہ نسخہ کیمیاء ہے جو اللہ کریم نے اپنے حبیب کریم ﷺ پر نازل فرمایا۔ کسی انسانی ذہن کی اچھیا اختراع نہیں بلکہ وحی الہی کی روشنی میں تجویز شدہ ایک نسخہ ہے، جس کے استعمال سے انسان کے معاشی مسئلہ کا علاج فطرتی اصولوں کے مطابق ہو جاتا ہے۔ اس حل کی بنیاد اسلام نے مندرجہ ذیل اصولوں پر رکھی ہے:

۱۔ بنیادی ضروریات زندگی سے تعلق رکھنے والی اشیاء اور ذرائع کسی فرد یا کسی مخصوص جماعت کی نجی ملکیت نہیں بن سکتے بلکہ وہ تمام انسانوں کی مشترکہ جائیداد ہیں اور ہر انسان کو حق حاصل ہے کہ وہ ان اشیاء یا ذرائع سے ضروریات کے مطابق جس وقت چاہے، جتنا چاہے نفع حاصل کر کے اپنی حاجات کی تسکین کرے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی ایک حدیث مبارکہ میں ان مشترکہ اشیاء کے بیان میں فرمادیا ہے:

الناس شراکاء فی ثلاث: الماء والكلاء والنار

”تمام انسان تین اشیاء میں برابر کے شریک ہیں۔ وہ اشیاء یہ ہیں: آگ، سبزہ، پانی۔“

بظاہر اس حدیث مبارکہ میں بیان کردہ اشیاء یعنی آگ، گھاس اور پانی بڑی معمولی سی اشیاء معلوم ہوتی ہیں، مگر ان اشیاء کا دائرہ کار اور احاطہ کا اندازہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تقریباً ان تمام اشیاء کو شامل ہیں جن کا تعلق انسان کی بنیادی ضروریات زندگی سے ہے۔ چند اہم امور قابل توجہ ہیں:

۱۔ آگ:

آگ سے مراد صرف وہ آگ ہی نہیں جسے روشن کر کے انسان تاپتا ہے اور اپنی سردی دور کرتا یا کھانا پکا کر کھاتا ہے یا پانی گرم کر کے نہاتا ہے، بلکہ اس کے علاوہ اس سے مراد توانائی اور حرارت کے تمام ذرائع بھی ہیں۔ اس میں شمسی توانائی، ایٹمی توانائی، کھربا (بجلی)، سوئی گیس، تیل، ڈیزل اور ایندھن وغیرہ، الغرض وہ تمام ذرائع شامل ہیں جن سے انسان حرارت یا آگ حاصل کرتا ہے۔ چونکہ آگ کا تعلق بنیادی ضروریات زندگی سے ہے، لہذا آگ اور ذرائع آگ کا کوئی فرد یا مخصوص گروہ اجارہ دار یا مالک نہیں بن سکتا۔

۲۔ سبزہ:

سبزہ جنگل کی ہمہ قسم کی گھاس، جڑی بوٹیاں اور درختوں کو شامل ہے۔ اس کی مد میں جنگلات کی تمام

لکڑیاں برائے ایندھن و تعمیر بھی شامل ہیں۔ سبزہ انسانوں اور مویشی کی براہ راست غذا بھی ہے۔ (مثلاً سبزیات، ساگ وغیرہ) جنگل سے لکڑی اور گھاس کاٹ کر اور بازار میں فروخت کر کے انسان اپنی ضروریات زندگی آج بھی کما رہا ہے۔ کیونکہ لکڑی اور گھاس جنگل میں مفت شے (Free Good) ہے، مگر بازار میں آکر وہ معاشی شے (Economic Good) بن جاتی ہے، جس کی قیمت وصول ہوتی ہے اور اس قیمت سے دیگر اشیاء ضرورت خریدی جاسکتی ہیں۔ اس لحاظ سے سبزہ ایک معاشی ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔ سبزہ جنگل کے شکار کو بھی شامل ہے اور شکار انسانوں کا شروع ہی سے ایک قابل اعتماد ذریعہ معاش رہا ہے۔

۳۔ پانی:

پانی سے مراد یہاں صرف پینے کا پانی ہی نہیں بلکہ اس حدیث میں پانی تمام پانیوں (نہروں، جھیلوں، دریاؤں اور سمندروں کے پانی) اور پانی کے تمام قسم کے شکار اور ان کے اندر قیمتی معدنیات کے لئے آیا ہے۔ پانی کا شکار مچھلی آج بھی لاکھوں انسانوں کا ذریعہ معاش ہے اور اسے روز بروز وسعت ہو رہی ہے۔ اور تمام ممالک پانی کی دولت سے مالا مال ہیں۔ انہوں نے اسے ترقی یافتہ بنیادوں پر چلانے کا پروگرام بنایا ہے اور اپنے اپنے ملک میں محکمہ ماہی پروری قائم کر رکھے ہیں۔ دنیا میں بعض ممالک ایسے ہیں (مثلاً بنگلہ دیش، تھائی لینڈ، جاپان، کوریا، انڈونیشیا اور سری لنکا وغیرہ) جہاں لوگوں کی روزانہ کی خوراک میں مچھلی شامل ہے۔ مچھلی بازار میں فروخت کر کے اس سے روپیہ حاصل کیا جاسکتا ہے، جس سے دوسری اشیاء ضرورت و سہولت خریدی جاسکتی ہیں، گویا پانی کا شکار، خوراک اور تجارت دونوں ہیں۔

پھر پانی ذریعہ آبپاشی ہے، جس سے کھیتوں کی سیرابی ہوتی ہے۔ انسان اور حیوانات اسے پیتے ہیں۔ پانی تو اصل حیات ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (الانبیاء: ۳۰)

”اور پانی سے ہم نے چیزوں کو زندگی بخشی۔“

یہ تینوں اشیاء کسی فرد یا کسی جماعت کی ملکیت نہیں بلکہ پوری انسانیت کی ملکیت ہیں، البتہ کسی ملک یا علاقہ کی حکومت صرف ان کے استعمال کو تمام انسانوں کے لئے ممکن بنانے کیلئے ان کی نگرانی کے فرائض انجام دے سکتی ہے۔ یہ نگرانی مفت بھی ہو سکتی ہے اور معمولی حق خدمت (ٹیکس) وصول کر کے بھی کر سکتی ہے، لیکن ان کے استعمال سے کسی انسان کو روکا جائے گا تو اس کے لئے معاشی مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ کسی فرد یا مخصوص جماعت کو یہ اجازت نہیں کہ وہ دولت اور ذرائع دولت کے مالک بن بیٹھیں۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (الحشر: ۷)

”ایسا نہ ہو کہ دولت تمہارے امراء کے درمیان گردش کرتی رہے۔“

اسلام نے انسان کو درس دیا ہے کہ دراصل مال، دولت اور ذرائع دولت کا مالک حقیقی اللہ کریم کی ذات کریم ہے۔

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى (طہ: ۶)

”اس اللہ کریم کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان (یعنی فضاء میں) ہے اور وہ بھی جو کچھ گیلی مٹی کے نیچے ہے۔“

اور یہ دولت اللہ کریم نے اپنے محتاج بندوں کو ان کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے عنایت فرمائی ہے۔ لہذا کوئی شخص یا مخصوص جماعت اس کی تنہا مالک نہیں اور وہ لوگ جو اپنی حلال محنت سے دولت کماتے ہیں، انہیں بھی سلطان کریم نے یہ سکھایا ہے کہ وہ اپنی کمائی ہوئی دولت کے مالک نہیں بلکہ امین اور نگران (Trustees & Custodians) ہیں اور انہیں یہ دولت اس طرح خرچ کرنے کو کہا گیا جس طرح اللہ کریم نے استعمال کرنے کا حکم دیا اور اس کے نبی کریم ﷺ نے طریقہ تعلیم فرمایا ہے۔

وَأَنْفَقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلِفِينَ فِيهِ (الحمد: ۷)

”اور اس مال میں سے خرچ کرو جو تمہارے قبضہ میں دیا گیا ہے تمہیں نائب بنا کر۔“
انہیں تعلیم کیا گیا ہے کہ دولت سے اپنی ضروریات زندگی پوری کریں اور جو باقی بچ جائے، بہتر ہے سارے کا سارا اللہ کریم کی رضا کی خاطر اس کے محتاج بندوں کو دے دیا جائے۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْغَفْوُ (البقرہ: ۲۱۹)

”وہ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ بتادیجئے! جو ضرورت سے زائد ہو۔“
اگر اتنا نہ کر سکیں تو کم از کم درجہ یہ ہے کہ اپنے مال میں سے فقراء و مساکین کے وہ تمام مالی حقوق ادا کریں جو اللہ کریم نے ان کے مال میں رکھے ہیں۔

فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلَّذِيْنَ سَأَلُوْهُمِ الْبَحْرُومِ (المعارج: ۲۵۲-۲۵۳)

”ان کے مالوں میں ایک مقرر حصہ ہے مانگنے والوں اور ہارے ہوئے (یعنی معاشی دوڑ میں پیچھے رہنے والوں) کا۔“

یہ مالی حقوق اس قدر کافی و وافی ہیں کہ ان کی ادائیگی سے اور فقراء تک ان کی رسائی کے بعد کوئی محتاج محروم المعیشت نہیں رہ سکتا۔ یہ مالی حقوق مندرجہ ذیل قسم کے ہوتے ہیں:

۱۔ صدقات واجبہ:

صدقات، صدقہ کی جمع ہے۔ صدقات واجبہ میں زکوٰۃ، عشرہ اور صدقہ فطر شامل ہیں۔

زکوٰۃ ہر صاحب مال۔ جس کا مال بقدر نصاب ہو۔ پر سال گزرنے کے بعد فرض ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم، پچگانہ نماز فرض کے ساتھ دیا ہے، گویا نماز کے بعد زکوٰۃ کی دینی اہمیت اور فرضیت ہے۔ مثلاً

وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ (البقرہ: ۱۱۰)

”اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔“

زکوٰۃ کی مقدار بعض صورتوں میں اڈھائی فیصد (مثلاً، سونا، چاندی اور نقد اگر بقدر نصاب ہوں)، بعض صورتوں میں ۵ فیصد (مثلاً دھن، خربزہ یا معادن کی زکوٰۃ)، بعض صورتوں میں ۱۰ فیصد (یعنی نہری عشری زمینوں کی پیداوار کا عشر)، بعض صورتوں میں ۲۰ فیصد (یعنی بارانی زمینوں کی پیداوار کا عشر) ہوتی ہے۔ اس طرح حیوانات پر زکوٰۃ ہے۔ مثلاً اونٹ ۵ یا ۵ سے زیادہ ہوں۔ گائے، بھینس ۳ یا ۳ سے زیادہ ہوں۔ بھیڑ بکریاں ۴ یا ۴ سے زیادہ ہوں۔ تو ان پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔[▲]

اس زکوٰۃ واجبہ کی ادائیگی سے کوئی فرد یا جماعت مسلمان ہو کر بھی انکار کرے تو اسلامی ریاست کے حاکم وقت کو ان سے لڑ کر بھی زکوٰۃ وصول کرنے کا اختیار ہے۔ جیسا حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کیا تھا۔ اس کی سند نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

امرت ان اقاتل الناس حتی يشهدوا ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله ويسيروا الصلوة ويؤتوا الزكوة فاذا فعلوا ذلك عصوا مني دماءهم واموالهم الا بحق الاسلام وحسابهم على الله (متفق عليه، کتاب الزکاة)
”مجھے لوگوں کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ یہ شہادت دیں کہ اللہ کریم کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ نبی کریم ﷺ اللہ کے رسول کریم ہیں اور وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں۔ جب وہ یہ کام کر لیں تو اپنے خون اور اپنے مالوں کو میرے سے محفوظ کرالیں گے۔ البتہ اسلام کے خاطر ان سے لیا جاسکتا ہے اور ان کا معاملہ اللہ کریم کے سپرد ہو گا۔“

نبی کریم ﷺ نے زکوٰۃ کا مقصد ہی محتاجوں کا معاشی مسئلہ حل کرنا فرمایا ہے۔ جب آپ ﷺ حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیج رہے تھے تو انہیں زکوٰۃ کا مقصد اس طرح فرمایا:

ان الله افترض عليهم صدقة تؤخذ من اغنيائهم وترد على فقرائهم (نحوالہ بالا)

”یقیناً اللہ کریم نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے محتاجوں کو لوٹادی جائے گی۔“

▲ تفصیل کے لئے کتب فقہ کے باب زکوٰۃ کا مطالعہ کریں اردو میں میری حقیر کتاب ”اسلام کا نظام حاصل“ مطبوعہ دیال سنگھ لاہور کا مطالعہ انشاء اللہ مفید ہو گا۔

اسی طرح صاحب استطاعت مسلمانوں پر فرض کیا کہ وہ عید الفطر کے روز عید ادا کرنے سے قبل اپنے محتاج بھائیوں کو صدقہ فطر دے کر ان کی مالی امداد کریں اور انہیں بھی عید کی خوشیوں میں شریک کر لیں۔

نفقات:

نفقات، نفقة کی جمع ہے جس کے معنی ہیں معاشی کفالت (Maintenance)۔ اسلام نے بعض اغنیاء اور معاشی جدوجہد کے قابل افراد پر لازم کر دیا ہے کہ وہ ایسے افراد کی کفالت کریں جو کمانے کے اہل نہیں ہیں یا انہیں کمانے کے مواقع میسر نہیں ہیں۔ مثلاً والدین اپنے نابالغ بچوں کی کفالت کے ذمہ دار ہیں اور بالغ اور کماد اولاد پر اپنے بوڑھے والدین کی کفالت کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح دیگر رشتہ داروں کے درجہ بدرجہ حقوق کفالت ہیں حتیٰ کہ اس طرح نفقات کا دائرہ اپنے پھیلاؤ میں سوسائٹی کے تمام افراد کو شامل کر لیتا ہے۔ اس کی مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

کفارات:

کفارات، کفارة (Expiation) کی جمع ہے۔ اسلام نے بعض مخصوص حصہ (جو ہر گناہ کے لئے الگ ہے، جسے کفارہ کہتے ہیں) اللہ کریم کے محتاج بندوں کی معاشی کفالت کے لئے خرچ کرنا بتایا ہے۔ مثلاً:

۱۔ جو خاوند ظہار کرے یعنی اپنی بیوی کو اپنی والدہ یا بہن کی طرح کہہ کر اپنے لئے حرام کرے پھر رجوع کرے تو اس کو کفارہ دینا پڑتا ہے۔ (البقرہ: ۲۳۳)

۲۔ جو شخص قسم کھا کر توڑ دے۔ (المائدہ: ۴۹)

۳۔ جو شخص حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھے اور پھر حالت احرام میں شکر کرے۔ (المائدہ: ۹۵)

۴۔ اگر حاجی قربانی کرنے سے پہلے اپنا سر منڈوالے۔ (البقرہ: ۱۹۶)

مذکورہ بالا تمام اشخاص کو مسکینوں کو کھانا یا کپڑے پہنانا پڑتا ہے یا غلام آزاد کرنا ہوتا ہے اور روزے رکھنا پڑتے ہیں۔

۵۔ اسی طرح جس مسلمان نے کسی نیک کام کے لئے نذر یا منت مانی ہے اسے پورا کرنا ہوگا یعنی فقراء و مساکین کو اپنے مال میں نذر کردہ حصہ نکال کر دینا ہوگا۔ (البقرہ: ۲۷۰)

۶۔ اگر کسی مسلمان نے وصیت کی ہے کہ اس کی موت کے بعد اس کی جائیداد کا ایک حصہ (جو ایک تھائی حصہ سے زائد نہ ہو) کسی مخصوص فرد یا فقراء کو دینا ہے، تو اس کے ورثاء پر لازم آتا ہے کہ وہ یہ وصیت ضرور پوری کریں اور یہ بھی محتاجوں کی معاشی کفالت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ (النساء: ۱۲)

آپ نے ان تمام مالی واجبات سے اندازہ لگایا ہوگا کہ یہ دولت کو معاشرہ میں گردش دینے کے آلات

کا کام دیتے ہیں اور یوں دولت کو چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جانے سے بچاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک دولت گردش میں رہے گی، معاشرہ کے تمام افراد کا معاشی مسئلہ حل ہوتا رہے گا اور جب دولت کی گردش رک جائے گی تو افراد کا معاشی مسئلہ بھی سر اٹھائے گا۔

اسلام کے مجوزہ معاشی مسئلہ کے حل نے ان تمام رکاوٹوں کو حرام قرار دے دیا جو گردش دولت کی راہ میں رکاوٹ بنیں یا افراد معاشرہ کی معاشی ضروریات کو طبعی طریقہ سے پورا ہونے کی راہ کا پتھر بنیں۔ مثلاً سود، اشیاء ضرورت کی ذخیرہ اندوزی (Hoarding of Necessities of life)، اکتناز دولت (Concentration of wealth)، مزدوروں اور غریبوں کا معاشی استحصال۔

انسان کے معاشی مسئلہ کے حل کی تین مجوزہ اسلامی صورتیں

اسلام نے فرد کے معاشی مسئلے کے حل کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ وہ خود اسے کسی بھی صورت میں حل کئے بغیر نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اس سلسلہ میں اسلام نے تین صورتیں تجویز کی ہیں اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان تینوں میں سے ضرور کسی ایک کے ذریعے معاشی مسئلہ حل ہونا چاہیے۔ ان تینوں صورتوں کا تعارف یہاں کرایا جاتا ہے۔

۱۔ پہلی صورت: فرد معاشی مسئلہ کے حل کا خود ذمہ دار ہے

اسلام نے فرد کو تاکید کی ہے کہ اگر وہ بالغ، عاقل اور صحت مند ہے تو خود محنت کر کے اپنے سلطان کریم کے خزانوں میں سے رزق حاصل کر کے کھائے اور اپنا معاشی مسئلہ حل کئے بغیر نہ چھوڑے۔ اس سلسلہ میں فرد کو کیوں، کیا، اور کس طرح کرنا چاہیے؟ اس کے متعلق تمام تعلیمات فرد کو دی گئی ہیں۔ چند نظائر قابل توجہ ہیں:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ (الحجۃ: ۱۰)

”پھر جب نماز تمام ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کریم کے رزق میں سے تلاش کرو۔“

نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

عن ابن ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ علیہ وسلم: ان من الذنوب ذنوب لا تکفر حاصلۃ ولا

الصیام ولا الحج ولا العبرۃ، قالو فبایکفر ہا یا رسول اللہ! قال الہم فی طلب البعیثۃ

(البیہقی، مجمع الزوائد ج ۳ باب الکسب والتجارۃ)

”حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بیہشتی گناہوں میں بعض گناہ ایسے ہیں جن کی بخشش نہ نماز سے، نہ روزہ سے، نہ حج سے اور نہ ہی عمرہ سے ہوتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اے اللہ کریم کے رسول کریم! پھر انہیں کیا عمل بخشواتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: رزق کی طلب میں غم

و فکر کرنا۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا:

طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة (البیہقی فی شعب الایمان)

”حلال معیشت کا طلب کرنا، اللہ کریم کے فریضہ عبادت کے بعد (سب سے بڑا) فریضہ ہے۔“

۲۔ دوسری صورت: فرد کی کفالت کا معاشرہ ذمہ دار ہے

اللہ کریم نہ کرے! اگر کوئی فرد معذور ہے یا نابالغ یتیم ہے یا بیوہ ہے اور اپنی معاش کا بندوبست کرنے سے قاصر ہے تو اسلامی معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ اس فرد کی معاشی کفالت کر کے اس کا معاشی مسئلہ حل کرے اور اگر مسلم معاشرہ ایسا نہیں کرتا تو وہ گناہ گار ہو گا۔ اس لئے اسلام نے امت مسلمہ کو نفقات (Maintenance) کا ایک مکمل نظام دیا ہے، جس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے معذور کی کفالت کے لئے اس کے والدین، اولاد، بہن بھائی، قریبی رشتہ دار اور پھر مسلم معاشرہ کا نمبر آتا ہے۔ اس باب میں مندرجہ ذیل نظائر قابل توجہ ہیں:

۱۔ ان الله يوصيكم بامهاتكم (ثلاثاً)۔ ان الله يوصيكم بابائكم۔ ان الله يوصيكم بالاقرب فالاقرب

(سنن ابن ماجہ ۲ باب الادب)

”یقیناً اللہ کریم تمہاری ماؤں کی کفالت کا تمہیں حکم دیتا ہے (تین بار فرمایا)۔ یقیناً اللہ کریم تمہیں تمہارے باپوں کی کفالت کا حکم دیتا ہے، یقیناً اللہ کریم تمہیں تمہارے قریبی رشتہ داروں اور پھر بعد کے قریبی رشتہ داروں کی کفالت کا حکم دیتا ہے۔“

اس حدیث میں واضح طور پر والدین اور اپنے رشتہ داروں کی معاشی کفالت کا حکم موجود ہے۔

۲۔ ليس المؤمن من الذي يشبع وجاراه جائع (البیہقی فی شعب الایمان)

”مومن وہ نہیں جو خود تو پیٹ بھرا ہو اور اس کا ہمسایہ بھوکا ہو۔“

۳۔ الساعی علی الارملة والمسكين کالمجاهد فی سبیل اللہ والقائم اللیل او الصائم النهار

(بخاری، کتاب النفقات)

”بیوہ اور مسکین کی کفالت کی جدوجہد کرنے والا ثواب میں اس مجاہد کی طرح ہے جو اللہ کریم کی راہ میں جہاد کرنے والا ہو یا اس شخص کی طرح ہے جو رات بھر عبادت کرنے والا اور دن کو روزہ رکھنے والا ہو۔“

۴۔ أيم أهل عرصة أصبح فيهم امرأة جائع فقد برئت منهم ذمة الله تبارك وتعالى

(مند احمد بن حنبل، نشر کردہ احمد محمد شاہر، حدیث نمبر ۴۸۸)

”کسی بستی میں اگر کوئی شخص اس حال میں صبح کرے کہ (رات بھر) بھوکا رہا ہو پھر اللہ کریم پر اس بستی کے بقاء و تحفظ کی کوئی ذمہ داری نہیں رہتی۔“

۳۔ تیسری صورت: فرد کے معاشی مسئلہ کا حل اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے

اگر کچھ افراد ایسے ہوں۔ اور ان کی تعداد نہایت قلیل ہوگی۔ جو نہ اپنا معاش خود حل کر سکتے ہیں، نہ ان کا خاندان اور مسلم معاشرہ ان کی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے تو پھر اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے افراد کا معاشی مسئلہ حل کرے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی متعدد احادیث میں اسلامی ریاست کے اس فریضہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چند احادیث یہاں نقل کرنے کی ہم سعادت پارہے ہیں۔

۱۔ الامام راع ومسئول عن رعيته (متفق علیہ، ریاض الصالحین، باب امرو لامة بالرفق برعاياهم ونصيحتهم بحوالہ بخاری و مسلم)

”امیر نگران ہے اور اپنے رعایا کے بارے میں جواب دہ ہو گا۔“

۲۔ عن ابی یعلیٰ معقل بن یسار قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: مامن عبد يسترعي الله رعية

فلم يحطها بنصحهم لم يجد راحة الجنة (بخوالہ بالا)

”حضرت ابو یعلیٰ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: جس کسی بندہ کے ذمہ اللہ کریم کسی رعایا کی نگہداشت کا کام لگا دے لیکن وہ خیر خواہی کے جذبہ سے ان کی دیکھ بھال نہ کرے تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پاسکے گا۔“

۳۔ مامن امير يلى امور المسلمين ثم لم يجتهد لهم وينصح لهم الا لم يدخل معهم الجنة (بخوالہ بالا)

”جو امیر مسلمانوں کے معاملات کی ذمہ داری قبول کرے پھر ان کی بہتری کے لئے کوشش نہ کرے، نہ ان کی خیر خواہی چاہے، وہ ان کے ساتھ ہر گز جنت میں داخل نہ ہو گا۔“

۴۔ عن ابی مریم الازدی انه قال لمعاوية سمعت رسول الله ﷺ يقول: من ولاه الله شيئاً من امور

المسلمين فاحتجب دون حاجتهم وختلتهم وفقهم احتجب الله دون حاجته وختلته وفقه يوم القيامة

فجعل معاوية رجلاً على حوائج الناس (حوالہ بالا)

”حضرت ابو مریم ازدی نے حضرت معاویہؓ سے آکر عرض کیا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس آدمی کے سپرد اللہ کریم مسلمانوں کے معاملات میں سے کوئی معاملہ فرمادے پھر وہ ان (مسلمانوں) کی حاجت، تنگی اور فقر اور اپنے درمیان حجاب کر دے (یعنی لوگ اپنے مسائل لے کر سیدھا اس کے پاس نہ پہنچ سکیں یا وہ ان کی طرف توجہ نہ دے) تو اللہ کریم بھی قیامت کے دن اس کی حاجت، تنگی اور فقر سے پردہ فرمالیں گے۔ (یہ سن کر) حضرت معاویہؓ نے ایک آدمی صرف لوگوں کی حاجات پوری کرنے کے لئے مقرر کر دیا۔“

حضرت عمرؓ کا ارشاد اس بارے میں قابل توجہ ہے، فرماتے ہیں:

”اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دوسرے لوگ بھوکے ہوں تو اس کا ایک ہی مطلب ہو گا کہ میں

عوام کا اچھا نگران نہیں ہوں۔“ (بحوالہ مولانا حامد انصاری غازی: اسلام کا نظام حکومت۔ ندوۃ المصنفین)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کی وفات کے بعد فقہاء کی ایک جماعت نے ان کی زوجہ محترمہ حضرت فاطمہؓ سے اگر تعزیت کی اور ان کے باوقار خاوند کے حالات سننا چاہے۔ کیونکہ بیوی سے بہتر خاوند کے حالات کون جانتا ہے۔ حضرت فاطمہؓ نے اپنے خاوند حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کا جو حال بیان کیا، وہ اسلامی ریاست کے سربراہ کا اپنی رعیت کی معاشی کفالت اور ان کے معاشی مسئلہ کے حل کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ پڑھیے:

واللہ ماکان باکثر کم صلاة ولا صیاما ولكن والله ما رأيت عبدًا لله ماکان اشد خوفًا لله من عمر، کان قد فرغ بدنه ونفسه للناس وکان يقعد بحوائجهم یومه، فاذا امسى وبقيۃ من حوائجهم وصله بلیلة۔ فامسى یومًا قد فرغ من حوائجهم فدعا ببصباح قد کان یستصبح به من ماله، ثم صلی رکعتین، ثم اقمی واضاعیدیه تحت ذقنه، تسلیل دموعه علی خدیہ، فلم یزل کذا لک حتی بزغ له الفجر فاصبح صائبا فقلت یا امیر البومنین! لشیء ماکان منک ما رأیت اللیلة قال اجل انی وجدتنی قد ولیت امر هذه الامة، اسودها واحمرها، فذکرت الغریب القانع والفقیر المحتاج والفقیر البقعود واشباههم فی اطراف الارض فعلبت ان الله سائلهم وان محمداً ﷺ حییجی فیهم، فخنفت ان لا یشیت لی عند الله عذرا ولا یقوم لی مع محمد ﷺ حجة فرحت علی نفسی فبکت

”اللہ کریم کی قسم! وہ تم میں سے کسی سے بھی زیادہ نماز پڑھنے والے اور روزہ رکھنے والے نہ تھے، لیکن اللہ کریم کی قسم! میں نے اللہ کریم کے بندوں میں سے کسی بندہ کو عمر بن عبدالعزیزؓ سے بڑھ کر اللہ کریم سے ڈرنے والا نہیں دیکھا۔ انہوں نے اپنے جسم اور جان کو لوگوں کے لئے خالی کر لیا تھا، وہ تمام دن لوگوں کی حاجات کے لئے بیٹھے رہتے اور اگر دن گزر جاتا مگر لوگوں کی حاجات کو پورا کرنا باقی رہ جاتا تو اپنی رات اس میں گزار لیتے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ لوگوں کی حاجات دن ہی دن میں نمٹا لیں اور شام فارغ ہو گئے تو چراغ منگوایا جسے وہ اپنے ذاتی مال سے روشن کیا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے دو رکعت (نفل) نماز ادا کی اور اپنا ہاتھ اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اکڑوں بیٹھے رہے اور آپ کے آنسو آپ کے رخساروں پر بہتے رہے۔ ساری رات یہی حالت رہی کہ صبح کا سپیدہ نمودار ہوا تو انہوں نے روزہ رکھ لیا۔ میں نے دریافت کیا یا امیر المومنین! رات آپ کو کیا ہوا (کہ آپ کی حالت ایسی قابل رحم تھی)؟ فرمانے لگے میری وہ حالت یہ ہے کہ میں اس امت کے سیاہ سفید کا مالک بنادیا گیا ہوں، مجھے وہ مسافر یاد آئے جو دوران سفر قناعت کر کے گزارا کرتے ہوں گے۔ بہت سے محتاج، فقیر، بہت سے بے بس قیدی اور انہی کی طرح بہت سے کمزور و ناتواں ہوں گے جو زمین کے دور دراز علاقوں میں بس رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اللہ کریم ان کے بارے میں مجھ سے ضرور سوال کریں گے اور حضرت محمد ﷺ ان کی جانب سے ضرور مجھ سے جھگڑیں گے۔ میں ڈر رہا ہوں کہ اس وقت اللہ کریم کے

حضور میں کوئی عذر پیش نہ کر سکوں گا اور نہ ہی حضرت محمد ﷺ کے سامنے کوئی حجت لاسکوں گا۔ یہ سوچ کر مجھے اپنی حالت پر رحم آیا اور میں رونے لگ گیا۔“

فرد کے معاشی مسئلہ کے حل میں اسلامی ریاست کے امیر کی کس قدر ذمہ داری ہے، اس بارے میں فقہائے اسلام نے بہت کچھ لکھا ہے۔ یہاں چند نظائر آپ کی توجہ کے لئے درج کیے جا رہے ہیں:

ولا یدع فقیرانی ولا یتہ الاعطاة ولا مدیونا الا قضی عنه دینہ ولا ضعیفاً الا اعانہ ولا مظلوماً الا نصرہ

ولا ظالماً الا منعه عن الظلم ولا عاریباً الا کساہ کسوة

(مولانا محمد حفظ الرحمن، اسلام کا اقتصادی نظام، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۹ء ص ۱۲۹ تا ۱۳۰ بحوالہ شرعہ الاسلام)

”وہ اپنی ریاست میں کوئی فقیر بغیر اسے عطا کئے نہ چھوڑے، نہ کوئی قرضہ دار باقی رہنے دے جب تک اس کا قرضہ ادا نہ کر دے، نہ کوئی کمزور مدد کے بغیر چھوڑے، نہ کوئی مظلوم حمایت کئے بغیر رہنے دے، نہ کوئی ظالم ظلم سے روکے بغیر چھوڑے اور نہ کوئی ننگا کپڑا پہنائے بغیر رہنے دے۔“

مختار الکونین کے مصنف نے بنیادی ضروریات زندگی گزار کر ان کا پورا کرنا امیر المومنین کی ذمہ داری بتایا ہے۔

فیجب علی الامام ان یقصد بتیسیر الاشیاء الثلاثة بكل من الناس علی حسب استعدادہ و مالہ سواء کان غنیاً او فقیراً او ذکراً او اثناً۔ اولها: الطعام والشرب وهو سبب بحیاتیہ فلا یکن حیاتیہ الابیہا۔ والثانی: اللباس سواء کان من القطن والکتان والصون او غیرہا۔ والثالث: التزویم لانہا سبب بقاء النسل (مولانا محمد حفظ الرحمن، بحوالہ مختار الکونین، قلمی نسخہ، ص ۴۴)

”امام (ریس مملکت) کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر فرد کو خواہ امیر ہو یا فقیر، مرد ہو یا عورت۔ اس کی استعداد اور حالات کے مطابق ان تین بنیادی ضروریات کے حصول کے لئے ہمہ قسم کی آسانیاں بہم پہنچائے۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں: (۱) کھانے پینے کی سہولت، کیونکہ یہ فرد کی زندگی کا ذریعہ ہے اور اس کے بغیر زندگی کا تصور ہی نہیں۔ (۲) لباس کی سہولت خواہ وہ روٹی کا ہو یا کتان (قیمتی کپڑا) یا اون کا۔ (۳) ازدواجی زندگی کی سہولت، کیونکہ یہ انسانی نسل کی بقاء (Contribution of Human Race) کے لئے ضروری ہے۔“

اس قول میں ”بتیسیر الاشیاء“ (ان اشیاء کے لئے فراہمی کی سہولت) کا ٹکڑا اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ جو افراد خود اللہ کریم کے خزانوں سے اپنا رزق کمانے کے قابل ہیں، ان کے کمانے کی راہ میں کوئی خارجی رکاوٹ نہ رہنے دی جائے، یعنی ایسا نہ ہو کہ ذرائع رزق چند سرمایہ داروں کے قبضہ میں ہوں اور محتاج ان کے محتاج بن کر اپنا رزق حاصل کریں یا محروم المعیشت رہیں اور اگر وہ معذور ہیں تو ان کی کفالت کرنا اسلامی ریاست کے امیر کی ذمہ داری ہے۔

خلاصہ بحث

آپ نے مذکورہ بحث سے اندازہ بخوبی لگالیا ہو گا کہ اسلام نے انسان کے معاشی مسئلہ کے حل کو کس قدر اہمیت دی ہے اور اس کے لئے کس حکمت عملی سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔ اگر آپ اس ساری بحث کو سمیٹنا (Sum up) چاہیں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ:

۱۔ اسلام نے ہر فرد کو اللہ کریم کے خزانوں سے خود محنت کر کے کمانے اور اپنا معاشی مسئلہ حل کرنے کی تلقین کی ہے، بشرطیکہ یہ فرد عاقل، بالغ اور تندرست و توانا ہو، طالب علم یا کسی دینی خدمت پر مامور نہ ہو۔
۲۔ اگر ہر فرد خود کمانے کا اہل نہیں تو پھر اسلام کے نظام نفقات کے تحت اس کی معاشی کفالت کی ذمہ داری اس کے والدین اور اقارب کے ذمہ ہے اور یوں اس کا معاشی مسئلہ حل کرنا ہو گا۔

۳۔ اگر ہر فرد نہ خود کما سکے، نہ اس کے اقارب اور اسلامی معاشرہ اس کی کفالت کر کے اس کا معاشی مسئلہ حل کرے تو پھر اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہوگی کہ اس شخص کی معاشی کفالت کرے۔

۴۔ اسلامی ریاست کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہوگی کہ وہ قابل کار افراد کو روزی کمانے اور یوں اپنا معاشی مسئلہ حل کرنے کے مواقع میسر کرے۔ پیداوار اور ذرائع پیداوار کسی ایک فرد یا مخصوص جماعت کے قبضہ میں نہ رہنے دے، کیونکہ ایسا قبضہ افراد کے لیے روزی کمانے کی راہ میں رکاوٹ ہو گا۔

سوشلزم نے فرد کی ضروریات زندگی کا پورا کرنا ریاست کی ذمہ داری قرار دے کر اچھا اقدام کیا ہے، مگر اس کے معاوضہ میں اس نے فرد کی تمام آزادیاں چھین کر اسے مشین کا بے حس پرزہ بنانے کی کوشش کی ہے جسے گریس (Grease) صرف اس لئے کیا جاتا ہے کہ وہ کام کرے۔

اس سلسلہ میں سب سے بڑی ناکامی سرمایہ دارانہ نظام کی ہوتی ہے۔ اس نے ”آزادی کاروبار“ کا پرفریب نعرہ لگا کر تمام ذرائع پیداوار کو چند سرمایہ داروں کے قبضہ میں چلے جانے کا موقع فراہم کیا ہے اور یوں بقیہ افراد کو روزی کمانے کے لئے محتاجی اور پریشانی کا شکار کر دیا ہے۔ وہ چند مٹھی بھر سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر زندگی گزارتے ہیں۔

الغرض سرمایہ دارانہ نظام انسان کے معاشی مسئلہ کے حل کا ادھور خواب دکھاتا ہے۔ سوشلزم اس کی تعبیر بتانے کی کوشش کرتا ہے اور اسلام نے اس کی عملی صورت دکھائی ہے۔

ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم

وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

سید قدرۃ اللہ فاطمی

اسلامی مملکت میں ٹیکس کا مسئلہ

(۱)

تمہید

ٹیکسوں کی چوری (Tax Evasion) کا عام رجحان پاکستانی معاشرہ اور معیشت کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ اس لئے کہ:

اولاً، ملکی دفاع اور معاشی بہبود کا تمام تر انحصار حکومت کے مالی وسائل پر اور خود ان وسائل کی فراہمی کا بیشتر انحصار مختلف قسم کے سرکاری ٹیکسوں پر ہے، لیکن حکومت کو جس قدر ٹیکس وصول ہونا چاہیے اس کا بہت ہی تھوڑا حصہ سرکاری خزانے میں پہنچ پاتا ہے۔ اس لئے حکومت کو بیرونی طاقتوں کا دستِ نگر ہونا پڑتا ہے، ملک کی سالمیت خطرے میں پڑتی ہے اور معاشی ترقی و بہبود کی رفتار بہت سست ہو جاتی ہے۔

ثانیاً، غیر اشتراکی ممالک میں سماجی انصاف کی موثر ترین تدبیر یہ ہے کہ ٹیکسوں کا زیادہ سے زیادہ بوجھ مال دار طبقہ پر ڈالا جائے اور یہ تدبیر صرف اسی وقت کارگر ہو سکتی ہے، جب کہ معاشرے کا یہ سب سے طاقتور عنصر اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے بغیر کسی بیرونی دباؤ کے، بہ رضا و رغبت تیار ہو۔ لیکن پاکستان کے مالدار طبقہ کو اس بارے میں اپنی ذمہ داریوں کا بہت کم احساس ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ معاشی ناہمواری اور طبقاتی کشمکش روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

ملک کے اہل فکر کا یہ فرض ہے کہ وہ اس تشویش ناک صورت حال کی اصلاح تدابیر پر غور کریں۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ اس سلسلہ میں ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب نے جو تجویز پیش کی ہے، وہی اس مسئلہ کا واحد قابل حل ہے۔ حکومت کے تمام قوانین کے نفاذ کے لئے بالعموم اور ٹیکس کے قوانین کے لئے بالخصوص، یہ ضروری ہے کہ ان کے پیچھے موثر اخلاقی جذبہ (Moral Sanction) کار فرما ہو۔ جب تاجر اور صنعت کار ٹیکس سے بچنے کے لئے جعلی بھی کھاتے بناتے ہوتے ہیں، تو انہیں اس سے باز رکھنے کے لئے حکومت کی تعزیر کا خوف بہت کم کارگر ہو سکتا ہے۔ مغرب کے جمہوری ممالک میں تو قومیت کا شدید احساس وہاں کے باشندوں کو ٹیکس کے لئے اپنی آمدنی کے صحیح اظہار پر آمادہ کرتا ہے اور اس قومی احساس کے تحت وہاں

کے تاجر اور صنعت کار ٹیکس کی بھاری بھاری رقمیں ادا کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن پاکستان میں صورت حال مختلف ہے۔ ہمارے اخلاقی اقدار قومیت پر نہیں بلکہ اسلامیت پر استوار ہیں۔ ہمیں ٹیکس کے قوانین کے موثر اور منصفانہ نفاذ کے لئے اسلامی روایات سے مدد لئے بغیر چارہ نہیں۔ پاکستان کے پچھلے اٹھارہ سال کے تجربہ اور بالخصوص ستمبر کی جنگ سے کم از کم اتنا سبق تو لینا چاہیئے کہ کافر نتوانی شد، ناچار مسلمان شو

یہ ضرور ہے کہ ملک میں ایک بہت مختصر، مگر صاحب اثر و نفوذ گروہ لادینی سیاست (Secularism) پر یقین رکھنے والوں کا بھی ہے، جنہیں ہمارے اخلاقی اقدار کے نظام کا وراثہ اسلام پر مبنی ہونا، ناگوار خاطر گذرتا ہے۔ لیکن اتنا تو انہیں بھی ماننا پڑیگا کہ کسی قوم کی موروثی اخلاقی بنیادوں سے انکار اور انحراف کرنا، اس قوم میں اخلاقی بحران پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لئے انہیں بھی یہ تسلیم کر لینا چاہیئے کہ پاکستان جیسی اسلامی مملکت میں ٹیکسوں کے نظام کو موثر، ترقی پذیر اور انصاف پر مبنی بنانے کے لئے لازمی ہے کہ اسے اسلامی سانچے میں ڈھالا جائے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے، جبکہ زکوٰۃ اور ٹیکس کی ثنویت (Duality) کو دور کر دیا جائے اور سرکاری ٹیکسوں کو مذہبی فریضہ کے طور پر ادا کیا جائے۔

اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ عملاً زکوٰۃ خود ایک ٹیکس ہے، یعنی حضرت ابو بکر صدیقؓ کے الفاظ میں ”حق المال“¹۔ یہ بھی مسلم تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں خیبر و مکہ وغیرہ کی فتوحات سے قبل حکومت کے کاروبار کو چلانے، مدینہ کی ریاست کو بے حد طاقت ور دشمنوں کے خوف ناک حملوں سے بچانے اور عام مسلمانوں کے رفاہی کاموں کو سرانجام دینے کے لئے زکوٰۃ (صدقات) ہی واحد ذریعہ آمدنی تھا۔ اسلامی فتوحات کے بعد مال غنیمت، مفتوحہ علاقوں کا خراج اور ذمی رعایا سے وصول کردہ جزیہ اور عشر بیت المال کی آمدنی میں کثیر اضافہ کا سبب ضرور بن گئے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں پاکستان جیسے ملک کے لئے آمدنی کے یہ ذرائع قطعاً مسدود ہیں۔ اوائل اسلام کے ٹیکسوں میں سے اب صرف زکوٰۃ ہی ایک ایسا ٹیکس ہے، جسے موجودہ زمانہ کی اسلامی مملکت نافذ کر سکتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مروجہ شرح آج کل کی حکومتوں کو چلانے اور ملک کے نادار طبقہ کی رفاہی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے قطعاً ناکافی ہے۔ اس لئے زکوٰۃ کے عملی نفاذ کے لئے اس کی مروجہ شرح کو یکسر بدلنا ہوگا۔ اس کے مصارف کے بارے میں مروجہ تعبیرات پر بھی نظر ثانی کرنی ہوگی۔ اس کے بغیر پاکستان میں ٹیکسوں کے نظام کو اسلام کے بلند ترین اخلاقی اقدار کی بنیادوں پر استوار کرنے، اسے زیادہ سے زیادہ منصفانہ بنانے اور اسے مذہبی فریضہ کے طور پر ادا کرنے کی موثر ترین ترغیب دینے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ مگر ان تبدیلیوں کو قبول کرنے

میں پاکستان کے ”اسلام پسند“ طبقوں کو سخت تامل ہے۔ پاکستان کے معاشرتی مسائل کے زیادہ الجھتے چلے جانے اور معاشرہ میں عام طور پر اخلاقی بحران کے پائے جانے کا سبب ہی یہ ہے کہ یہاں ایک طرف تو وہ گروہ ہے، جو اسلامی نظام اقدار کو موجودہ زمانہ کے لئے فرسودہ، بے کار یا کم از کم غیر متعلق شے سمجھتا ہے اور دوسری طرف وہ گروہ ہے جو زبان سے تو اسلامی نظام اقدار کو رائج کرنے کے لئے پرجوش نعرے لگاتا ہے، اس نام پر سیاسی جماعتیں بناتا ہے، لیکن جب بدلتے ہوئے معاشرہ میں اس نظام کو عملاً نافذ کرنے کے لئے نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو وہ ان سے ہر اسلحاں ہو کر موجودہ اسلامی تعطل اور جمود کو ترجیح دینے لگتا ہے۔

جو اصحاب، زکوٰۃ کی مروجہ شرح میں تبدیلی اور اضافہ کے مخالف ہیں، ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ: دیگر عبادات یعنی نماز، روزہ اور حج کی طرح زکوٰۃ کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک فرض جو زکوٰۃ ہی کہلاتا ہے، دوسری نفل جسے ”صدقہ“ کہتے ہیں۔ جس طرح فرض نمازوں کی رکعتوں کی تعداد اور ان کے اوقات، فرض روزوں کی تعداد اور ان کا زمانہ اور فرض حج کے ارکان اور اس کا زمانہ شرعاً متعین ہیں، اسی طرح فرض زکوٰۃ کی مروجہ شرح اور مصارف بھی شریعت کی رو سے متعین ہیں اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی مداخلت فی الدین ہے۔ البتہ جس طرح نفل نمازوں کی رکعتوں کی تعداد اور ان کے اوقات، نفل روزوں کی تعداد اور ان کا زمانہ اور نفلی حج (یعنی عمرہ) کا زمانہ غیر متعین ہے، اسی طرح نفل زکوٰۃ یعنی صدقات کی شرح اور ان کے مصارف کا کوئی تعین شارح علیہ السلام نے نہیں فرمایا۔ لیکن یہ صدقات چونکہ نفلی ہیں، فرض نہیں، اس لئے ان کی ادائیگی پر اسلامی مملکت کی طرف سے قطعاً جبر نہیں کیا جاسکتا ہے اور یہ ٹیکس کی شکل نہیں اختیار کر سکتے۔

مندرجہ بالا دلائل دو تنقیحات پر مبنی ہیں: اولاً، زکوٰۃ اور صدقات کی تفریق۔ ثانیاً، فرض زکوٰۃ کی مروجہ شرح اور مصارف کی موجودہ تعبیر کا از روئے شریعت تعین۔ ہم ان دونوں تنقیحات کا قرآن حکیم، احادیث نبوی، آثار صحابہ، اقوال آئمہ متقدمین اور تاریخ اسلام کے حقائق کی روشنی میں سیر حاصل تجزیہ کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

(۲)

زکوٰۃ اور صدقات کی مروجہ تفریق

(الف) قرآن حکیم کی روشنی میں

نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے کو قرآن نے کہیں محض انفاق (خرچ کرنا)، یا انفاق فی سبیل اللہ، (اللہ کی راہ میں خرچ کرنا)، کہیں زکوٰۃ، کہیں صدقہ اور کہیں حق کہا ہے۔²

² محدث زر قانی شارح مؤطا امام مالک فرماتے ہیں: ولها اسماء - الزكاة: من قوله وآتوا الزكاة - والصدقة: خذ من أموالهم صدقة - والحق: وآتوا حقه يوم حصاده - والنفقة: قال ابن نافع عن مالك من قوله تعالى: والذين يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقونها في سبيل الله - والعرف: خذ العفو

¹ صحيح البخاری ج ۲، ص: ۱۳۱ کتاب الزكاة، باب وجوب الزكاة

اس معاشرتی فریضہ کی بجا آوری کے لئے قرآن نے بار بار تاکید کی ہے، اس کے لئے طرح طرح سے ترغیب دی ہے اور اس میں کوتاہی برتنے والوں کو شدید ترین وعیدوں سے ڈرایا ہے۔ قرآن نے اس سلسلے میں فرض اور نفل کی کوئی تفریق نہیں کی۔ وہ ان اصطلاحات سے قطعاً مبرا ہے۔ فرض، نفل، واجب، سنت، موکدہ، سنت غمر، موکدہ وغیرہ اصطلاحات اور ان کی پیدا کردہ تفریق تیسری صدی ہجری اور اس کے بعد کے فقہاء کا اجتہاد ہے۔ قرآن تو انسان کی فلاح و بہبود کے لئے ہدایت اور احکام کی روح کو دلوں تک پہنچانے کے لئے سادہ الفاظ اور موقع کے مناسب انداز بیان اختیار کرتا ہے اور بس۔ قرآن حکیم نے واقعیہ الصلوٰۃ کے ساتھ بار بار واتوا الزکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ لیکن جہاں کہیں وہ اس الزکوٰۃ کی تشریح و تفصیل بیان کرنا چاہتا ہے، وہ اس کے لئے کوئی اور مترادف لفظ استعمال کرتا ہے، جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

انفاق:

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ: ۲۱۹)

”اور یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجئے کہ جو ضرورت سے بچ رہے۔“
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَحِثَّاءُ خَرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَتَّبِعُوا الْحَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِأَخِيذِهِ إِلَّا أَنْ تُغْبِضُوا فِيهِ (البقرہ: ۲۶۷)
”اے ایمان والو! اپنی کمائی میں سے اور ان چیزوں میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالی ہیں، خرچ کرو۔ اور تم ان میں سے وہ بری چیزیں خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو جنہیں تم خود آنکھیں موندے بغیر لینا پسند نہ کرو۔“

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ

(آل عمران: ۹۲)

”تم نیکی نہیں پاؤ گے، جب تک کہ تم اپنی ان چیزوں میں سے خرچ کرو، جنہیں تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ بھی تم خرچ کرتے ہو، اللہ اس سے بخوبی واقف ہے۔“

انفاق فی سبیل اللہ:

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارٍ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَٰذَا مَا كُنْتُمْ لَا تُفْسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ (التوبہ: ۳۴-۳۵)

وامیرالعرف (شرح الزرقانی علی موطأ امام مالک، مطبوعہ مطبعہ اکتلیہ، مصر ۱۲۸۰ھ، ج ۲، ص ۳۱) ہم نے مندرجہ بالا مترادفات میں سے مؤخر الذکر یعنی العرف کو قصداً ترک کر دیا ہے، کیونکہ اس آیت کی تفسیر اور یہاں العفو اور العرف کے معنی متعین کرنے میں مفسرین کے آپس میں شدید اختلافات ہیں۔

”اور جو لوگ سونا اور چاندی سنت سنت کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کے راستہ میں نہیں خرچ کرتے، انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری دے دیجئے، اس دن کی جبکہ یہ (سونا چاندی) جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی، کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لئے سنت سنت کر رکھا تھا تو اب اپنے ان خزانوں کا مزہ اچکھو۔“

صدقہ:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةٌ مِنَ اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (التوبہ: ۶۰)
”بے شک صدقات فقراء کے لیے ہیں اور مساکین کے لئے اور ان کی تحصیل وصول کرنے والے کارندوں کے لئے اور ان کے لئے جن کی دل جوئی مقصود ہے اور غلاموں کے لئے اور قرض داروں کے لئے اور اللہ کے راستے میں اور مسافروں کے لئے۔ یہ اللہ کا فریضہ ہے اور اللہ سب سے زیادہ جاننے والا، حکمت والا ہے۔“

قابل غور بات یہ ہے کہ یہی وہ آیت ہے جس پر فرض زکوٰۃ کے مصارف کی فقہی تفصیلات کی ساری عمارت قائم ہے لیکن قرآن حکیم نے واضح طور پر یہاں الصدقات کا لفظ استعمال کیا ہے نہ کہ الزکوٰۃ۔
خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا (التوبہ: ۱۰۳)
”ان کے مال میں سے صدقہ لیکر ان کو طہارت اور پاکیزگی بخشئے۔“
مفسرین عموماً اس آیت کے نزول سے زکوٰۃ کی فرضیت کی ابتدا کا سراغ لگاتے ہیں لیکن قرآن نے یہاں بھی لفظ صدقہ استعمال کیا ہے۔

حق:

وَأَتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ (آل عمران: ۱۴۱)

”اور کھیتی کاٹنے کے دن ان کھیتوں کا حق ادا کرو۔“

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلْسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (الذاریات: ۱۹)

”اور ان کے مال میں حق ہے حاجت مند اور محروم کا۔“

وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَعْلُومٌ لِلْسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (المعارج: ۲۴-۲۵)

”اور جن کے مال میں حاجت مند اور محروم کا ”حق معلوم“ ہے۔“

(ب) احادیث نبوی کی روشنی میں

آنحضرت ﷺ سے زکوٰۃ کے بارے میں جو حدیثیں مروی ہیں، ان میں عموماً لفظ صدقہ مستعمل ہے۔ مثال کے طور پر امام بخاریؒ اپنی صحیح کی کتاب الزکوٰۃ میں ایک باب کا عنوان قائم کرتے ہیں: باب وجوب الزکوٰۃ اور اس کے ذیل میں حد تو اترا تک پہنچی ہوئی وہ مشہور حدیث نقل کرتے ہیں جس میں معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجے وقت مختلف ہدایات دیتے ہوئے رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

ان الله افترض عليهم صدقة في اموالهم تؤخذ من اغنيائهم وترد على فقرائهم³

”اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے مال میں سے صدقہ مقرر کیا ہے، کہ وہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے ناداروں پر خرچ کیا جائے۔“

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی حدیث امام بخاریؒ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے ایک اور باب میں درج کرتے ہیں جس کا عنوان ہے: لا تؤخذ كرائم اموال الناس في الصدقة، لیکن یہاں متن حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ان الله فرض عليهم زكاة من اموالهم⁴

اس سے ظاہر ہے کہ نہ صرف احادیث نبویؐ میں صدقہ اور زکوٰۃ کے الفاظ بطور مترادف استعمال ہوئے ہیں، بلکہ امام بخاریؒ کے نزدیک بھی یہ دونوں لفظ مترادف ہیں۔

ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ امام بخاریؒ ایک اور عنوان قائم کرتے ہیں: باب زکوٰۃ الودق اور اس کے ذیل میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی وہ حدیث نقل کرتے ہیں جس پر زکوٰۃ کے نصاب کے فقہی مسائل کی بنیاد ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

ليس في مادون خبس ذوو صدقة من الابل وليس في مادون خبس اواق صدقة وليس في مادون خمسة اوسق صدقة⁵

”پانچ سے کم اونٹوں پر کوئی صدقہ نہیں ہے اور پانچ اوقیہ سے کم چاندی پر کوئی صدقہ نہیں ہے اور پانچ وسق سے کم اناج پر کوئی صدقہ نہیں ہے۔“

مسند امام احمد بن حنبلؒ میں یہی حدیث لفظ زکوٰۃ کے ساتھ مروی ہے۔⁶

تاریخ و سیرت کی مستند کتابوں میں زکوٰۃ کی تحصیل کے سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کے وہ خطوط درج ہیں جو آپ نے مدینہ سے باہر کے نو مسلم عرب قبائل کو لکھے تھے۔ ان میں بھی زکوٰۃ کے مفہوم میں ہر بار لفظ

³ صحیح البخاری (مطبعة مصطفى البابي، مصر، ۱۳۷۷ھ، ج ۲، ص ۱۳۰ کتاب الزکوٰۃ، باب وجوب الزکوٰۃ)

⁴ (ایضاً، ج ۲، ص ۱۳۷)

⁵ (ایضاً، ج ۲، ص ۱۳۳ تا ۱۳۴)

⁶ (المطبوع الميمني، مصر، ۱۳۱۳ھ، ج ۳، ص ۵۹)

صدقہ استعمال کیا گیا ہے۔⁷ اور بعض دستاویزوں میں زکوٰۃ کی تحصیل کے کارندوں کے لئے اسی صدقہ سے مشتق لفظ مصدق مستعمل ہے۔⁸ اس کے برخلاف جسے اب صدقۃ الفطر کہتے ہیں، اس کے لئے احادیث میں بیشتر زکوٰۃ الفطر کی ترکیب استعمال کی گئی ہے۔⁹ لیکن معدودے چند حدیثیں ایسی بھی ہیں، جن میں اسے صدقۃ الفطر کہا گیا ہے۔¹⁰

زکوٰۃ کی تنظیم میں معاشرتی بہبود کی روح کار فرما ہے۔ اس امر کی تاکید کے لئے رسول اللہ ﷺ نے معاشرتی فلاح کے مختلف کاموں کے بارے میں یہ فرمایا کہ یہ صدقہ ہے۔ کتب احادیث میں اس مضمون کی متعدد حدیثیں مختلف طریقوں سے مروی ہیں، جن میں دو مسلمانوں کے آپس میں انصاف کر دینے،¹¹ بھٹکے ہوئے کو راستہ بتانے،¹² راستہ کی رکاوٹوں کو دور کرنے،¹³ آنے والی نسلوں کی بھلائی کے لئے درخت لگانے،¹⁴ دوسروں سے خندہ پیشانی سے ملنے،¹⁵ یہاں تک کہ زن و شوہر کے خوشگوار تعلقات¹⁶ کو بھی صدقہ بتایا گیا ہے۔ اس مضمون کو مزید وسعت دے کر بعض احادیث میں تہلیل و تکبیر کو بھی صدقہ کہا گیا ہے۔¹⁷ ان ہی احادیث کی بناء پر متاخرین ائمہ فقہ و حدیث نے ”نفلی“ زکوٰۃ کے لئے صدقہ اصطلاح بنالی ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض حدیثوں میں زکوٰۃ کے مفہوم میں بھی ایسی ہی وسعت دی گئی ہے۔ مثلاً مسند امام احمد بن

⁷ تاریخ الطبری (مطبوعہ لنڈن، ۱۹۰۱ء، ج ۱، ص ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، طبقات ابن سعد (مطبوعہ لنڈن، ۱۹۱۲ء، ج ۲، ص ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵

حنبلی کی ایک حدیث ہے: صلوا علی فانہا زکوٰۃ لکم¹⁸ ”مجھ پر درود بھیجو، کیونکہ یہ تمہارے لئے زکوٰۃ ہے۔“

(ج) آثار صحابہ و اقوال سلف کی روشنی میں

آنحضرت ﷺ کے مذکورہ بالا خطوط زکوٰۃ کی شرح کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی آیات کے بعد سب سے اہم اور مستند دستاویزیں ہیں۔ ان ہی میں سے بعض خطوط کی نقلیں چند معنی خیز اور اہم اضافوں اور ترمیموں کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرف منسوب ہیں۔ ہم ان اضافوں اور اس کی اہمیت پر آگے چل کر بحث کریں گے۔ یہاں قابل ذکر امر یہ ہے کہ ان میں بھی ہر جگہ بجائے زکوٰۃ کے لفظ صدقہ موجود ہے لیکن حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرف ایسے اقوال بھی منسوب ہیں، جن میں لفظ الزکوٰۃ آیا ہے، مثلاً حضرت ابو بکرؓ کا ارشاد ہے:

فان الزکوٰۃ حق المال¹⁹ ”زکوٰۃ مالی حق یعنی ٹیکس ہے۔“

یا حضرت عمرؓ کا یہ مشورہ:

اتجروا فی اموال الیتیمی، لاتاکلھا الزکوٰۃ²⁰

”یتیموں کے مال کو تجارت میں لگاؤ تاکہ وہ سارا زکوٰۃ ہی میں ختم نہ ہو جائے۔“

بنو امیہ کے دور حکومت میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کا مختصر عہد (۹۹ھ تا ۱۰۲ھ) اپنی دیگر روشن خصوصیات کے علاوہ اس لئے بھی ممتاز ہے کہ ان کے زمانے میں بیت المال کے ذرائع آمدنی اور ان کے مصارف کی اصلاح پر خاص توجہ دی گئی۔ اس سلسلہ میں ان کے بعض احکام حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں۔ ان میں سے ایک کے الفاظ یہ ہیں:

انما الصدقة فی الحرب والعین والباشیة²¹

”صدقہ صرف کھیتی، سونے چاندی اور مویشی پر ہے۔“

(د) بعد کی تبدیلیاں

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ ظاہر ہے کہ دوسری صدی ہجری کے اوائل تک زکوٰۃ اور صدقہ میں کوئی تفریق نہ تھی۔ یہ دونوں الفاظ مترادف تھے اور ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے تھے۔ دوسری صدی ہجری کے نصف آخری سے علوم کی تدوین شروع ہوئی۔²² یونانی کتابوں کے ترجمے شائع ہونے لگے،

¹⁸ ج ۳، ص ۵۹

¹⁹ صحیح بخاری، ج ۱۹، ص ۱۳۱۔ کتاب الزکوٰۃ، باب وجوب الزکوٰۃ

²⁰ موطا امام مالک (تحقیق محمد فواد عبدالباقی، دار احیاء الکتب، قاہرہ ۱۹۵۱ء ج ۱، ص ۲۵۱) کتاب الزکوٰۃ، حدیث (۱۲)

²¹ ایضاً، ج ۱، ص ۲۳۵ (کتاب الزکوٰۃ، حدیث ۳)

²² خالد بن یزید بن معاویہ بن ابی سفیان، جس کی وفات ابن عساکر کی روایت کے مطابق ۹۰ھ میں ہوئی تھی، (تہذیب ج ۵ ص ۱۱۶)، پہلا مسلم شاہزادہ تھا، جسے علوم یونانی میں خاص شغف تھا۔ اس کے حکم سے یونانی اور قبطی زبانوں سے علمی خزائن عربی زبان میں منتقل ہوئے تھے۔ (فہرست ابن الندیم ج ۱)

مسلمانوں میں یورپ کے قدیم (یونانی) فلسفہ کا چرچا پھیلا۔ ایرانی اور ہندو فکر کے اثرات بھی مترتب ہونے لگے۔

قرآن حکیم میں شریعت کے احکام اول و آخر محض عمل کے لئے تھے اور سنت تو قرآن پر رسول اللہ ﷺ اور ان کے اصحاب کے عمل ہی کا دوسرا نام تھا۔ لیکن اب شریعت کے علوم کا دور دورہ شروع ہوا۔ علوم کے لئے اصطلاحیں ضروری ہیں۔ اس لئے علوم شرعیہ کی اصطلاحیں مدون ہونے لگیں جن میں ارتقا کے ناگزیر عمل کے ساتھ ساتھ زیادہ تعین، وضاحت، ضبط اور قطعیت آتی چلی گئی اور شریعت کے احکام مختلف انواع و اقسام میں منقسم ہوتے چلے گئے۔

امام مالکؒ (۹۳ھ تا ۱۷۹ھ) کی موطا علم فقہ و علم حدیث کی پہلی مدون کتاب ہے جو ہم تک پہنچی ہے اور اپنی صحت اور تفقہ فی الدین کے لحاظ سے، بہت سے بالغ نظر ائمہ فقہ و حدیث کے نزدیک صحیح بخاری پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس کے عنوانات میں امام مالکؒ نے زکوٰۃ اور صدقہ کی اصطلاحوں میں ایک نمایاں تفریق مد نظر رکھی ہے۔ وہ مویشیوں کی زکوٰۃ کے لئے صدقہ اور دوسری تمام اصناف کی زکوٰۃ کے لئے زکوٰۃ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔²³

اسی قسم کی تفریق امام ابو یوسفؒ (۱۱۳ھ تا ۱۸۲ھ) برقرار رکھتے ہیں۔ اسلامی مملکت کے محاصل (ٹیکس) پر ان کی کتاب الخراج قدیم المثنیٰ ہے۔ ائمہ متقدمین میں وہ پہلے فقیہ ہیں جنہوں نے زکوٰۃ اور دوسرے محاصل کے مسائل پر مستقلاً اور خصوصی تحقیق کی ہے اور اس موضوع پر ان کے نتائج فکر کی دقت نظر، اصابت رائے اور تفقہ کی نظیر نہ سلف میں ملتی ہے نہ خلف میں۔ زکوٰۃ کے سلسلہ کی اصطلاحات کے بارے میں ان کا اجتہاد یہ ہے کہ الصدقة فی الابل والبقر والغنم والغنم²⁴ ”صدقہ اونٹ، گائے، بکری اور گھوڑے پر ہے۔“

مویشیوں کے علاوہ اصناف پر جو زکوٰۃ مسلمانوں سے لی جائے، اسے وہ عشرہ کہتے ہیں۔ بارانی زمین کی زکوٰۃ تو واضح طور پر عشر یعنی دسواں حصہ ہے۔ چابی زمین پر نصف عشر (یعنی بیسواں حصہ) ہے۔ اور سونے،

ص ۲۴۲) اس لحاظ سے مسلمانوں میں علوم یونانی کی اشاعت کی تاریخ پہلی صدی ہجری کے اواخر ہی سے شروع ہو جاتی ہے، یعنی علوم حدیث وفقہ کی تدوین سے کافی عرصہ پہلے۔ لیکن علوم یونانی کی اشاعت نے طاقت ور تحریک کی شکل ۱۳۲ھ کے بعد ہی اختیار کی جب عباسی سربراہ نے حکومت ہوئے اور عربیت پر محبت کا غلبہ ہوا۔ مامون کا دور حکومت (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ) اس تحریک کا انتہائی نقطہ عروج تھا۔ اس کے بعد جہاں اس کی ترقی جاری رہی، وہاں اس کے خلاف شدید رد عمل بھی شروع ہو گیا۔

²³ باب صدقة الباشیة، باب ما جاء فی صدقة البقر، باب صدقة الخلاء، باب ما جاء فی ما یعتد بہ من البخل فی الصدقة۔ باب العمل فی صدقة العامین اذا اجتمعوا کے تحت جو حدیث درج ہے، وہ بھی مویشیوں کی زکوٰۃ سے متعلق ہے اور یہی حال باب النہی عن التفتیق علی الناس فی الصدقة اور باب ما جاء فی أخذ الصدقات والتشدید فیہا کا ہے۔ باب أخذ الصدقة ومن یجوز له اخذها میں بظاہر مویشیوں کی زکوٰۃ کا ذکر نہیں، لیکن اگر اس حدیث اور اس پر امام مالکؒ کے تشریح انتہاء کو باب العمل فی صدقة العامین اذا اجتمعوا والی حدیث کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ امام اہل المدینہ نے یہاں الصدقة کی اصطلاح کیوں استعمال کی۔

²⁴ کتاب الخراج لماما بن یوسف (المطبعة السلفية، قاہرہ ۱۳۸۲ھ، ص ۷۶)

چاندی اور اموال تجارت پر ربع عشر (یعنی چالیسواں حصہ) ہے۔ اس اعشاری (Decimal) تناسب کے پیش نظر مویشیوں کے علاوہ تمام اصناف کی زکوٰۃ کو عشر کہنا امام ابو یوسفؒ کے ریاضیاتی ذہن (Mathematical Brain) پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن ان دونوں اصطلاحات کی تفریق کے ساتھ ان کا قدر مشترک بھی امام یوسفؒ کے ذہن میں ہے۔ اس لئے وہ کہتے ہیں:

فاذا اجتمعت الصدقات من الابل والبقر والغنم جمع الى ذلك ما يؤخذ من المسلمين من عشورا لاموال وما يبريه على العاشم من متاع وغيره لان موضع ذلك كله موضع الصدقة²⁵

”جب اونٹ، گائے اور بکری کے صدقات جمع ہو جائیں تو ان کے ساتھ وہ تمام محاصل اکٹھے کر لئے جائیں جو مسلمانوں سے لئے جاتے ہیں، یعنی (زمینوں کے) عشر، سونے چاندی کے عشر (ربع عشر) اور مال تجارت وغیرہ ٹیکس لینے والے (عاشر) کی چوکی پر سے گزرتے ہوئے جو (ربع عشر) یعنی چٹکی) لی جاتی ہے۔ اس لئے کہ ان سب کا مقام وہی ہے جو صدقہ کا ہے۔“

اسلامی مملکت کے ٹیکسوں کے نظام پر دوسری عظیم کتاب امام ابو عبیدہؒ (۱۵۷ھ-۲۲۴ھ) کی کتاب الاموال ہے۔ یہ اپنی ترتیب کی سادگی اور احادیث کے جمع کرنے میں دست رسی کے لحاظ سے کتاب الخراج پر سبقت لے گئی ہے۔ لیکن دقت نظر اور نکتہ سنجی میں اس سے بدرجہا فروتر ہے۔ امام ابو عبیدہؒ مویشی کی زکوٰۃ کے لئے صدقہ اور سونے چاندی اور کھیتی باڑی کی زکوٰۃ کے لئے زکوٰۃ کی اصطلاح لاتے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ اموال تجارت کی زکوٰۃ کے لئے وہ صدقہ فی التجارة²⁶ کی اصطلاح وضع کر لیتے ہیں۔

مویشیوں کی زکوٰۃ کے لئے صدقہ کی اصطلاح کی تخصیص قاضی مرغینانیؒ (۵۳۰ھ-۵۹۳ھ) کی ہدایہ جیسی متاخر کتاب میں بھی باقی رکھی گئی ہے۔²⁷

اصطلاحات کی مذکورہ بالا تفریق کی جڑیں زکوٰۃ کی تاریخ میں پیوست ہیں، جیسا کہ ہم آگے چل کر واضح کریں گے۔ آنحضرت ﷺ سے صرف مویشیوں اور کھیتی کی مروجہ شرح والی زکوٰۃ کی تحصیل ثابت ہوتی ہے۔ فقہاء انہیں دوسری اصناف سے ممتاز کرنے کے لئے اموال ظاہرہ کہتے ہیں۔ ان میں سے مویشی کی زکوٰۃ کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جاتے ہی تاریخ اسلام کی سب سے بڑھ آزمائش آئی۔ کیونکہ عرب کے نو مسلم بدو قبائل نے اس زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا تھا۔ حضرت ابو بکرؓ کے صدق و استقلال نے بگڑتے ہوئے حالات پر قابو پا لیا۔ آپ نے ان بدو قبائل پر فوج کشی کر کے انہیں مویشیوں کی زکوٰۃ کے ادا کرنے پر مجبور کیا۔ ان تاریخی واقعات اور ان سے ماخوذ سنت کے پیش نظر فقہاء کا فتویٰ امام ابو عبیدہ

ہ کے الفاظ میں یہ ہے:

اما الصدقة التي يكره الناس عليها ويجاهدون على منعها فصدقة الباشية والحرث والنخل²⁸
”جس زکوٰۃ پر لوگوں کو مجبور کیا جائے اور جس کے روک لینے پر جہاد کیا جائے، وہ مویشیوں، کھیتی اور درخت کی زکوٰۃ ہے۔“

اموال ظاہرہ میں سے بھی مویشیوں کی زکوٰۃ ہی الصدقہ تھی۔ کیونکہ حضرت ابو بکرؓ نے اسی سلسلہ میں جہاد کیا تھا، جیسا کہ تاریخی واقعات اور ان کے اس مشہور قول سے ظاہر ہے:

لومنعوني عناقا (يا بعض روايتون) كي رو سے عقالا) كانوا يؤدونها الى رسول الله ﷺ لقاتلتهم على منعها²⁹
”جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بھیڑ کا ایک بچہ (یا اونٹ باندھنے کی رسی) بھی دیتا تھا اور اس نے مجھے اب نہیں دیا تو میں اس سے جنگ کروں گا۔“

یہ متقدمین کی اصطلاحیں تھیں۔ متاخرین نے اس تاریخی پس منظر کو پس پشت ڈال کر الزكاة المفروضة (فرض زکوٰۃ) اور اس کے مقابلہ میں صدقة التطوع (نفل صدقہ) کی اصطلاحیں وضع کر لیں، جن کا گہرا اثر ہمارے مروجہ خیالات پر ہے۔ بہ ایں ہمہ پانچویں صدی ہجری تک امام ماوردیؒ (۳۶۳ھ-۴۵۰ھ) جیسے نکتہ رس فقیہ کی نظر سے زکوٰۃ اور صدقہ کی تفریق کا بے اصل ہونا پوشیدہ نہ تھا، چنانچہ وہ واضح الفاظ میں فرماتے ہیں:

الصدقة زکوٰۃ والزکوٰۃ صدقة يفتقر الاسم ويتفق المسمي³⁰
”صدقہ، زکوٰۃ ہے اور زکوٰۃ، صدقہ ہے۔ نام متفرق ہیں لیکن ان کے مسمیٰ ایک ہیں۔“

(۳) مالی عبادت اور ٹیکس کی تفریق

قرآن حکیم، سنت رسول ﷺ اور تعامل صحابہؓ کی رو سے مسلمان کی ساری زندگی عبادت ہے۔ دینی امور (عبادات) اور دنیوی امور (معاملات) کی تفریق یہودی فرسیت اور مسیحی رہبانیت کے پیش نظر شاید کچھ اصل رکھتی ہو، لیکن اسلامی تعلیمات اس کی سراسر نفی کرتی ہیں۔ عمل کی دنیا میں اس تفریق کو راہ دینے کی اسلام کوئی گنجائش نہیں رکھتا۔ لیکن علم کی دنیا کی مصلحتیں اور ہیں۔ مسائل فقہیہ کی تدوین کے لئے ان کی تقسیم و ترتیب ضروری تھی۔ اسلامی مملکت میں زکوٰۃ کے علاوہ مسلمانوں سے کوئی اور محصول نہیں لیا جاسکتا، اس لئے کہ وہ شرعاً جو روبرو میں شمار ہوگا۔ چنانچہ زکوٰۃ ہی اسلامی مملکت میں مسلمانوں سے لیا جانے والا واحد ٹیکس (حق المال) ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں سے کسی قسم کا محصول لینے والے کے لئے احادیث میں

²⁸ کتاب الاموال ص ۵۳۱

²⁹ صحیح البخاری، ج ۲، ص ۱۳۱ (کتاب الزكاة، باب وجوب الزكاة)

³⁰ الاحکام السلطانية للماوردی (المطبوعة المحمودية التجارية، مصر) ص ۱۰۸

²⁵ ایضاً، ص ۸۰

²⁶ کتاب الاموال لابی عبیدہ (تحقیق محمد حامد الفقی، قاہرہ، ۱۳۵۳ھ ص ۲۲۵)

²⁷ الهدایہ (مع الدرر، مطبع مہتابی، دہلی ۱۳۷۵ھ ج ۱، ص ۱۶۷ (باب صدقة السوائم)

جہنم کی وعید آئی ہے۔ لیکن چونکہ زکوٰۃ ہی پر اسلامی مملکت کے بقا کا انحصار ہے اور صرف اسی کے ذریعہ انسانی اخوت، معاشی انصاف، ہمدردی اور باہمی امداد کے اسلامی اقدار کی پرورش ہو سکتی ہے، اس لئے یہ نہ صرف عبادت بلکہ نماز، جنتی اہمیت رکھنے والی عبادت ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے مشہور الفاظ ہیں:

والله لا تقاتلن من فرق بين الصلوة والزكاة فان الزكاة حق المال³¹

”خدا کی قسم! جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا، میں اس سے جنگ کروں گا۔ کیونکہ زکوٰۃ حق المال ہے۔“

علم فقہ اور علم حدیث پر کتابیں مدون کرنے والوں نے اپنی صوابدید اور کتاب کی ترتیب کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے زکوٰۃ کو یا تو عبادت کے زمرے میں شامل کیا ہے یا اسلامی مملکت کے ٹیکسوں میں۔ اور امام مالکؒ جیسے فقیہ نے بیک وقت دونوں ہی حیثیات کو پیش نظر رکھا ہے۔ وہ اپنی مؤطا میں کتاب الزکوٰۃ کو کتاب الصلوة اور کتاب الصیام کے درمیان جگہ دیتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف وہ کتاب الزکوٰۃ کے ذیل میں باب جزية اهل الكتاب والمجوس اور باب عشور اهل الذمة جیسے عنوانات بھی قائم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر زکوٰۃ محض عبادت ہے تو اس میں اہل کتاب اور مجوس کے جزیہ اور ذمیوں کے عشر کا کیا کام؟

امام ابو یوسف کی کتاب الخراج اور امام ابو عبیدہؒ کی کتاب الاموال تو سر تا سر اسلامی مملکت کے محاصل (ٹیکسوں) کے موضوع پر ہیں۔ ان میں سے کتاب الخراج میں زکوٰۃ کی بحث فصل فی الصدقات اور فصل فی العشور کے عنوانات کے تحت کئی گئی ہے۔ اور کتاب الاموال میں یہی مسائل کتاب الصدقات و احکامها و سننھا کے ذیل میں آتے ہیں۔

پانچویں صدی ہجری کے بالغ نظر فقیہ امام ماوردیؒ اور امام ابو یعلیٰؒ (۳۸۰ھ-۴۵۸ھ) نے اپنی اپنی الاحکام السلطانیہ نام کی کتابوں میں طویل ابواب زکوٰۃ کے فقہی مسائل اور احادیث کے لئے وقف کئے ہیں³²، حالانکہ ان کی کتابیں اسلامی مملکت کے سیاسی نظام کے موضوع پر ہیں۔

ہمارے برصغیر کے آخری دور کے بعض جید فقہاء و محدثین نے اجتہاد کا قدم یہاں تک بڑھایا ہے کہ انہوں نے غیر اسلامی مملکت کے زمین کے ٹیکس (مالگذاری) کی ادائیگی سے زمین کی زکوٰۃ ادا ہو جانے کا فتویٰ دیدیا ہے۔

مولانا عبدالحی لکھنوی (۱۲۶۴ھ-۱۳۰۴ھ) دور آخری کے اسلامی ہند میں علماء کے ایک نامور ترین خانوادہ فرنگی محلی کے آخری فقیہ تھے۔ ان کا فتویٰ یہ ہے کہ:

”ہر کہ در زمین مملوکہ خود بہ آب باران کاشت کرد عشر غلہ برد واجب الاداست، مگر در صورتی کہ خراج زمین مذکورہ بحاکم وقت دادہ شود، در آل وقت عشر ساقط است۔“³³

مشائخ دیوبند کے دور اول میں قاری عبدالرحمن محدث پانی پتی اور شیخ محمد محدث تھانوی ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ یہ دونوں حضرت شاہ محمد اسحاق محدث دہلویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی بھی تحقیق یہ تھی کہ عشری زمین کی سرکاری مالگذاری ادا کرنے سے عشر یعنی زمین کی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے۔³⁴

مولانا عبدالحی لکھنویؒ، مولانا عبدالرحمن پانی پتیؒ اور مولانا شیخ محمد تھانویؒ کے زمانہ میں سرکاری مالگذاری وصول کرنے والی حکومت انگریزوں کی تھی۔ اسے زمین کا ٹیکس ادا کرنے پر زمین کی زکوٰۃ ادا ہو جانا، یقیناً محل نظر ہے۔ چنانچہ دیوبند کے بعد کے دور کے علماء میں مولانا اشرف علی تھانویؒ³⁵ اور مفتی عزیز الرحمن دیوبندیؒ³⁶ نے اپنے اساتذہ کے ان فتوؤں سے اختلاف کیا ہے۔

ہمارے اپنے زمانے میں مفتی عزیز الرحمن دیوبندی کے جانشین مفتی محمد شفیع صاحب کے سامنے مسئلہ کی بالکل مختلف حیثیت ہے۔ بجز اللہ انگریزی تسلط سے ہم نجات پا چکے ہیں۔ ہماری اپنی حکومت ہے جسے ہم نے اسلام کے نام پر حاصل کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومت کو زمین (اور علیٰ ہذا القیاس دیگر اصناف) کا ٹیکس ادا کرنے پر ان کی زکوٰۃ (یا عشر) ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟ مفتی صاحب ممدوح نے اپنی کتاب ”اسلام کا نظام اراضی“ میں اس مسئلہ پر عالمانہ بحث کی ہے۔ زکوٰۃ کے سلسلہ کی مختلف اصطلاحیں ان کی نظر میں ہیں۔ لیکن ان اصطلاحوں میں متقدمین سے لے کر متاخرین تک آتے ہوئے جو رد و بدل ہو تا رہا ہے، اس کا تاریخی سررشتہ چھوڑ دینے کی وجہ سے وہ ان اصطلاحات کے الجھاؤ میں آگئے ہیں۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۵۷ پر وہ لکھتے ہیں:

”عشر اور خراج شریعت اسلام کے دو اصطلاحی الفاظ ہیں۔ ان دونوں میں یہ بات مشترک ہے کہ اسلامی حکومت کی طرف سے زمینوں پر عائد کردہ ٹیکس کی حیثیت ان دونوں میں ہے۔ فرق یہ ہے کہ عشر صرف ٹیکس نہیں، بلکہ اس میں ایک حیثیت عبادت کی بھی ہے اور اسی لئے اس کو زکوٰۃ الارض کہا جاتا ہے اور خراج خالص ٹیکس ہے جس میں عبادت کی کوئی حیثیت نہیں۔“

مفتی صاحب کا یہ ارشاد بجائے، کیونکہ جیسا کہ انہوں نے ص ۱۵۹ پر لکھا ہے: ”عشر مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے اور خراج غیر مسلموں پر۔“

³³ مجموعہ فتاویٰ مولانا محمد عبدالحی فرنگی محلی لکھنوی، ج ۲، ص ۳۱۸ (بحوالہ اسلام کا نظام آراضی از مولانا مفتی محمد شفیع، ادارہ المعارف، کراچی ۱۳۸۳ھ، حصہ اول ص ۱۸۴)

³⁴ ۳۵-۳۴ مداد الفتاویٰ از مولانا اشرف علی تھانوی (مولانا محمد شفیع، کراچی) ۱۳۷۰ھ ج ۲، ص ۵۴

³⁶ عزیز الفتاویٰ، دارالعلوم دیوبند ص ۱۸ (بحوالہ اسلام کا نظام آراضی، حصہ اول ص ۱۸۴)

³¹ صحیح البخاری، ج ۲، ص ۱۳۱ (کتاب الزکاة باب وجوب الزکاة)

³² الاحکام السلطانیة للماوردی - الباب الحادی عشر فی ولاية الصدقات ص ۱۲۱ تا ۱۲۱۰۸ - الاحکام السلطانیة لابن یعلی (مطبع مصطفی البانی، مصری، ۱۹۳۸ء) فصل فی ولاية الصدقات ص ۱۲۰ تا ۱۲۹۹

ظاہر ہے کہ اسلام غیر مسلموں سے اسلامی عبادت کا مطالبہ نہیں کرتا۔ اب اگر مفتی صاحب مدظلہ کے قول کے مطابق زکوٰۃ الارض یعنی عشر صرف ٹیکس نہیں بلکہ اس کی حیثیت عبادت کی بھی ہے، تو اسی طرح زکوٰۃ الاموال بھی ٹیکس ہے جس کی ایک حیثیت عبادت کی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم اوپر واضح کر آئے ہیں کہ مختلف اصناف کی زکوٰۃ کے لئے مختلف دور میں مختلف اصطلاحیں مستعمل رہی ہیں اور اب موجودہ زمانے میں زمین کی زکوٰۃ کو عشر اور اس کے علاوہ بقیہ تمام اصناف کی زکوٰۃ کو زکوٰۃ کہہ دینے سے ان دونوں میں زکوٰۃ کی حیثیت سے بیک وقت ٹیکس اور عبادت دونوں ہونے میں کیا فرق پڑتا ہے؟ لیکن مفتی صاحب صفحہ ۱۵۸ پر تحریر فرماتے ہیں:

”عشر اگرچہ ایک حیثیت سے زمین کی زکوٰۃ اور عبادت ہے، مگر اس میں ایک دوسری حیثیت زمین کے ٹیکس کی بھی ہے۔ اس لئے زکوٰۃ اموال اور عشر میں بھی یہ فرق ہو گیا کہ اموال تجارت اور سونے چاندی کی زکوٰۃ عبادتِ خالصہ ہے اور عشر میں عبادت کی حیثیت بھی ہے، ٹیکس کی حیثیت بھی۔“

لیکن اصطلاحات کے اس الجھاؤ کے باوجود مفتی صاحب بالآخر صحیح نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ ہم ان کے ارشادات (صفحہ ۱۸۳) کا طویل اقتباس درج کرتے ہیں:

”اگر حکومت اسلامی ہے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر حکومت مسلم لوگوں سے زکوٰۃ کے اصول کے مطابق زکوٰۃ کہہ کر وصول کرے اور اس کے مصارف پر خرچ کرنے کا وعدہ کرے، اسی طرح زمینوں کا عشر و خراج اس نام سے اس کے اصول شرعیہ کے موافق وصول کرے اور انہیں کے مصارف پر خرچ کرنے کی پابندی کا اعلان کرے، تو یہ زکوٰۃ یا عشر جو حکومت مسلمہ کو دیا جائے گا، وہ شرعاً زکوٰۃ اور عشر ہی میں شمار ہوگا اور لوگ زکوٰۃ اور عشر کے فریضہ سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ پھر اگر یہ حکومت اس کے مصارف پر خرچ کرنے میں کوئی کوتاہی بھی کرے تو اس کی ذمہ داری عمال حکومت پر رہے گی، ارباب اموال زکوٰۃ و عشر کے فریضہ سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ لیکن حکومت پاکستان اس وقت تک مسلمانوں سے جو انکم ٹیکس وصول کرتی ہے، نہ وہ زکوٰۃ کے اصول پر وصول کیا جاتا ہے، نہ زکوٰۃ کے نام سے لیا جاتا ہے۔ نہ زکوٰۃ کے مصارف میں صرف کرنے کی حکومت پابندی قبول کرتی ہے۔ اسی طرح زمینوں کی جو سرکاری مالگذاری وصول کرتی ہے، نہ ان کو بھی عشر اور خراج کے شرعی اصول کے تحت وصول نہیں کرتی۔ نہ عشر و خراج کہہ کر وصول کرتی ہے، نہ ان کے مصارف میں صرف کرنے کی پابندی کا کوئی اعلان حکومت کی طرف سے ہے۔ اس لئے حکومت مسلمہ کے انکم ٹیکس یا زمین کی سرکاری مالگذاری ادا کر دینے پر بھی زکوٰۃ اور عشر کے فرائض سے سبکدوشی نہیں ہوتی۔ وہ بحالہا۔ بلکہ ارباب اموال پر لازم ہے کہ اپنی زکوٰۃ اور عشر نکالیں اور ان کے مصارف پر بطور خود صرف کریں۔“

جناب مفتی صاحب کے مندرجہ بالا ارشادات کا حاصل یہ ہے کہ حکومت پاکستان کا انکم ٹیکس اور مالگذاری ادا کرنے پر تمام اصناف کی زکوٰۃ (یعنی زکوٰۃ اور عشر) ادا ہو جائے گی لیکن شرط یہ ہے کہ حکومت پاکستان

۱۔ انہیں زکوٰۃ اور عشر کے نام سے وصول کرے۔

۲۔ انہیں اصول شرعیہ کے مطابق وصول کرے۔ اور

۳۔ ان کے مصارف متعینہ پر خرچ کرنے کی پابندی کا اعلان کرے۔

انہیں آخری شرط کے بارے میں مفتی صاحب یہ رعایت دیتے ہیں کہ ”اگر حکومت اس کے مصارف پر خرچ کرنے میں کوئی کوتاہی بھی کرے، تو اس کی ذمہ داری عمال حکومت پر رہے گی، ارباب اموال زکوٰۃ و عشر کے فریضہ سے سبکدوش ہو جائیں گے۔“

الغرض جناب مفتی صاحب کو تمام اصناف کی زکوٰۃ کے اسلامی مملکت کے سرکاری ٹیکس ہونے سے قطعاً انکار نہیں۔ ہماری طرح وہ بھی یہ چاہتے ہیں کہ حکومت پاکستان اپنے ٹیکس اسلامی نام اور اصول کے مطابق وصول اور صرف کرے۔ لیکن اس کی عملی شکل کیا ہو؟ اس کی مروجہ شرح اور اس کے مصارف کے بارے میں مروجہ تعبیرات کی کتاب و سنت کی روشنی میں کیا حیثیت ہے؟ کیا ان مروجہ نظریات پر نظر ثانی کرنے کی کوئی گنجائش ہے؟ کیا ان پر نظر ثانی کئے بغیر زکوٰۃ کا عملی نفاذ ممکن ہے؟ ہم صفات آئندہ میں ان سوالات کے جوابات تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

(۴)

زکوٰۃ کی مروجہ شرح اور قرآن حکیم

قرآن حکیم کی رو سے زکوٰۃ کی شرح شروع ہی سے متعین تھی۔ سورہ المعارج کی سورتوں میں سے ہے۔ اس کی ۳۷ بیسیوں آیتوں میں اللہ اپنے نیک بندوں کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلْسَائِلِ وَالْمَحْرُومِ (المعارج: ۲۴ تا ۲۵)

”اور وہ جن کے مال میں حاجت مندوں اور محروموں کے لئے حق معلوم ہے۔“

اس آیت کا حوالہ دینے کے بعد صاحب سیرۃ النبی علامہ سید سلیمان نے بجاطور لکھا ہے کہ:

”اس آیت سے صاف و صریح طریقے سے یہ ثابت ہے کہ مسلمانوں کی دولت میں غریبوں کا جو حصہ ہے، وہ متعین، مقرر اور عملاً رائج ہے، چنانچہ قرآن پاک میں معلوم اور معلومات کے الفاظ جہاں آئے ہیں،

³⁷ اس سورۃ کی ابتداء سال سائل بعذاب واقع سے ہوتی ہے، اس لئے اسے سورۃ سائل یا سورۃ سائل بھی کہتے ہیں۔ تمام سورت کے کئی ہونے پر صحابی اور تابعی مفسروں کا اتفاق ہے۔ (الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی۔ المطبعہ الموصوئ، مصر، ۸، ۱۲، ص ۱۱-۱۳)

یہی مقصود ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ عرب میں جو قوم کسی نہ کسی طرح زکوٰۃ ادا کرتی تھی، اس کی جو شرح متعین اور رواج پذیر تھی، اس کو اسلام نے کسی قدر اصلاح کے بعد قبول کر لیا تھا۔³⁸

قرآن حکیم نے اسی طرح کے موقع پر اسلام کے پانچویں رکن حج کے بارے میں کہا ہے:

الْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَاتٌ (البقرہ: ۱۹۷) فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ (الحج: ۲۸) ان دونوں مقامات پر معلومات کے معنی ہیں: مشرک عربوں کے نزدیک ”متعین“، ”مقرر“ اور ان کے یہاں عملارائج۔ ”القرآن یفسد بعضہ بعضاً“ کے مسلمہ اصول کی رو سے ”حق معلوم“ کے معنی بھی یہی ہونے چاہئیں، یعنی حق وہ جو مشرک عربوں کے نزدیک متعین، مقرر اور عملارائج تھا۔ لیکن سید صاحب فرماتے ہیں:

”عرب میں اس قسم کی زکوٰۃ صرف بنی اسرائیل ادا کرتے تھے، جس کا حکم توراۃ میں مذکور ہے اور اس کی شرح بھی اس میں مقرر ہے۔ یعنی پیداوار میں سے دسواں حصہ اور نقد میں سے نصف مثقال۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی حکمت ربانی سے اجناس زکوٰۃ پر مختلف شرحیں مقرر فرمائیں، جو قیمت کے لحاظ سے اسی ”شرح معلوم“ کے مساوی ہیں اور شرحوں کو فرامین کی صورت میں لکھوا کر اپنے عمال کے پاس بھیج دیا، یہی تحریری فرامین تدوین حدیث کے زمانے تک بعینہ محفوظ تھے اور تدوین حدیث کے بعد ان کو بعینہ کتب حدیث میں درج کیا گیا، جو آج موجود ہیں۔“³⁹

سید صاحب کی اس تحقیق سے چند در چند اشکال پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ چونکہ یہ آیت مکی ہے، اس لئے سید صاحب کی تحقیق کو تمام مان لیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے زکوٰۃ کی مروجہ شرح مکہ ہی میں متعین ہو چکی تھی۔ حالانکہ سید صاحب خود ہی عبارت مندرجہ بالا میں ان شرحوں کے تعین کو ان فرامین سے متعلق بتا رہے ہیں، جو آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے بعد قبائل عرب کو ارسال فرمائے تھے اور عبارت مندرجہ بالا سے قبل وہ خود یہ تحریر فرما چکے ہیں کہ:

”مدینہ منورہ میں آکر جب مسلمان کو کسی قدر اطمینان ہوا اور انہوں نے کچھ اپنا کاروبار شروع کیا تو روزہ کے ساتھ ساتھ ۲ھ میں صدقۃ الفطر واجب ہوا۔ (الطبری۔ ج ۱، ص ۱۲۸) اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کی گئی۔ انہوں نے دریافت کیا: یا رسول اللہ! ہم کیا خیرات کریں؟ وَیَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ (البقرہ: ۲۷) (وہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خیرات کریں؟) ارشاد ہوا قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ: ۲۷) ”کہہ دو (اے پیغمبر!) کہ تمہاری ضرورت سے جو کچھ بچ رہے (اس کو خیرات کرو!)“

یہ زکوٰۃ کی تعین کی راہ میں اسلام کا پہلا قدم ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ جو کچھ بچے، وہ خدا کی راہ میں خیرات کریں، آئندہ کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھیں۔ (صحیح بخاری منہج البخاری ج ۲ ص ۲۱۶)⁴⁰

۲۔ یہود مکہ میں آباد نہیں تھے۔ اس لئے زکوٰۃ کی کسی شرح کو جو صرف بنی اسرائیل میں رائج ہو، مکی آیت میں شرح ”معلوم“ بتانا قرآن حکیم کے طرز بیان کے قطعاً خلاف ہے۔

۳۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ اسلام کا چوتھا رکن روزہ عرب جاہلیت میں عموماً رائج نہ تھا لیکن یہودیوں میں یوم عاشورہ کے روزہ کی پابندی تھی اور ان کی دیکھا دیکھی قریش مکہ بھی اس دن کاروزہ رکھ لیتے تھے۔⁴¹ چنانچہ قرآن نے اس موقع پر معلوم کی صفت استعمال نہیں کی بلکہ یہ صراحت فرمادی کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ (البقرہ: ۱۸۳)

”تمہارے لئے روزہ لکھا گیا، جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں کے لئے لکھا گیا تھا۔“

اگر زکوٰۃ کی قرآنی شرح یہودی شرح کے مساوی یا اس سے ملتی جلتی ہوتی تو قرآن نے روزے کی فرضیت کے لئے اپنے مخاطبوں کو جس طرح آمادہ کیا تھا، اسی طرح زکوٰۃ کی حکمت بھی بیان فرماتا۔ لیکن اگر حج کی طرح زکوٰۃ کی بنیاد بھی اہل مکہ کے عام رواج پر تھی، جیسا کہ آیت زیر غور سے ظاہر ہوتا ہے، تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ اہل مکہ کی اس مروجہ زکوٰۃ کی نوعیت کیا تھی؟ اس کی شرح معلوم کیا تھی؟

قرآن حکیم نے زکوٰۃ کے لئے یہاں لفظ حق استعمال کیا ہے۔ یہ سامی زبان کا قدیم لفظ ہے۔ عبرانی زبان میں اس کے معنی ہیں: ”To fix by decree“ ”To prescribe“ یعنی حکماً متعین و مقرر کرنا۔ تجویز کرنا۔⁴² حبشی زبان میں ان معانی کے علاوہ یہ معنی بھی ہیں: حد، پیمانہ، قانون۔⁴³ عربی زبان میں اس کے وسیع الذیل مختلف ثانوی معانی میں سے جو معنی ان سامی مفاہیم سے قریب ترین ہے، وہ حکماً مقرر کردہ واجبات، یعنی ٹیکس ہیں۔ عرب جاہلیت کے شاعر جابر بن حنی نے اسے اس معنی میں استعمال کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

یومالدى الحشاد من یلو حقه۔ یینزیوینزع ثوبه ویلطم⁴⁴

”وہ دن جبکہ ٹیکس دینے میں ذرا سی دیر کرنے والے کو ٹیکس جمع کرنے والے کے آگے جھنجھوڑ کر رکھ دیا جاتا ہے، اس کے کپڑے اتار لئے جاتے ہیں اور اسے تمانچے مارے جاتے ہیں۔“

اسی معنی میں حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: فان الزکاة حق المال۔ یہاں اگر لفظ حق کی اضافت المال کے

⁴⁰ ایضاً، ص ۱۵۷۔

⁴¹ منہج امام احمد بن حنبل، ج ۶ ص ۲۴۴۔

⁴² Brown Driver Briggs: Hebrew lexicon, pp 349ff بحوالہ انسائیکلو پیڈیا آف (انگریزی) مقالہ عنوان HAKK

⁴³ Dillmann: Lexicon linguae Aethicae, lipsiae, 1865, vol. 1, p. 131

⁴⁴ الفضلیات (آکسفورڈ، ۱۹۲۱ء) ص ۲۶۶

³⁸ سیرۃ النبی (مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۳۵ء) ج ۵، ص ۱۶۱

³⁹ ایضاً، ج ۵، ص ۱۶۱

بجائے اللہ یا العباد وغیرہ کی طرف ہوتی، تو ٹیکس سے ہٹ کر عام اخلاقی حق کے معنی لئے جاسکتے تھے۔ اسی معنی میں آنحضرت ﷺ سے حضرت فاطمہ بنت قیسؓ نے یہ حدیث روایت کی ہے:

لیس فی المال حق سوى الزکوة⁴⁵ ”دولت پر زکوٰۃ کے سوا کوئی ٹیکس نہیں۔“

اسی حدیث کی بنا پر اسلام کے مالیاتی نظام اور سیاست مملکت کے موضوعات پر لکھنے والے آئمہ متقدمین نے واضح کر دیا ہے کہ مسلمانوں سے جتنے ٹیکس لئے جاسکتے ہیں، وہ زکوٰۃ میں شامل ہیں۔ امام یوسفؒ کی کتاب الخراج کا اقتباس اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ امام ماوردیؒ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کے علاوہ مسلمانوں پر کوئی ٹیکس نہیں:

ولا یجب علی المسلم فی مالہ حق سواہا۔ قال رسول اللہ ﷺ: لیس فی المال حق سوى الزکوة⁴⁶

”مسلمان کے دولت پر سوائے زکوٰۃ کے کوئی ٹیکس واجب نہیں ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ مال پر سوائے زکوٰۃ کے کوئی ٹیکس نہیں۔“

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زمانہ قبل اسلام کے اس مقرر اور متعین اور عملاً رائج حق یعنی ٹیکس یا زکوٰۃ کی شرح کیا تھی؟ اس کا سراغ ہمیں کسی حد تک حلف الفضول نامی معاہدہ کی دفعات سے ملتا ہے۔

حلف الفضول میں شرکت آنحضرت ﷺ کی بعثت سے قبل کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے۔ فجار کی جنگ کے بعد تمام عرب اور بالخصوص قریش مکہ مسلسل خانہ جنگی سے اکتا گئے تھے۔ ان کی تجارت کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ معاشرہ میں اخلاقی بحران پیدا ہو گیا تھا، ان حالات میں ایک چھوٹے سے واقعہ نے زبیر بن عبد المطلب اور عبد اللہ بن جدعان کو اصلاح احوال پر آمادہ کیا۔ ان میں سے زبیر بن عبد المطلب اس وقت بنو ہاشم کے سردار تھے اور رسول اللہ ﷺ کے حقیقی تایا۔ عبد اللہ بن جدعان قبیلہ بنو تمیم کے سردار تھے۔ اور عربوں میں اپنی سخاوت اور دانائی کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے تھے۔ ان دونوں سرداروں کی قیادت میں بنو ہاشم، بنو زہرہ اور بنو تمیم نے آپس میں ایک معاہدہ کیا، جس کی دفعات یہ تھیں:

ان لا یجدوا بکفة مظلومًا من اہلہا وغیرہم مبن دخلہا من سائر الناس الا قاموا معہ وکانوا علی من ظلمہ حتیٰ ترد علیہ مطلبہ⁴⁷ لننکون مع المظلوم (المحروم؟) حتیٰ یؤدی الیہ حقہ ما بل بحر صوفۃ⁴⁸ وفی التاسی فی المعاش⁴⁹ ان ترد الفضول علی اہلہا والایعز ظالم مظلومًا⁴⁹

⁴⁵ سنن ابن ماجہ (مع شرح مفتاح الحاج، مطبع، صحیح، کتب وندار) ص (ابواب الزکوة باب ۳ مادی زکاتہ فلیس بکنز)

⁴⁶ الاحکام السلطانیۃ، ص ۱۰۹ تا ۱۰۸۔ بعض احادیث میں اس کے بالکل برخلاف مضمون مروی ہے۔ ان بظاہر بالکل متضاد احادیث میں تطبیق کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ احادیث تحولہ بالا میں الزکوة اپنے اصلی قرآنی مفہوم میں مستعمل ہے اور اس کی مخالف احادیث میں الزکوة سے مروجہ شرح والی زکوٰۃ مراد ہے۔ زکوٰۃ کی اصطلاح میں ”ارتقا“ کا اثر مجموعہ احادیث و آثار پر پڑنا ناگزیر تھا۔

⁴⁷ میرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۳۵

⁴⁸ طبقات ابن سعد، ج ۱، ص ۸۲۔

⁴⁹ الروض الانف، مکتبۃ مصطفیٰ الباقی، مصر، ۱۳۳۰ھ ج ۱ ص ۹۱، بحوالہ مستند حارث بن محمد بن ابی اسامۃ التونی ۲۸۲ھ

”اگر معاہدہ کنندگان مکہ کے کسی شہری کو یا دنیا کے حصے سے کسی مکہ آنے والے کسی شخص کو مظلوم پائیں گے تو اس کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے اور ظالم کے سر پر رہیں گے، تاوقتیکہ وہ زبردستی لی ہوئی چیز مظلوم کو لوٹا نہ دے۔ معاہدہ کنندگان ابد الابد تک مظلوم کا ساتھ دیں گے، تاوقتیکہ اس کے واجبات ادا نہ ہو جائیں اور معیشت میں باہمی شرکت کے ہمیشہ حامی رہیں گے۔ معاہدہ کنندگان اس کا ذمہ لیتے ہیں کہ ضرورت سے فاضل دولت مستحقین کو لوٹا دی جائے اور یہ کہ کوئی ظالم کسی مظلوم پر زبردستی نہ کرے۔“

اس معاہدہ کی روح اس جملہ میں ہے: وفی التاسی فی المعاش۔ التاسی یا التاسی کے معنی اہل لغت نے یہ دیئے ہیں: البشارکۃ والمساہبۃ فی الرزق والمعاش⁵⁰ ”رزق و معیشت میں باہمی اشتراک اور مل کر حصہ بانٹنا۔“

معاشی زندگی میں باہمی اشتراک کے اس اعلیٰ منصوبہ پر عمل صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے، جب کہ معاشرہ کے دولت مند افراد اپنی ضرورت سے فاضل دولت کو معاشرہ کے نسبتاً محروم و مظلوم افراد کا حق سمجھیں اور معاہدہ کے اپنے الفاظ ”یہ فاضل دولت اس کے اصلی مستحقوں کو لوٹا دیں۔“ (ترد الفضول علی اہلہا) چونکہ معاہدہ کی عملی دفعات میں سب سے اہم دفعہ یہی تھی، اسی لئے امام سہلیؒ اور امام کلاعیؒ کے قول کے مطابق یہ معاہدہ حلف الفضول یعنی فاضل دولت کا معاہدہ کہلایا۔⁵¹ بعض روایتوں میں اس معاہدہ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں قیاس آرائی کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ شاید اس معاہدہ کے بانی الفضل، فضال اور الفضیل یا ایک اور روایت کی رو سے فضیل بن حرث، فضیل بن وداعہ اور مفضل یا ایک تیسری روایت کی رو سے الفضل بن فضالہ، الفضل بن وداعہ اور فضیل بن الحرث یا ایک چوتھی روایت کی رو سے الفضیل بن وداعہ اور الفضل بن قضاۃ نام کے کوئی تین بزرگوار تھے، جن کے ناموں پر یہ معاہدہ حلف الفضول کہلایا۔

⁵² لیکن یہ محض ادبی لطیفہ معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ان ہی روایات کی رو سے اس معاہدہ کے قائدین زبیر بن عبد المطلب اور عبد اللہ بن جدعان تھے۔⁵³ اور اگر معاہدہ کے بانی فی الواقع یہی تین اصحاب تھے، تو تعجب کی بات ہے کہ عرب جاہلیت کے اتنے بلند خیال اصحاب فضیلت کے بارے میں ان روایات نے مثبتہ ناموں کے سوا کوئی یادداشت محفوظ نہیں رکھی۔ علاوہ ازیں یہ امر قطعاً ناقابل فہم ہے کہ زبیر بن عبد المطلب اور عبد اللہ بن جدعان جیسے سرداروں کے رہتے ہوئے، جنہوں نے حرب فجار میں ان کی قیادت کی تھی،⁵⁴ بنو ہاشم اور بنو تمیم نے کسی اور شخص کی حلف الفضول جیسے اہم معاہدہ میں سرداری کیونکر مان لی۔

عرب قبل اسلام کے اس اہم ترین معاہدہ کے ترتیب دیئے جانے کے وقت آنحضرت ﷺ بیس

⁵⁰ تاج العروس ولسان العرب۔ مادہ أسو۔

⁵¹ الروض الانف، ج ۱ ص ۹۱۔ کتاب الاستفتاء کلبۃ الآداب، الجزائر ۱۹۳۱ء ص ۱۳۶

⁵² کتاب الاستفتاء ص ۱۳۸۔ الروض الانف، ج ۱ ص ۹۱

⁵³ ایضاً

⁵⁴ کتاب المحبر لابن حبیب، دائرة المعارف العشمانیۃ، حیدرآباد (دکن)، ۱۳۱۶ھ ص ۱۲۹ تا ۱۷۰

برس کے تھے۔ یعنی مقدس ترین کاروانِ حیات نبوت کی منزل مقصود کی طرف نصف سفر طے کر چکے تھے۔ آپ اس معاہدہ میں اپنی شرکت پر بہت نازاں و فرحان تھے۔ عہد نبوت میں فرمایا کرتے تھے کہ اس معاہدہ کے مقابلہ میں اگر کوئی مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ (جو عرب کی محبوب ترین دولت میں سے ہے) بھی دیتا تو میں اس سے ہرگز منحرف نہ ہوتا۔ اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لئے اگر کوئی بلائے تو میں حاضر ہوں۔⁵⁵ اس معاہدہ کی بدولت بعثت سے قبل کے بیس سال امنِ امان کے مل گئے، عربوں کی قبائلی خانہ جنگی کے اس طرح موقوف ہو جانے سے اسلام کی اشاعت میں جو مدد ملی، وہ ظاہر ہے۔

ضرورت سے فاضل دولت کے ناداروں کا حق ہونے کا اعلیٰ اخلاقی تصور عربوں کے اندر اس دور میں پایا جانا جسے دورِ جاہلیت کہا جاتا ہے، حیرت انگیز ضرور ہے لیکن خلاف قیاس ہرگز نہیں، کیونکہ عرب قبل اسلام کی اخلاقی پستی کے بارے میں خواہ کچھ ہی کہا جائے، اس سے ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سخاوت کا جو ہر ان میں بدرجہ اتم تھا۔ شریف اور سخی دونوں کے لئے ان کی لغت میں ایک لفظ تھا: کریم اور اسی طرح بخیل اور کمینہ کے لئے ایک لفظ تھا: لعیم۔ ان کی شاعری میں شجاعت کے بعد جس اخلاقی صفت پر سب سے زیادہ فخر نظر آتا ہے، وہ یہی سخاوت ہے۔ بعثت اسلام کے وقت مکہ کے قریش کے اندر یہ جذبہ کمزور پڑ گیا تھا۔ ہاشم بن عبد المناف اور ان کے بھائیوں نے بین الاقوامی تجارت کو منظم کر کے اس پر قریش کی اجارہ داری قائم کر دی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکہ کے کچھ خاندانوں میں دولت کی جس قدر زیادتی ہوتی گئی، اسی قدر غنائے قلب کی کمی ہوتی گئی، اسی لئے قرآن حکیم کی ملی آیات میں ان اصحاب ثروت کے حرص و آرز اور بخل و تنگ دلی پر بار بار سخت تہدید ہے۔ قریش کے ان دولت مند تاجروں میں سے جن کے اندر سخاوت کا جذبہ باقی رہ گیا تھا، وہ بھی خلوص کی دولت سے محروم تھے۔ وہ داد و دہش کرتے تھے، محض دکھاوے کے لئے (رِثَاءَ لِلنَّاسِ) اور بیچارے غریبوں پر اپنا احسان جتانے اور انہیں طعن و تشنیع کی افیت پہنچانے کے لئے (بِالْبَنِّ وَالْإِذَى)۔

رسول اللہ ﷺ اس صورت حال کی مکمل اصلاح چاہتے تھے۔ وہ ایسی امت کی تربیت کرنا چاہتے تھے جو اپنا تن من، دھن، سب کچھ نیکی کے راستہ میں لٹا دے اور جس کی شان یہ ہو کہ:

إِنَّ اللَّهَ اشْتَوَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبہ: ۱۱۱)

”بے شک اللہ نے ایمان والوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لئے ہیں کہ ان کے بدلہ میں ان کے لئے جنت ہے۔“

جو دوسروں پر احسان کر کے ان سے شکریہ تک کے طالب نہ ہو، بلکہ زیر دستوں کو روزی بہم پہنچا کر ان سے یہ کہتے ہوں کہ:

إِنَّمَا نُنْطَعِبُكُمْ لَوْ جِهَ اللَّهُ لَا تُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (الدھر: ۹۰)

”ہم تمہیں محض اللہ کی خوشنودی کے لئے روزی دیتے ہیں، نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں، نہ شکریہ۔“ رسول اللہ ﷺ نے بعثت سے بیس سال قبل جس معاہدہ میں شرکت فرمائی تھی، اس کی بنیادی دفعہ یہ تھی کہ ان تردد الفضول علی اہلہا ”فاضل دولت اس کے اصلی مستحقوں کو لوٹا دی جائے گی۔“ اب بعثت کے بعد نیکی کی راہ میں خرچ کرنے کی اس سے کم شرح کا تعین کیونکر ممکن تھا؟ چنانچہ ایمان والوں کے لئے قرآن حکیم نے انفاق کی جو شرح مقرر فرمائی ہے وہ یہ ہے:

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ: ۲۱۹)

”اور یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں؟ تو کہہ دیجئے کہ جو ضرورت سے بچ رہے۔“ العفو کے معنی کے بارے میں بعض مفسروں نے کچھ شبہات پیدا کئے ہیں، لیکن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت قتادہؓ، حضرت عطاءؓ، حضرت سدقؓ، حضرت حسنؓ جیسے سربر آوردہ صحابی اور تابعی مفسروں کے نزدیک اس کے معنی ہیں: الفضل، یعنی جو ضرورت سے فاضل ہو۔⁵⁶ اسی لئے حضرت شاہ عبد القادرؒ نے اپنی پرانی اردو میں اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

”اور پوچھتے ہیں تجھ سے کیا خرچ کریں؟ تو کہہ جو افزود ہے۔“

اپنی ضرورت سے زیادہ مال سینت کر رکھنا اور اسے راہِ خدا میں خرچ نہ کرنا، مسلمان کی نہیں بلکہ یہودیوں کی خصلت تھی۔ (جن کی شرح زکوٰۃ کا ذکر سید سلیمان ندویؒ نے تفصیل سے کیا ہے۔⁵⁷) ان کے اس خصلت پر خدا نے ان الفاظ میں سخت وعید فرمائی تھی:

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ۔ يَوْمَ يُجْعَلُونَ عَلَيْهِمْ فِي نَارٍ جَهَنَّمَ فُتُكُوٰى بِهَا جَبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَٰذَا مَا كُنْتُمْ لَا تُفْسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ (توبہ: ۳۴-۳۵)

ان ہی آیتوں کی رو سے صحابہؓ اور تابعین کے اس منتخب گروہ نے جسے مؤرخین نے اصحابِ زہد کا نام دیا ہے اور جن کے سرخیل حضرت علیؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ تھے، مروجہ شرح زکوٰۃ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ان میں سے مؤخر الذکر تو اس شرح زکوٰۃ کو شرعی سمجھنے والے کو عذابِ آخرت سے ڈراتے تھے۔

⁵⁶ تفسیر الطبری (بلاق، ۱۳۲۳ھ ج ۲، ص ۲۱۳)

⁵⁷ سیرۃ النبی - ج ۵ ص ۱۴۹، ص ۱۶۵، ص ۱۶۷

⁵⁵ طبقات ابن سعد، ج ۱، ص ۸۲ - المستدرک للحاکم، دائرة المعارف العشمانية، حیدرآباد (دکن) ۱۳۲۰ھ ج ۲ ص ۲۲۰

نفع و نقصان میں شرکت کا معاملہ اور اس کی شرعی حیثیت

بلا سود بینکاری پر اسلامی نظریاتی کونسل کی جو رپورٹ شائع ہوئی ہے، اس کے متعلق کونسل کے ایک محترم رکن مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے اپنے ایک مضمون کے آخر میں جو متعدد اخبارات اور رسائل میں شائع ہوا، لکھا ہے: ”آخر میں ہم ملک کے ان علماء سے جو خاص طور پر فقہ میں بصیرت رکھتے ہیں، یہ گزارش کرتے ہیں کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے جو رپورٹ غیر سودی بنکاری کے سلسلے میں شائع کی ہے، اس کا بنظر غائر مطالعہ فرما کر اس کا شرعی نقطہ سے جائزہ لیں، ظاہر ہے کہ یہ رپورٹ اس معاملے میں حرف آخر نہیں ہے، اس میں اب بھی علمی و فقہی خامیاں ہو سکتی ہیں، اس لئے یہ علماء کا فریضہ ہے کہ اس کا جائزہ لے کر ضروری ہو تو اس میں اصلاحات تجویز فرمائیں۔“

بحمد اللہ مجھے بھی اس تاریخی رپورٹ کے بنظر غائر مطالعے اور شرعی نقطہ نظر سے اس کے جائزے کا موقع ملا اور یہ مضمون اسی ادائے فرض کی معمولی سی کوشش ہے۔ اللہ کرے یہ مفید ثابت ہو! اس مضمون میں میرا مقصد رپورٹ میں تجویز کردہ ان معاملات سے بحث کرنا نہیں جن سے کونسل کے علماء کرام خود بھی خوش نہیں اور جو خاصے متنازع فیہ ہیں، بلکہ صرف اس معاملہ سے بحث کرنا ہے جو بقول کونسل سود کا نعم البدل اور مثالی معاملہ ہے اور جو اس رپورٹ میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے، اس معاملے سے میری مراد نفع و نقصان میں شرکت کے معاملہ کو جس صورت و شکل سے تجویز فرمایا گیا ہے، اس صورت و شکل کے لحاظ سے یہ اپنی قسم کا ایک نیا اور نوکھا معاملہ ہے جس کا گذشتہ چودہ سو سالہ فقہی لٹریچر میں کہیں نشان پتہ نہیں ملتا، گویا یہ پندرہویں صدی ہجری کا خاص تحفہ ہے جو مسلمانان پاکستان کو ملا۔ اس معاملے کو میں نے اپنی قسم کا ایک نیا اور نوکھا معاملہ اس لئے کہا ہے کہ یہ اپنی بناوٹ و ساخت اور اپنی ماہیت و حقیقت کے اعتبار سے نہ شرکت کا معاملہ ہے اور نہ مضاربت کا معاملہ، جن کا قرآن و حدیث اور فقہ میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان اور جن کی شرعی حیثیت معلوم اور متعین ہے، یعنی یہ کہ بالاتفاق جائز ہیں۔

اس بات کی وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ ایک طرف معاملہ زیر بحث کی شکل و صورت واضح طور پر

سامنے ہو اور دوسری طرف معاملہ شرکت اور معاملہ مضاربت کی وہ صورت و شکل متعین طور پر پیش نظر ہو جو کتب فقہ میں مذکور ہے، لہذا پہلے معاملہ زیر بحث کی شکل واضح کی جاتی ہے جو اسلامی نظریاتی کونسل نے تجویز فرمائی ہے اور وہ یہ کہ اس میں ایک فریق کا محض سرمایہ ہوگا، اس کے ساتھ اس کا کوئی کام و عمل نہ ہوگا، دوسرا فریق اس سرمائے کے ساتھ کوئی معاشی کاروبار کرے گا، کاروبار میں نفع ہوگا تو اس میں بھی دونوں شریک ہوں گے اور نقصان ہوگا تو اس میں بھی دونوں شریک ہوں گے۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۹۸۱ء سے قومی بینکوں میں جو شرکتی کھاتے کھولے جارہے ہیں اس معاملہ کی عملی شکلیں ہیں، جو شخص شرکتی کھاتہ کھولتا ہے اس کا بغیر کسی کام و عمل کے محض سرمایہ ہوتا ہے جو بینک کو اس غرض سے دیتا ہے کہ بینک اس کو کسی کاروبار میں لگا کر نفع حاصل کرے اور اس کا ایک حصہ کھاتہ دار کو بھی دے اور یہ کہ بینک کو یہ اختیار ہے کہ وہ اس جمع شدہ سرمائے کے ساتھ خود کوئی کاروبار کرے یا کسی کاروباری ادارے کو نفع و نقصان میں شرکت پر دیدے۔ چنانچہ بینک اگر کسی کاروباری ادارہ کو وہ سرمایہ دیتا ہے تو پھر اس کا بھی سوائے اس کے کوئی کام و عمل نہیں ہوتا ہے کہ وہ کھاتہ داروں سے رقوم لیتا ہے اور کاروباری اداروں کو دیتا اور اس کا اور اس کے نفع و نقصان کا پورا حساب کتاب رکھتا ہے جو یقیناً قابل معاوضہ کام و عمل ہے لیکن ظاہر ہے کہ خرید و فروخت وغیرہ کا تجارتی کام و عمل نہیں۔

غالباً اس تحریر سے معاملہ زیر بحث کی نظری و عملی شکل آپ کے سامنے اچھی طرح واضح ہو گئی ہوگی۔ اب معاملہ شرکت کی شکل و صورت ملاحظہ فرمائیے، چونکہ معاملہ شرکت یعنی شرکت العقود کی فقہ حنفی میں بنیادی طور پر تین قسمیں ہیں: شرکت اموال، شرکت ابدان اور شرکت وجوہ، لہذا تینوں کی الگ الگ تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

پہلی قسم یعنی شرکت اموال کی شکل یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ تجارت پیشہ اشخاص اپنا اپنا سرمایہ یکجا کر کے یہ طے کرتے ہیں کہ وہ آپس میں مل کر تجارتی کاروبار کریں گے اور نفع و نقصان دونوں میں شریک رہیں گے۔

دوسری قسم یعنی شرکت ابدان جسے شرکت اعمال اور شرکت صنائع بھی کہا جاتا ہے، اس کی شکل یہ ہے کہ دو یا دو سے زائد ارباب ہنر و پیشہ اور اصحاب صنعت و حرفت جیسے بڑھئی، لوہار اور درزی وغیرہ آپس میں مل کر تجارتی کاروبار کریں گے اور نفع و نقصان میں شریک رہیں گے۔

تیسری قسم یعنی شرکت وجوہ کی شکل یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ اشخاص جن کے پاس نہ اپنا سرمایہ ہوتا ہے اور نہ کوئی ہنر و پیشہ بلکہ صرف وجاہت اور ساکھ ہوتی ہے جس کی وجہ سے لوگ ان پر اعتماد کرتے اور

بلا جھک ان کو ادھار مال دے دیتے ہیں، ایسے اشخاص آپس میں یہ طے کرتے ہیں کہ ادھار لین دین سے تجارت کریں گے اور نفع و نقصان میں شریک رہیں گے۔

پھر شرکت کی ان تینوں قسموں میں اگر شرکاء کے درمیان تمام متعلقہ امور میں برابری اور مساوات ہوتی ہے تو اس کا نام شرکت مفادضہ ہے اور اگر مساوات نہیں ہوتی بلکہ کمی و بیشی کی گئی ہوتی ہے تو اس کا نام شرکت عنان ہے۔

شرکت کی مختلف قسموں اور شکلوں کی جو یہ تفصیل پیش کی گئی ہے، اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ شرکت کی ہر قسم اور ہر شکل میں مال، وجاہت اور ہنر کے ساتھ ساتھ ہر فریق کا کام و عمل ہونا بھی ضروری ہوتا ہے، گویا کہ کام و عمل شرکت کی ماہیت کا جزو لا ینفک ہے اور بدیہی طور پر اس کی تعریف میں داخل ہے۔ لہذا جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ شرکت میں ہر شریک کا کام و عمل ضروری نہیں، وہ ایک بدیہی چیز کا انکار کرتے ہیں جو شرکت کو مضاربت سے ممیز کرتی ہے۔ اور چونکہ معاملہ زیر بحث کی مجوزہ شکل میں ایک فریق کا سرے سے کوئی کام و عمل نہیں ہوتا صرف سرمایہ ہوتا ہے یعنی شراکتی کھاتے دار کا محض سرمایہ ہوتا ہے، لہذا یہ معاملہ فقہاء کے معاملہ شرکت کی تعریف میں نہیں آتا جس کے اندر ہر فریق کا تجارتی یا صنعتی کام و عمل ہونا بھی ضروری ہے جو دراصل جواز نفع کی بنیاد ہے، علاوہ ازیں چونکہ زیر بحث معاملہ میں یہ ضروری نہیں کہ کام کرنے والے فریق کا اپنا سرمایہ بھی شریک کا روبرو ہو حالانکہ معاملہ شرکت میں ایسا ہونا ضروری ہے، لہذا اس لحاظ سے بھی زیر بحث معاملہ شرکت کی تعریف سے خارج ہو جاتا ہے۔

اب معاملہ مضاربت کو لیجئے جس کی شکل یہ ہے کہ ایک فریق اپنا سرمایہ دوسرے کو تجارت کے لئے دیتا ہے اور ان کے درمیان یہ طے پاتا ہے کہ اگر نفع ہو گا تو مقررہ نسبتی حصہ کے مطابق دونوں اس کے حقدار ہوں گے اور نقصان ہو گا تو وہ متاثر سرمایہ والا فریق برداشت کرے گا، بلفظ دیگر فقہاء کے نزدیک مضاربت وہ معاشی معاملہ ہے جس میں ایک فریق کا صرف سرمایہ اور دوسرے فریق کا فقط کام و عمل ہوتا ہے، نفع ہو تو دونوں نسبتی حصہ کے مطابق اس میں شریک ہوتے ہیں اور دونوں کو حصہ ملتا ہے اور اگر تجارت میں نقصان ہو تو وہ سب کا سب سرمایہ والے فریق کو برداشت کرنا پڑتا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ نفع کی صورت میں وہ نفع کے ایک حصہ کا حقدار قرار پاتا ہے۔

اور چونکہ معاملہ زیر بحث میں جس کا نام ہی نفع و نقصان میں شراکت کا معاملہ ہے، کہ کام کرنے والے فریق کو نفع کی طرح نقصان میں بھی شریک ٹھہرایا گیا ہے یعنی اگر کاروبار میں نقصان ہو جائے تو سرمائے والے فریق کی طرح کام و عمل کرنے والا فریق بھی اس میں شریک ہو گا، لہذا یہ مضاربت کی تعریف میں بھی نہیں آتا۔ اسی طرح چونکہ معاملہ زیر بحث میں یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ شراکتی کھاتوں کی رقم تجارت کی طرح

صنعت میں بھی لگائی جاسکتی ہے جبکہ مضاربت کا سرمایہ صرف تجارت میں لگایا جاسکتا ہے صنعت میں نہیں لگایا جاسکتا۔ اسی طرح معاملہ زیر بحث میں یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ حاصل ہونے والا نفع دوران معاملہ سال میں دو دفعہ تقسیم کیا جائے گا حالانکہ مضاربت کا منافع صرف اس وقت تقسیم کیا جاسکتا ہے جب معاملہ ختم ہوتا ہے، لہذا ان دو پہلوؤں سے بھی معاملہ زیر بحث معاملہ مضاربت کی تعریف سے خارج ہو جاتا ہے۔

پھر جب یہ معاملہ نہ شرکت کا معاملہ ہے اور نہ مضاربت کا معاملہ تو ظاہر ہے کہ اس کے جواز کے وہ دلائل نہیں ہو سکتے جو قرآن، حدیث اور فقہ میں شرکت اور مضاربت کے جواز کے لئے ہیں، لہذا پوچھا جاسکتا ہے کہ اس معاملہ کے جواز کے لئے قرآن و حدیث میں جو دلائل ہیں وہ کیا ہیں؟ کیونکہ کسی معاملہ کو اسلام کی رو سے جائز یا ناجائز کہنا اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب قرآن و حدیث اور کتاب و سنت سے اس کا ثبوت فراہم ہوتا ہو، اس لئے کہ احکام کا اصل منبع و سرچشمہ قرآن حکیم اور سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔ جہاں تک فقہ کا تعلق ہے، وہ بھی اگرچہ کتاب اور سنت رسول اللہ ہی سے ماخوذ ہے لیکن اس میں اجتہادی مسائل سے متعلق فقہاء کرام کے مختلف اقوال ہیں جو سب کے سب صحیح نہیں بلکہ بعض ان میں سے صحیح اور بعض غیر صحیح، بعض خطا اور بعض صواب ہیں، کیونکہ مجتہد کی رائے خطا بھی ہوتی ہے اور صواب بھی: ”الجبتہد یخطی ویصیب۔“ لہذا کسی فقیہ کا ایسا قول جو کتاب و سنت سے مطابقت نہ رکھتا ہو، ناقابل اعتبار ہوتا ہے۔ بنا بریں ضروری ہے کہ معاملہ زیر بحث کے جواز کے لئے جو دلائل پیش فرمائے جائیں، وہ واضح طور پر قرآن و حدیث سے تعلق رکھتے ہوں، اگر فقہاء کے اجتہادی اقوال پیش کئے جائیں تو وہ قرآنی آیات اور احادیث نبویہ بھی ان کے ساتھ پیش کی جائیں جن سے ان اقوال کا استدلالی تعلق ہے، تاکہ عقل رکھنے والے یہ سمجھ سکیں کہ ان آیات و احادیث سے وہ اقوال مستنبط و مستخرج ہوتے ہیں یا نہیں۔

مثلاً کسی فقیہ کا یہ قول کہ معاملہ شرکت کے شرکاء میں سے ہر شریک کے لئے عمل تجارت یا عمل صنعت میں حصہ لینا ضروری نہیں، بعض کا سرمایہ ہی کافی ہے۔ تو چونکہ یہ قول قرآن و حدیث سے مطابقت نہیں رکھتا، اس لئے کہ قرآن و حدیث میں شرکت عقد کے متعلق جو نصوص ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معاملہ شرکت ہوتا ہی وہ ہے جس میں اموال کے ساتھ ہر شریک کا عمل بھی موجود ہو، لہذا ایسا قول ناقابل اعتبار ہو گا۔

بہر حال جن حضرات نے معاملہ زیر بحث تجویز کیا اور اسے از روئے اسلام جائز بتلایا ہے، ان کی ذمہ داری ہے کہ قرآن و حدیث سے وہ دلائل پیش فرمائیں جو اس کے جواز پر دلالت کرتے ہیں۔

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ بلا سود بنکاری کے متعلق اسلامی نظریاتی کونسل کی جو رپورٹ شائع ہوئی ہے، اس کے صفحہ سترہ پر زیر بحث معاملہ کے جواز میں بطور دلیل قرآن مجید کی یہ آیت نقل کی گئی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (النساء: ۲۹)

”اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو، تو مضائقہ نہیں۔“

اس ترجمہ کے بعد رپورٹ مذکورہ میں لکھا ہے کہ: ”یہ آیت واضح طور سے بتلاتی ہے کہ کسی کا مال ناجائز طریقے جیسے سود، قمار یا دھوکہ سے ہتھیانا حرام ہے، اس کے برعکس باہمی رضامندی اور منصفانہ معاملہ کے ذریعے ایک دوسرے کے مال و دولت سے فائدہ حاصل کرنا جائز ہے۔“

میں سمجھتا ہوں یہ آیت بے محل و بے موقعہ پیش کی گئی ہے، کیونکہ اس قرآنی آیت سے کسی طرح بھی معاملہ مذکورہ کا جواز نہیں نکلتا اور اس میں اس معاملہ کے جواز کی ایک فیصد بھی گنجائش نہیں۔ اس آیت میں اس کا واضح بیان ہے کہ ایک دوسرے کا صرف وہ مال لینا حلال اور جائز ہے جو رضامندانہ تجارت کے ذریعے حاصل ہوا ہو اور تجارت کے معنی بعض مفسرین کے نزدیک بیع و شراء اور خرید و فروخت کے ہیں اور بعض کے نزدیک بیع و شراء اور محنت و مزدوری دونوں کے ہیں، یعنی نفع کمانے کی غرض سے خرید و فروخت کا عمل بھی تجارت ہے اور معاوضے کی خاطر محنت و مزدوری کا عمل بھی تجارت ہے۔ تجارت کے اسی دوسرے مطلب کو اختیار کرتے ہوئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ علیہ معارف القرآن میں اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”مضمون آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ کسی کا مال ناحق کھانا حرام ہے لیکن رضامندی کے ساتھ بیع و شراء یا ملازمت و مزدوری کا معاملہ ہو جائے تو اس طرح دوسرے کا مال حاصل کرنا اور اس میں مالکانہ تصرفات کرنا جائز ہے۔“ (ص ۷۷-۳ ج ۲) بہر حال تجارت کا مطلب صرف بیع و شراء اور خرید و فروخت ہو یا اس کے ساتھ ملازمت اور محنت و مزدوری بھی ہو، ظاہر ہے کہ معاملہ زیر بحث تجارت کی تعریف میں نہیں آتا، کیونکہ شرائطی کھاتے والا فریق نہ خرید و فروخت اور بیع و شراء کا عمل کرتا ہے اور نہ محنت و مزدوری کا عمل، لہذا اس کے لئے معاملہ کسی طرح تجارت کا معاملہ نہیں ہو سکتا جس کے جواز کا اس آیت قرآنی میں ذکر ہے۔ پھر جب یہ معاملہ شرائطی کھاتہ دار کے لئے تجارت کا معاملہ ہی نہیں تو بتلائے کہ اس آیت سے اس کا جواز کیسے نکل سکتا ہے؟ کوئی عقلمند شخص اس استدلال کو صحیح نہیں مان سکتا۔

بلکہ اگر تجزیہ کر کے بغور دیکھا جائے تو الٹا یہ معاملہ ان معاملات کی فہرست میں نظر آتا ہے جن کو اس آیت نے باطل اور حرام ٹھہرایا اور مسلمانوں کو ان سے روکا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس آیت میں جس اکل بالباطل سے منع کیا گیا ہے، اس کی تفسیر متعدد مفسرین نے بغیر حق، بدون مقابل، بغیر عوض سے کی ہے اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ اور حضرت حسن بصریؒ کے حوالے سے اس کے معنی یہ گئے ہیں: الباطل ہو کل

ما یخذ من الانسان بغیر عوض۔ ”یہاں باطل سے مراد ہر وہ مال ہے جو کسی انسان سے بغیر عوض لیا جاتا ہے۔“ تفسیر المنار میں لکھا ہے: اما الباطل مالم یکن فی مقابلہ شیء حقیقی ”پس باطل وہ مال ہے جو کسی حقیقی شیء کے مقابلہ میں نہ ہو۔“

اکل بالباطل کے یہی معنی خود قرآن کریم کی بعض آیات سے بھی مفہوم ہوتے ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۸ میں رشوت لینے اور رشوت کے ذریعے دوسرے کا حق مارنے کو اکل بالباطل فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح سورہ توبہ کی آیت ۳۴ میں اس مال کے لینے کو اکل بالباطل فرمایا گیا ہے جو احبار و رہبان یعنی علماء و مشائخ بذریعہ مکرو و فریب عام لوگوں سے وصول کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حکام بطور رشوت اور بعض مولوی و پیر بذریعہ مکرو و فریب لوگوں سے جو مال لیتے ہیں، اس کے عوض ان کی طرف سے کوئی حقیقی چیز نہیں ہوتی جس کی بنا پر وہ اس لئے ہوئے مال کے حقدار ٹھہرتے ہوں، لہذا وہ دوسروں کا مال ناحق کھاتے ہیں۔

اسی طرح جو شخص سود، رشوت، چوری، غصب، خیانت، دھوکہ دہی کے ذریعے لوگوں کا جو مال لیتا اور کھاتا ہے، چونکہ اس کی طرف سے اس مال کا کوئی حقیقی بدل اور عوض نہیں ہوتا ہے، نہ مادی اشیاء کی شکل میں اور نہ محنت و خدمت کی شکل میں، جو اسے اس مال کا حقدار قرار دیتا ہو، لہذا وہ ناحق دوسروں کا مال لیتا اور کھاتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین حضرات نے اکل بالباطل کی تفسیر میں مذکور حرام اور غیر مشروع طریقوں کا ذکر کیا ہے، لیکن وضاحت نہیں فرمائی کہ وہ وجہ کیا ہے جس کی بنا پر یہ حرام طریقے اکل بالباطل کی تعریف میں آتے ہیں۔

اور پھر چونکہ یہ ظاہر ہے کہ جو شخص بینک میں شرائطی کھاتہ کھولتا ہے، وہ کچھ عرصہ کے بعد اپنی اصل رقم پر جو زائد لیتا ہے، اس زائد کے عوض کھاتہ دار کی طرف سے کوئی عوض اور بدل نہیں ہوتا، نہ کسی مادی شی کی شکل میں اور نہ محنت و مزدوری کی شکل میں، لہذا وہ اس کا حقدار نہیں ہوتا اور وہ جو لیتا ہے باطل طور پر لیتا ہے یعنی اپنا حق نہیں دوسرے کا حق لیتا ہے۔

یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر معاملات کے جواز و عدم جواز کے متعلق یہ قاعدہ کلیہ مان لیا جائے تو پھر معاملہ مضاربت بھی جائز نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ اس میں بصورت نفع سرمائے والا فریق اپنے اصل سرمائے پر جو زائد لیتا ہے، اس کا اس کی طرف سے کوئی عوض اور بدل موجود نہیں ہوتا، لہذا وہ دوسرے کا حق سلب کرتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ معاملہ مضاربت اس وجہ سے جائز ہے کہ اس میں سرمائے والا فریق ابتدا ہی سے یہ ذمہ داری قبول کرتا ہے کہ اگر تجارت میں نقصان و خسارہ ہو گا تو سب کا سب وہ خود برداشت کرے گا، کام کرنے والا فریق اس نقصان میں شریک نہ ہو گا۔ حالانکہ عموماً نقصان و خسارہ جو ہوتا ہے وہ کام کرنے والے کی ناتجربہ کاری، ناسمجھی اور غفلت وغیرہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لہذا ظاہر ہے کہ

اس میں سرمائے والا فریق، کام کرنے والے فریق کے لئے ایک طرح کا مالی ایثار کرتا ہے جس کو اس زائد مال کا عوض و بدل قرار دیا جاسکتا ہے جو نفع کی صورت میں کام کرنے والا فریق بطور ایک حصہ کے اس کو دیتا ہے، لیکن چونکہ یہ عوض و بدل اس قسم کا نہیں ہوتا جس قسم کا بیع و شراء اور محنت و مزدوری میں ہوتا ہے، لہذا معاملہ مضاربہ کے جواز کی وہ حیثیت نہیں جو معاملہ بیع و شراء اور محنت و مزدوری کے جواز کی ہے، گویا معاملہ مضاربہ کا جواز نمبر دو کا جواز ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حرام نہیں لیکن مکروہ ضرور ہے، جبکہ بیع و شراء اور محنت و مزدوری کا جواز اول اور اعلیٰ درجے کا بمعنی مستحب ہوتا ہے، کیونکہ اس میں انسان کو اپنی محنت کا پھل ملتا ہے جس کی احادیث نبویہ میں بڑی فضیلت ہے اور جس کو پاکیزہ ترین رزق بتلایا گیا ہے۔

معاملہ زیر بحث میں چونکہ ضروری ٹھہرایا گیا ہے کہ نقصان کی صورت میں سرمائے والے فریق کی طرح کام کرنے والا فریق بھی نقصان میں شریک ہوگا، لہذا یہ معاملہ مضاربہ کے معاملہ سے مختلف ہو جاتا ہے اور اس کو مضاربہ کے جواز پر نہیں قیاس کیا جاسکتا۔

حاصل یہ کہ جہاں تک آیت مذکورہ کا تعلق ہے جو اس معاملہ کے جواز میں پیش فرمائی گئی ہے، اس سے نہ صرف یہ کہ اس معاملہ کا جواز ثابت نہیں ہوتا بلکہ بغور دیکھا جائے تو الٹا عدم جواز ثابت ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے علاوہ قائلین جواز کے پاس کچھ اور دلائل ہوں جن سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہو، لیکن جب تک سامنے نہ آئیں حقیقت حال کا علم نہیں ہو سکتا اور یہ معاملہ اپنے شرعی حکم کے لحاظ سے اندھیرے میں رہتا ہے۔

رپورٹ مذکورہ کے مطالعے سے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ اس کو مرتب کرنے والے ماہرین اقتصادیات کے سامنے نہ ربا و سود کی حقیقت پوری طرح واضح ہے اور نہ اس کے حرام ہونے کی اصل علت نمایاں ہے، ورنہ وہ بعض ایسے معاملات کو غیر سودی نہ بتلاتے جو اپنی حقیقت، روح اور اپنے اثرات و نتائج کے لحاظ سے سودی یا غیر سودی کے مشابہ اور قریب تر ہیں۔ دراصل ربوہ کے شرعی مفہوم و مطلب سے متعلق چند غلط فہمیاں ایسی ہیں جن میں بعض اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگ بھی مبتلا ہیں، مثلاً ایک یہ کہ قرض کی اصل رقم پر صرف اس زیادتی کو ربائے حرام سمجھا جاتا ہے جو فیصد کے لحاظ سے متعین ہو، مثلاً پانچ فیصد یا دس فیصد یا پندرہ فیصد وغیرہ۔ اگر اس طرح متعین نہ ہو تو وہ اس کو ربوہ نہیں سمجھتے، حالانکہ یہ درست نہیں، کیونکہ احادیث نبویہ اور آثار صحابہؓ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرض کی اصل رقم پر طے شدہ ہر زیادتی ربوہ اور حرام ہے خواہ وہ متعین ہو یا غیر متعین، کم ہو یا زیادہ۔

چنانچہ بعض لوگ اس غلط فہمی کی بنا پر یہ کہہ دیتے ہیں کہ ربوہ اس لئے حرام ہے کہ اس میں زیادتی متعین ہوتی ہے اور مضاربہ اس لئے جائز ہے کہ اس میں زیادتی غیر متعین ہوتی ہے، حالانکہ ربوہ کے حرام

ہونے کی وجہ زیادتی کا متعین ہونا اور مضاربہ کے جائز ہونے کی وجہ اس میں زیادتی کا غیر متعین ہونا نہیں بلکہ اس کی وجہ دوسری ہیں جن کا کچھ اوپر ذکر ہوا۔ مثال کے طور پر ایک شخص دوسرے کو اس شرط پر قرض دیتا ہے کہ ایک سال کے بعد وہ قرض کی اصل رقم مع کچھ اضافے کے ادا کرے گا تو یہ معاملہ یقیناً ربوہ کا معاملہ ہے حالانکہ اس میں زیادتی کا تعین نہیں۔

دوسری غلط فہمی سود کے متعلق یہ پائی جاتی ہے کہ سود کا تعلق صرف اس مال سے مخصوص ہے جو لفظ قرض کے ساتھ کسی کو دیا اور اس پر اضافہ طے کیا گیا ہو، یعنی جو مال دوسرے کو یہ کہہ کر دیا گیا ہو کہ یہ آپ کے ذمہ قرض ہے، اس مال پر کچھ مزید لینا تو سود ہے لیکن جو لفظ قرض کے ساتھ دوسرے کو نہ دیا گیا ہو، اس پر کچھ زائد لینا سود اور حرام نہیں۔

اور یہ سمجھنا اس وجہ سے غلط ہے کہ سود کا تعلق لفظ قرض سے نہیں، حقیقت قرض سے ہے اور حقیقت قرض اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک شخص بطور تعاون اپنا مال دوسرے کو ایک مقررہ مدت تک اس طور پر دیتا ہے کہ اب دوسرے کو اس مال میں ہر مالکانہ تصرف کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا کلی اختیار ہے، البتہ مقررہ میعاد ختم ہونے پر وہ ویسا ہی مال پورے کا پورا ادا کرے گا، اب اگر اس کے ساتھ کسی اضافے کی شرط نہ ہو تو وہ قرض حسنہ اور اضافے کی شرط نہ ہو تو وہ سودی قرضہ اور ربا ہے، گویا ربا کا تعلق دراصل ایک ایسے معاملے سے ہے جس میں ایک شخص اپنا مال اپنی ملکیت سے نکال کر دوسرے کی ملکیت میں دیتا اور یہ طے کرتا ہے کہ مقررہ میعاد کے بعد ویسا ہی مال پورے کا پورا ربا اضافہ کے دوسرا واپس کرے گا، چونکہ اس میں حقیقت قرض موجود ہوتی ہے جس کے ساتھ ربا کا تعلق ہے، لہذا ربا متحقق ہو جاتی ہے اگرچہ لفظ قرض نہ بولا گیا ہو یا قرض کے بجائے کوئی دوسرا لفظ بولا گیا ہو۔

اسی طرح تحریم کا تعلق حقیقت ربا سے ہے، لفظ ربا سے نہیں، لہذا اگر کسی ایسے معاملے کو جس میں حقیقت ربا موجود نہ ہو، ربا کہہ دیا جائے تو وہ حرام نہیں ہو جاتا، اس کے برعکس جس معاملے میں حقیقت ربا پائی جاتی ہو، اس کو صدقہ یا ہبہ وغیرہ سے موسوم کر دیا جائے تو وہ حلال نہیں ہو جاتا، حرام ہی رہتا ہے۔ اسی طرح سود کو منافع کہہ دینے سے وہ کبھی حلال و جائز نہیں بن جاتا بلکہ حرام ہی رہتا ہے، غرضیکہ نام کے بدلنے سے نہ کسی شی کی حقیقت بدلتی ہے اور نہ اس کی شرعی حیثیت پر کچھ اثر پڑتا ہے، کیونکہ اس صورت میں بھی اس کے وہ اچھے برے اثرات ضرور ظاہر ہو کر رہتے ہیں جن کی وجہ سے اس معاملہ کو حلال یا حرام ٹھہرایا گیا ہے، زہر کا نام تر قاق رکھ دینے سے اس کی خاصیت نہیں بدلتی۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ رپورٹ مذکورہ میں حقائق کو الفاظ سے، مقاصد کو وسائل سے اور حرام کو حیلوں اور تاویلوں کے ذریعے حلال سے بدلنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تیسری غلط فہمی ممانعت سود کی توجیہ سے متعلق ہے، یعنی یہ کہ قرآن حکیم نے کس وجہ سے ربا کی ممانعت فرمائی اور اس سے کیوں روکا ہے؟ اس بارے میں رپورٹ مذکور کے صفحہ سولہ اور سترہ پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ یہ ہے:

”صرف ضروریات کے قرضوں پر ممانعت کی عقلی توجیہ بالکل واضح ہے، ایسے قرضے زیادہ تر پریشان حال لوگ لیتے ہیں تاکہ ان کی ایسی فوری اور شدید ضروریات پوری ہو سکیں جن کے لئے ان کے پاس ذاتی وسائل موجود نہیں، انسانیت اور اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے سود لے کر انہیں مزید زیر بار نہ کیا جائے، البتہ جہاں تک پیداواری ضروریات کے قرضوں پر سود لینے کا معاملہ ہے تو اسلام نے اس کی ممانعت اپنے معاشرتی فلسفے کے پیش نظر کی ہے جس کا بنیادی اصول معاشرے میں عدل و انصاف قائم کرنا ہے۔“

اس توجیہ کا پہلا حصہ از روئے قرآن مجید غلط اور دوسرا حصہ اجمالی طور پر صحیح لیکن اس کے بعد اس کی جو تفصیل ہے، اس کے لحاظ سے وہ بھی غلط ہے۔

قرآن مجید نے ربو کے ہر قسم کو خواہ وہ نجی ضرورت کے قرضوں سے تعلق رکھتی ہو یا تجارتی اور پیداواری مقاصد کے قرضوں سے متعلق ہو، ظلم سے تعبیر کیا ہے جو عدل کی ضد ہے اور جس کے معنی ہیں حق تلفی، کیونکہ عدل کے معنی ہیں دوسرے کے حق کی پوری پوری ادائیگی۔ اور چونکہ ظلم و حق تلفی قطعی طور پر حرام ہے، لہذا اس کی ممانعت قانونی ہے، جبکہ مذکورہ توجیہ کے مطابق ربا کی پہلی قسم کی ممانعت اخلاقی ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا نہ کرنا، کرنے سے بہتر ہے یعنی صرف ضروریات کے قرضوں پر سود نہ لینا، لینے سے بہتر ہے، گویا کہ اس سود کی ممانعت، کسی حرام چیز کی ممانعت نہیں، مگر وہ چیز کی ممانعت ہے اور یہ اس لئے بھی درست نہیں کہ مکر وہ چیز کے ارتکاب پر وہ دھمکی و تہدید نہیں ہو سکتی جو ربا کا ارتکاب کرنے والوں کے لئے قرآن مجید میں ہے یعنی اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی دھمکی۔

عبارت مذکورہ میں پیداواری ضروریات کے قرضوں پر سود کی ممانعت کی وجہ یہ بتلائی گئی ہے کہ چونکہ اس قسم کا سود اسلام کے معاشرتی فلسفے جس کا بنیادی اصول معاشرے میں عدل و انصاف قائم کرنا ہے، کے مخالف و منافی ہے، لہذا اس سے منع فرمایا گیا ہے۔

بلاشبہ یہ توجیہ صحیح ہے لیکن اس کے معاً بعد اس دوسری ربا کی عدل و انصاف کے خلاف ہونے کی جو توضیح و تفصیل پیش فرمائی گئی ہے، اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے کے ذہن میں اسلام کے معاشرتی فلسفے اور معاشرتی عدل و انصاف کا جو تصور ہے، وہ قرآن مجید کے تصور عدل و انصاف کے مطابق نہیں، لہذا غلط ہے، یعنی یہ توجیہ، اس کا مصداق ہے: کلمۃ حق ایدب الباطل ”کہ بات تو ٹھیک ہے لیکن اس کا جو مطلب لیا گیا ہے وہ غلط ہے“ مثلاً اس توضیح میں لکھتے ہیں:

”پھر اس کے برعکس ایک اور صورت حال بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر زر کے نفع میں سود کا بطور ایک حصہ پہلے مقرر کر دیا جائے لیکن نفع بے حد و حساب ہو تو ایسی صورت میں نفع کا بیشتر حصہ کاروباری فریق لے جائے گا اور صاحب زر کو سود کی شکل میں پہلے سے متعین محدود نفع پر قانع ہونا پڑے گا۔“

چونکہ اس بات کا تعلق اس سود سے ہے جو پیداواری مقاصد کے قرضوں پر لیا دیا جاتا ہے، لہذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص کسی سے مال بطور قرض لے کر اس کے ساتھ تجارت وغیرہ کرتا ہے، اس کے منافع میں قرضخواہ کا بھی ضرور حصہ ہوتا ہے جو اسے پورا پورا ملنا چاہئے، حالانکہ یہ مطلب دو وجہ سے باطل ہے: ایک اس وجہ سے کہ یہ شرعی قاعدہ ہے کہ جو مال قرض کے طور پر دیا لیا جاتا ہے، وہ قرضخواہ کی ملکیت سے نکل کر قرضدار کی ملکیت میں چلا جاتا ہے اور اس کی حیثیت بعینہ اس نفع کی طرح ہوتی ہے جو کوئی شخص اپنے ذاتی مال کے ساتھ کام و محنت کر کے کماتا ہے یعنی وہ نفع پورے کا پورا اس کا حق ہوتا ہے دوسرا کوئی اس کے کسی حصہ کا حقدار نہیں ہوتا، نہ قرضخواہ اور نہ غیر قرضخواہ، لہذا اس نفع میں سے قرضخواہ کم لے یا زیادہ، اپنا نہیں دوسرے کا حق لیتا ہے جو باطل اور حرام ہے۔ قرآن مجید سے اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے ربا سے تائب ہونے والوں کو کہا ہے کہ تم صرف اپنا اصل مال اپنے مقروض سے لے سکتے ہو، اس پر زائد کچھ نہیں لے سکتے، اگر کچھ بھی زیادہ لوگے تو وہ چونکہ دوسرے کا حق ہو گا، لہذا تمہارا یہ لینا ظلم ہو گا۔ سورہ بقرہ میں ارشاد رب العزت ہے:

وَإِنْ تَبْتَغُوا فَلََكُمْ رُدُّهُنَّ أَمْوَإِكُمْ ۖ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (البقرہ: ۲۷۹)

”اور اگر تم سود سے توبہ کر لو تو پھر تمہارے لئے تمہارے اصل مال ہیں، ان سے زیادہ لے کر نہ تم دوسروں پر ظلم کرو اور ان میں کمی کر کے نہ تم پر ظلم کیا جائے۔“

یہ قرآنی آیت صاف بتلا رہی ہے کہ قرض خواہ اپنے اصل مال پر کسی زائد شی کا حقدار نہیں ہوتا ہے خواہ مقروض نے اس مال کے ساتھ کام و محنت کر کے کتنا ہی نفع کیوں نہ کمایا ہو، لہذا اس سے مذکورہ مطلب کی تخیل و تردید ہو جاتی ہے جو عبارت مذکورہ میں بیان کیا گیا ہے۔

دوسری وجہ اس مطلب کے غلط و باطل ہونے کی یہ ہے کہ یہ مطلب اس نظریے پر مبنی ہے کہ محنت کی طرح سرمایہ بھی مال و دولت کو پیدا کرتا ہے، لہذا دونوں کے اشتراک سے جو مال پیدا ہوا، اس کا ایک حصہ محنت کش کو اور دوسرا حصہ صاحب سرمایہ کو ضرور ملنا چاہئے اور چونکہ یہ تصور و نظریہ حقیقت واقعہ کے لحاظ سے غلط ہے، لہذا اس پر مبنی مطلب مذکور بھی غلط ہے، کیونکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ کوئی سرمایہ کسی چیز کو پیدا نہیں کرتا۔

اس اجمال کی کچھ تفصیل یہ ہے کہ سرمایہ جس کو عربی میں راس المال اور انگریزی میں

کپیتال (Capital) کہا جاتا ہے، معاشیات کی اصطلاح میں اس مال کا نام ہے جسے اپنے ذاتی صرف کے لئے مخصوص کرنے کی بجائے کاروبار کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہو، مثلاً مکان اپنی رہائش کے لئے مخصوص ہے تو وہ مال و دولت کہلاتا اور کرائے پر اٹھانے اور مزید کمانے کے لئے ہو تو وہ سرمایہ اور اس المال کہلاتا ہے۔ تو گویا مال اور اس المال اور دولت اور سرمائے میں حقیقت و ماہیت کے لحاظ سے کچھ فرق نہیں، فرق ان کے درمیان جو کچھ بھی ہے، اعتباری ہے، ایک ہی چیز ایک اعتبار سے مال و دولت اور دوسرے اعتبار سے راس المال اور سرمایہ کہلاتی ہے اور پھر جس شے کو ایک اعتبار سے مال و دولت اور دوسرے اعتبار سے سرمایہ اور راس المال کہا جاتا ہے، اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ وہ کوئی قدرتی مادہ ہے جس کی قدرتی افادیت میں انسانی محنت سے ایک نئی افادیت پیدا ہو گئی اور غور سے دیکھا جائے تو اس چیز کا وجود صرف دو عوامل کا نتیجہ نظر آتا ہے: ایک قدرتی مادے کا جو معاشیات کی اصطلاح میں لینڈ کے تحت آتا ہے اور دوسرے انسانی محنت کا جسے لیبر کہا جاتا ہے، سرمایہ نہ صرف یہ کہ پیدا آور عامل نہیں بلکہ وہ خود مذکورہ دو عوامل سے وجود میں آتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہر کاروبار کے لئے سرمائے کا ہونا ضروری ہے، سرمائے کے بغیر نہ زراعت و صنعت ہو سکتی ہے اور نہ تجارت اور خرید و فروخت وغیرہ۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ کاروبار میں محنت کی طرح دولت کو بھی پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ خواہ کسی جنس سے اور کسی شکل میں بھی ہو، اپنے وجود کو جوں کا توں برقرار رکھتے ہوئے کسی شے کو پیدا نہیں کر سکتا، نہ اس حالت میں جب وہ یونہی بیکار پڑا ہوتا ہے اور نہ اس حالت میں جب وہ کاروبار میں لگا ہوتا ہے، جب وہ یونہی بیکار پڑا ہوا ہو تو عام مشاہدہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس کی مقدار اور تعداد میں کبھی اضافہ نہیں ہوتا، بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ کہنہ و فرسودہ ہوتا اور مسلسل گھٹتا ہے، اسی طرح جب وہ کسی کاروبار میں استعمال ہو رہا ہوتا ہے تو اس وقت بھی وہ اپنے وجود کو سو فیصد قائم رکھتے ہوئے کسی چیز کو پیدا نہیں کرتا۔ چنانچہ اگر وہ سرمایہ زر و نقدی اور سکہ رائج الوقت کی شکل میں ہوتا ہے تو استعمال ہونے اور گردش میں رہنے سے نہ اس کی قدر و قیمت میں کوئی کمی ہوتی ہے اور نہ زیادتی، نہ گھٹتا ہے اور نہ بڑھتا ہے بلکہ اپنی حالت پر برقرار رہتا ہے اور اگر وہ مختلف قسم کی خام اجناس، مصنوعی اشیاء، آلات و مشینوں وغیرہ کی شکل میں ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ استعمال ہونے سے جزویاً کلی طور پر تحلیل ہوتا، گھٹتا اور مالیت کے لحاظ سے مسلسل کم ہوتا چلا جاتا ہے لیکن یہ ضائع نہیں ہوتا بلکہ اس پیداوار میں مل جاتا ہے جو نئی محنت کے ذریعے کاروبار میں پیدا ہوتی ہے، لہذا اگر کسی کاروبار میں ایک شخص کا سرمایہ اور دوسرے کی محنت ہو تو سرمایہ اگر پہلی قسم کا ہے جو استعمال ہونے سے کم نہیں ہوتا بلکہ جب بھی صاحب سرمایہ کی طرف لوٹتا ہے، بے کم و کاست پورے کا پورا لوٹتا ہے، مثلاً ایک ہزار روپے دیئے تھے تو وہ اس کو پورے ایک ہزار واپس مل جاتے ہیں تو اس صورت میں سرمائے والا فریق کاروبار کے منافع میں سے کسی

چیز کا مستحق نہیں ہوتا اگر اس نے اپنے پورے سرمائے کی واپسی کی شرط لگا رکھی اور ضمانت لے رکھی ہوتی ہے، اس صورت میں وہ اپنے اصل سرمائے پر جو کچھ بھی کسی نام سے بھی لیتا ہے، وہ ربو کی تعریف میں آتا ہے، ہاں اگر اس نے معاملہ شروع کرتے وقت یہ کہہ دیا تھا کہ پورے سرمائے کی واپسی ضروری نہیں، اگر کاروبار میں نقصان ہو گیا تو میں برداشت کروں گا تو ایسی صورت میں منافع کا ایک نسبتی حصہ وہ لے سکتا ہے، یہ معاملہ مضاربت کا معاملہ ہے، معاملہ ربا اور معاملہ مضاربت کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ ربا کی رقم دوسرے کے پاس بطور قرض اور مضاربت کی رقم دوسرے کے پاس بطور امانت ہوتی ہے۔

اور اگر سرمایہ دوسری قسم کا ہے جو استعمال ہونے سے گھٹتا، فرسودہ ہوتا اور گھٹتا ہے تو ایسے سرمایے والا فریق کاروبار کے منافع سے صرف اس قدر لے سکتا ہے جس قدر کہ استعمال سے اس کے سرمائے میں کمی واقع ہوئی۔

مختصر یہ کہ یہ تصور و نظریہ کہ محنت کی طرح سرمایہ بھی دولت کو پیدا کرتا ہے، اسلام کی رو سے صحیح نہیں۔ اس لئے کہ یہ حقیقت واقعہ کے خلاف ہے اور اس پر عمل کرنے سے قومی دولت چند ہاتھوں میں سمٹی اور اس کی گردش ایک گروہ کے اندر محدود ہو کر رہ جاتی ہے، اس لئے کہ اس سے معاشرے میں غیر فطری معاشی عدم توازن اور نشیب و فراز پیدا ہوتا اور سرمایہ دار اور محنت کش طبقوں کے درمیان کبھی ختم نہ ہو سکنے والا نزاع و جدال جاری رہتا ہے۔ نظام سرمایہ دار کی بنیاد اسی باطل تصور و نظریہ پر قائم ہے اور اس نظام کی بے شمار خرابیوں اور برائیوں کا اصل سبب یہی تصور و نظریہ ہے۔ نظام سرمایہ داری میں معاشی حق، عدل اور ظلم کا جو مفہوم و مطلب اور اس کے مطابق جو معاشی قوانین ہیں، وہ سب اسی تصور و نظریے پر مبنی ہیں کہ محنت کی طرح سرمایہ بھی عامل پیدائش دولت ہے اور سرمایہ بھی اسی طرح دولت کو پیدا کرتا ہے جس طرح محنت کرتی ہے، لہذا کاروبار کے منافع میں سرمائے والے کا بھی ویسا ہی حق ہوتا ہے جیسا کہ محنت کرنے والے کا حق اور عدل و انصاف یہ ہے کہ ہر فریق کو اس کا حصہ ملنا چاہئے اور ظلم و بے انصافی یہ کہ کسی فریق کو اس کے حق سے کلی یا جزوی طور پر محروم رکھا جائے اور پھر یہی وجہ ہے کہ اس نظام کے اندر نفس سود قانوناً جائز ہے، اس نظام کے ماننے والے کبھی یہ بحث نہیں کرتے کہ سود جائز ہے یا ناجائز، وہ اگر بحث کرتے ہیں تو صرف یہ کہ کن حالات میں شرح سود کتنی ہونی چاہئے اور کتنی نہ ہونی چاہئے۔

غور سے دیکھا جائے تو اسلامی معاشی نظام اور سرمایہ دارانہ معاشی نظام کے درمیان جو بنیادی فرق و اختلاف ہے، وہ یہ کہ اسلام نظریہ مذکورہ کو غلط قرار دیتا اور نظام سرمایہ داری اس کو صحیح ٹھہراتا ہے، جس طرح کہ اسلامی معاشی نظام اور اشتراکی معاشی نظام کے مابین جو بنیادی فرق و اختلاف ہے، وہ یہ کہ اسلام ذرائع پیداوار کی بھی شخصی ملکیت کو صحیح تسلیم کرتا جبکہ اشتراکیت اس کا انکار کرتی ہے۔

لیکن افسوس کہ بہت سے ایسے حضرات جن کو اسلام میں معاشیات کے بغور اور گہرے مطالعے کا موقع

نہیں ملا اور ان کی معلومات اس بارے میں محض سرسری اور سطحی ہیں، وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اسلام بھی سرمایے کو پیدائش دولت کا ویسا ہی عامل تسلیم کرتا ہے جیسا کہ محنت کو اور سرمائے والے فریق کو کاروبار کے منافع کا اسی طرح حقدار ٹھہراتا ہے جس طرح محنت کرنے والے فریق کو اور عدل و انصاف یہ ہے کہ ہر فریق کو اس کا حق ملے۔ چنانچہ یہ چیز بلا سود بینکاری کی مذکورہ رپورٹ میں پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر اور پورے زور و شور کے ساتھ کارفرما نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس کے اندر بہت سے معاشی معاملات کو اسی نظریے اور اسی فلسفے کے تحت عدل و انصاف کے مطابق اسلامی کہا گیا ہے حالانکہ نہ وہ اسلامی عدل و انصاف کے مطابق اور نہ اسلامی معاشرتی فلسفے کے موافق ہیں۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ اسلام معاشرے میں کامل عدل و انصاف کا قیام چاہتا ہے، لہذا اس کے نزدیک معاشی معاملات اور کاروبار کی ایسی تمام شکلیں جائز قرار پاتی ہیں جو عدل و انصاف کے مطابق ہوں اور وہ تمام شکلیں ناجائز ٹھہرتی ہیں جو عدل و انصاف کے منافی اور ظلم و حق تلفی پر مبنی ہوں، لیکن یہ فیصلہ کہ معاشی معاملات اور کاروبار کی کونسی شکلیں عدل و انصاف کے مطابق اور کونسی شکلیں عدل و انصاف کے مخالف اور ظلم پر مبنی ہیں، صحت اور بصیرت کے ساتھ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ متعین و واضح نہ ہو کہ اسلام میں معاشی حق و عدل اور معاشی ظلم و بے انصافی کا تصور اور مطلب کیا ہے، جو اشتراکیت اور سرمایہ داری کے تصور ہائے حق و عدل اور ظلم و عدوان سے مختلف بھی ہے اور اپنے نتائج کے لحاظ سے بہتر بھی۔ لہذا موجودہ معاشی ڈھانچے میں اسلام کے نام پر کوئی اصلاح و تبدیلی عمل میں لانے سے پہلے ضروری ہے کہ پوری توجہ اور تحقیق کے ساتھ یہ متعین اور معلوم کیا جائے کہ قرآن و حدیث میں معاشی حق و عدل اور معاشی ظلم و عدوان کا جو تصور ہے، وہ اپنی خصوصیات کے ساتھ کیا ہے؟ اور یہ کہ اس تصور کے مطابق تجارتی، صنعتی اور زراعتی معاملات کی صحیح شکلیں کیا ہو سکتی ہیں اور یہ کہ موجودہ شکلوں میں سے کونسی اس کے مطابق ہیں اور کونسی مطابق نہیں؟ اور خاص طور پر ان معاشی مقاصد کا تعین کیا جائے جن کو اسلام نے اپنے معاشی عدل و ظلم کے تصور اور اپنے معاشی اصول و تصورات کی وضع و ساخت میں پوری طرح ملحوظ رکھا اور جن کو وہ اپنے مجوزہ مثالی معاشرے میں بروئے کار لانا اور دیکھنا چاہتا ہے، کیونکہ اس کے بغیر نہ اسلام کے معاشی عدل اور ظلم اور معاشی اصول و تصورات کا صحیح طور پر مفہوم و مطلب متعین ہو سکتا ہے اور نہ ان اختلافات کو سلجھایا اور دور کیا جاسکتا ہے جو اسلام کے معاشی اصول و تصورات کے متعلق علماء کرام کے مابین پائے جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے اسلام کا معاشی نظام بری طرح الجھ کر بلکہ ایک معمہ بن کر رہ گیا ہے اور جن کا سلجھانا اور دور کرنا ایک اہم ملی و دینی ضرورت ہے اور سچ پوچھیے تو اسلامی نظریاتی کونسل کے کرنے کا اصل کام یہی تھا کہ وہ اسلامی نظریہ حیات کے ہر پہلو کو نظری طور پر متعین اور واضح کرتی اور یہ بتاتی کہ قرآن و سنت کے مطابق اسلام کا حقیقی

اجتماعی نظام، معاشی، معاشرتی، سیاسی اور ثقافتی طور پر کیا ہے اور وہ غیر اسلامی نظاموں سے بنیادی طور پر کیسے مختلف اور عقلی طور پر کیسے بہتر ہے؟ قطع نظر اس سے کہ موجودہ حالات میں قابل عمل ہے یا نہیں؟ کیونکہ اس کا تعلق تطبیق سے ہے نظریے سے نہیں اور جو بجائے خود ایک مستقل مسئلہ ہے۔ نیز یہ بھی بتاتی کہ اسلام کے حقیقی اجتماعی نظام کے عمل میں آنے اور پائیداری کے ساتھ قائم رہنے کے لئے جس طرح کے ذہنی اور خارجی حالات کا موجود ہونا ضروری ہے، وہ کیا ہیں اور کس طریقے سے وجود میں آسکتے ہیں؟ اسی طرح یہ بھی بتاتی کہ اسلام کی وہ حکمت عملی اور حکیمانہ پالیسی کیا ہے جو اس نے ناموافق حالات میں عبوری لائحہ عمل کے لئے تجویز کی اور مسلمان معاشروں کو اس کی اجازت دی ہے کہ وہ ناموافق عبوری حالات میں اس حکمت عملی کو ملحوظ رکھ کر اپنے لئے عبوری لائحہ عمل بنا سکتے ہیں؟

بہر حال میرا یہ پختہ خیال ہے کہ جب تک اسلامی نظریہ حیات کے متعلق یہ نظری و عملی کام نہ کیا جائے گا، ہم خواہش کے باوجود اپنے موجودہ معاشرتی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی ڈھانچے کو اسلام کے مطابق تبدیل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ قدم قدم پر ٹھو کریں کھائیں گے۔ غیر اسلامی کو اسلامی اور اسلامی کو غیر اسلامی سمجھتے رہیں گے۔ اور ہماری بہت سی کوششیں بیکار اور رائیگان جائیں گی اور نتیجہ ہم گھائلے میں رہیں گے، لہذا مذکورہ علمی و نظریاتی کام اولین فرصت میں اور پوری توجہ و احتیاط کے ساتھ کرنے کی ضرورت ہے۔

آخر میں یہ عرض کروں گا کہ ماضی کے طویل تاریخی پس منظر کے نتیجے میں آج ہمارے معاشرے کی جو اعتقادی، ایمانی، اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی صورت حال ہے، اس میں اسلام کا حقیقی اجتماعی نظام پہلے تو پوری طرح عمل میں آ ہی نہیں سکتا اور اگر کسی طرح عمل میں آجائے تو پائیداری کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا، کیونکہ اس کے لئے جس طرح کا ذہنی اور خارجی ماحول ضروری و ناگزیر ہے، بد قسمتی سے موجود نہیں۔ لہذا جب تک وہ خاص طرح کا ماحول وجود میں نہیں آ جاتا، اس عبوری دور میں ہم اسلامی حکمت عملی کے تحت اپنے لئے عبوری لائحہ عمل بنا سکتے اور اس کے مطابق اپنی عملی زندگی کی گاڑی چلا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم اجتماعی طور پر یہ طے کر لیں کہ ہم نے بالآخر اسلام کے حقیقی اجتماعی نظام کو اپنانا اور کامل طور پر اختیار کرنا ہے، کیونکہ عبوری لائحہ عمل کی اجازت اور رعایت صرف ایسے مسلم معاشرے کے لئے ہے جس نے اسلام کے حقیقی اجتماعی نظام کو اپنانے اور اختیار کر لینے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہو اور اس کے لئے سنجیدگی کے ساتھ وہ ماحول پیدا کرنے کی کوشش بھی شروع کر دی ہو جو اسلام کے حقیقی اجتماعی نظام کے عمل میں آنے کے لئے ضروری ہے۔ عبوری لائحہ عمل کے متعلق اسلام کی حکمت عملی یہ ہے کہ اس کے بنانے میں دو چیزوں کا پورا لحاظ رکھا جائے: ایک یہ کہ وہ معاشرے کے موجودہ حالات میں قابل عمل ہو، اس کے نفاذ سے مختلف رد عمل کا اندیشہ نہ ہو جس کا ضرر ہمیشہ حاصل شدہ فائدہ سے زیادہ ہو کر رہتا ہے۔ دوسری چیز یہ کہ وہ حقیقی لائحہ عمل کے قریب تر ہو

اور اس پر عمل کرنے کے نتیجے میں موجود ظلم و فساد میں کچھ کمی ہو سکتی اور قدم اصل منزل کی طرف بڑھ سکتا ہو اور یہ حکمت عملی اس تصور پر مبنی ہے کہ جب ناموافق و ناسازگار حالات کی وجہ سے کامل خیر و بھلائی کا حصول ممکن نہ ہو اور دوہرا بیانیوں میں سے ایک کا اختیار کرنا ضروری ہو تو اس برائی کو بادل ناخو استہ اور وقتی طور پر اختیار کر لیا جائے جو نسبتاً کم درجہ کی ہو۔

اس میں شک نہیں کہ عبوری لائحہ عمل کے تعین کا مسئلہ بڑا نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے جو ایسے لوگوں کے اجتماعی غور و فکر اور صلاح و مشورے ہی سے حل ہو سکتا ہے جو ایک طرف معاشرے کے ذہنی و خارجی حالات پر وسیع اور گہری نظر رکھتے ہوں اور دوسری طرف اسلام کے حقیقی ضابطہ حیات کو خوب اچھی طرح جانتے ہوں۔ نیز اس حکمت عملی سے پوری طرح آگاہ ہوں جو عبوری لائحہ عمل کے لئے اسلام نے تجویز کی ہے، اسی طرح وہ غیر معمولی فہم و فراست اور اعلیٰ سوچ بوجھ سے بھی آراستہ ہوں اور پھر ہر عبوری لائحہ عمل کے متعلق نہایت واضح الفاظ میں یہ اعلان کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ لائحہ عمل حقیقی طور پر اسلامی نہیں، اس کی بنا پر کسی کو اسلام کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہئے، اسے ہم اسلامی حکمت عملی کے تحت اپنے موجودہ حالات کی وجہ سے بادل ناخو استہ اختیار کر رہے ہیں، جب حالات تبدیل ہوں گے ہم اس کو چھوڑ دیں گے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا جائے کہ اسلام کا حقیقی لائحہ عمل کیا ہے۔

یہ اعلان اس لئے ضروری ہے کہ بد قسمتی سے آج ہمارے جو ذہنی اور خارجی حالات ہیں وہ کسی طرح اطمینان بخش نہیں، لہذا ان حالات کے مطابق جو بھی لائحہ عمل تجویز ہو گا، ظاہر ہے کہ وہ اطمینان بخش نہ ہو گا۔ اس کی بنا پر اسلام کے متعلق کوئی رائے قائم کی جائے گی تو یقیناً اچھی نہ ہو گی۔ مثلاً ہم معاشی شعبے سے متعلق جو بھی قابل عمل قسم کا لائحہ عمل تجویز کریں گے، ناممکن ہے کہ وہ سود و قمار اور ظلم و استیصال سے کلی طور پر پاک و صاف ہو، اس میں ہمیں جاگیر دار اور سرمایہ دار کے مفادات کا ضرور لحاظ رکھنا پڑے گا اور بعض ایسے معاملات معمولی رد و بدل کے ساتھ ضرور قائم رکھنے پڑیں گے جو اگرچہ حرام و ناجائز ہیں لیکن معاشرے کی بڑی اکثریت ان کو یکسر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ آج عام طور پر ہم مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ نفع کی توقع نہ ہو تو کوئی کسی کو اپنا مال مفت برتنے کے لئے نہیں دیتا اور مال کی حرص نے حلال و حرام کی تمیز ختم کر دی ہے اور ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ تھوڑے سے تھوڑے وقت میں بڑے سے بڑا مالدار بن جائے۔ اسی طرح ہمیں اس عبوری معاشی لائحہ عمل میں ان غیر مسلم اقوام و ممالک کے مفادات کا بھی لحاظ رکھنا پڑے گا جن کی معیشت سے ہماری معیشت نتھی ہے اور جن کے معاشی اور سیاسی شکنچوں میں ہم بری طرح کسے ہوئے ہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ تعمیر و ترقی کے منصوبوں میں ان کے تعاون کے محتاج ہیں بلکہ بعض بنیادی ضروریات کے لئے بھی ان کے دست نگر ہیں، لہذا اگر ہم موجودہ حالات میں ان کے مفادات کا لحاظ نہ رکھیں تو اس کے رد عمل سے ہمیں قومی طور پر شدید نقصان پہنچ سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ جس معاشی لائحہ عمل میں مذکورہ

چیزوں کا لحاظ رکھا جائے گا، وہ بہت بڑی حد تک سرمایہ دارانہ ہو گا اور اس کی تازہ اور روشن مثال وہ لائحہ عمل ہے جو بلا سود بینکاری کے لئے تجویز کیا گیا ہے، لہذا اگر اس قسم کے لائحہ عمل کو اسلام کے لیبل کے ساتھ پیش کیا جائے تو دنیا یہ سمجھنے اور کہنے میں حق بجانب ہو گی کہ اسلام کا معاشی نظام بھی بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ نظام ہے جس سے دنیا بیزار ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے عام مسلمانوں کو کوئی فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے لیکن اسلام کو ضرور نقصان پہنچے گا اور ہماری نئی نسل اس سے متنفر ہو کر اشتراکیت کی طرف چلی جائے گی اور اس کے تمام تر ذمہ دار وہ مسلمان ہوں گے جو اسلام کے معاشی نظام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں۔ بنا بریں ضروری ہے کہ ایسے لائحہ عمل کے متعلق واضح طور پر اعلان ہو کہ یہ اسلام نہیں۔ اس اعلان کا دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ مسلمان اس عبوری لائحہ عمل کے ساتھ چٹ کر نہ رہ جائیں گے اور جب وقت آئے گا تو اسے بخوشی چھوڑ دیں گے اور اس سے بہتر دوسرے لائحہ عمل کو اختیار کر لیں گے۔

آخر میں پھر یہ عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ اس مضمون کا مقصد محض اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی ہے اور اس ذمہ داری سے عہدہ برہونے کی کوشش ہے جو مجھ جیسے لوگوں پر اسلام کی طرف سے عائد ہوتی ہے، نہ کسی کی بے جا مخالفت کرنا اور نہ موافقت کرنا ہے۔

حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ

عہد حاضر کے لئے قرآن کی حکمت، تدبر اور سماجی شعور کی تحقیق، تعلیم اور تربیت کا ادارہ

قرآن مجید کے عملی الہامیاتی اور سماجی شعور اور حکمت کی اعلیٰ تعلیم کیلئے حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ قائم کیا گیا ہے تاکہ مسلمانوں کی موجودہ سماجی ابتری کی صورتحال میں ان کی رہنمائی ہو سکے۔ انسٹیٹیوٹ میں مدارس کے فارغ التحصیل علماء اور دیگر شعبوں کے گریجویٹس کو قرآن مجید کی حکیمانہ تعلیمات کے ایک جامع کورس کی تعلیم دی جائے گی۔ ساتھ ہی زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس ادارہ سے استفادہ کیلئے تین مزید کورس فاصلاتی ذرائع سے کرائے جاتے ہیں۔

حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ کا مقصد ہے کہ، انسانیت کیلئے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی آخری ہدایت اور رہنمائی کی سرچشمہ کتاب قرآن حکیم کی تعلیمات اور اس کی علمی و عملی حکمت سے عہد حاضر کے انسانوں کو مؤثر طریقہ سے بہرہ ور کیا جائے۔ اسی طرح یہاں سے ایسے حکیم و مدبر علماء اور مثالی افراد تیار کیے جائیں، جو عہد حاضر کے انسانی مسائل کو سمجھنے کا پختہ شعور اور عمل کی لگن رکھتے ہوں۔ اسی طرح برصغیر میں حضرت امام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور انکی تیار کردہ جماعت نے علم و جہد کی جو مشعلیں روشن کی ہیں انکو کسی بھی صورت میں بجھنے نہ دیا جائے۔

فاصلاتی کورسز کے لیے داخلا فارم بذریعہ پوسٹ منگوائیں یا پھر ہماری ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کریں۔

www.hikmatequran.org

سرمائیدار قرآن کی عدالت میں

انسانی زندگی، وسیع پہلوؤں اور جہات سے عبارت ہے، جس کے مختلف احوال و اطوار ہیں، لیکن وہ علیحدہ ہونے کے باوجود آپس میں مربوط اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ جسمانی، روحانی، اخلاقی، قانونی، عملی، اعتقادی وغیرہ۔

اسی لئے انسانی زندگی کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے پیش کیا گیا کوئی بھی دستورِ حیات و منشورِ زندگی نامکمل اور ناقص بلکہ اپنے جوہر کے لحاظ سے غیر مفید بھی ہے، جب تک اس میں انسانی زندگی کے متعلق تمام پہلوؤں کا احاطہ نہ کیا گیا ہو۔

اسلام ایک جامع اور مکمل دین اور ہدایت کا آخری پیام خداوندی ہے، جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام تمام نوع انسانی کی ہدایت کے لئے آیا ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اس میں تمام شعبہ ہائے زندگی کے بارے میں ہدایت (ایسے احکام جن پر قانون سازی کر کے زندگی کے تمام رخوں میں توازن اور بیلنس قائم کیا جائے) عطا کی گئی ہے۔

عام طور پر یہ بات تو ہر ایک جانتا اور کہتا بھی ہے کہ اسلام، انسانی زندگی کا مکمل دستورِ حیات ہے، اس میں زندگی کے متعلق تمام رخوں کے بارے میں ہدایت دی گئی ہے، لیکن ہمارا عملی رویہ اور طریقہ کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم اسلام کو محض اس اعتبار سے دیکھتے ہیں کہ اسلام نے اپنی آمد سے مصنوعی و رواجی مذہبی رسمیں، مثلاً بتوں کی پوجا کرنا، نذر و نیاز اور قبروں پر چڑھوا چڑھانا وغیرہ۔ ختم کر دی، ان کی جگہ اللہ واحد کی عبادت اور اس کے لئے نذر و نیاز و قربانی کا انتظام کرنا جیسے اخلاقی و اعتقادی اوصاف کو پھیلایا۔

شرک اور کفر کے الفاظ بھی عام طور پر انہیں معافی میں استعمال کئے جاتے ہیں بلکہ منظور کئے جاتے ہیں۔ ہم بس یہ کہتے ہیں کہ قبل از اسلام، عرب میں بت پرستی عام تھی، بتوں کے لئے نذر و نیاز کیا جاتا تھا، ان کے نام پر لوگ جانور قربان کرتے تھے، ان کا طواف کرتے تھے۔ یہ شرک اور کفر تھا۔ اسلام نے ان کو سماج سے نکال کر ایک اچھا عبادتی طریقہ عطا کیا۔ یہ اسلام اور ایمان کی کل حقیقت ہے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ پہلو اس کی تمام تعلیمات کا ایک حصہ ہے، جس کو آج کل، پورا اور کل سمجھا جاتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ عبادت کرنے والا اور عبادت کے اوقات، احوال و لوازمات کا خیال رکھنے والا آدمی ہماری سوسائٹی میں نیک، صالح، فرمانبردار اور متقی جیسی اوصاف سے جانا اور پکارا جاتا ہے اور عبادت اور اس کی لوازمات سے دور رہنے والا، بدکردار، نافرمان اور غیر متقی وغیرہ صالح کہا جاتا ہے۔

یہ تصور ہماری سوسائٹی میں اتنا پختہ ہو گیا ہے کہ میں تو یہاں تک سمجھتا ہوں کہ اگر بین الاقوامی امریکی استحصالی اسٹیٹ کا چیمپین (Champion) صدر باراک اوباما (Barak Obama) اپنی تمام استحصالی اور استبدادی حرکتوں کے باوجود صرف اپنی زبان پر کلمہ کے الفاظ جاری کرے اور نماز و روزہ کا پابندی سے اہتمام کرے تو ہم کہیں گے کہ یقیناً یہ بندہ قابل ستائش اور متقی و خدا ترس ہے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں پاکستانی تاریخ کا بدترین کردار اور ڈکٹیٹریت کا علامتی اعزاز حاصل کرنے والا ضیاء الحق کچھ لوگوں کے پاس ”صدر شہید“ اور ”اسلام کا چیمپین“ مانا جاتا ہے۔

اسی طرح ایک سرمائیدار اور استحصالی صنعت کار بھی، نماز، روزہ اور مخصوص وضع و قطع رکھنے سے مسلم ممالک میں نیک اور متقی کہا جاتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف حالت یہ ہے کہ اس کی مل، اس کا سرمایہ، اس کی دولت، یعنی پوری پراپرٹی مروجہ سرمائیدارانہ نظام کی مرہون منت ہے، جس کی بنیاد ہی استحصالی محنت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس درخت کی جڑیں، نا انصافی کے پانی سے پھیلتی اور پھولتی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا تقویٰ، پرہیز گاری، فرمانبرداری اور نیک بندے جیسے اصطلاحی الفاظوں کا زندگی کے دوسرے شعبوں سے کوئی تعلق ہے یا یہ الفاظ صرف عبادت تک محدود ہیں؟

خدا کی تمام مخلوق کو جو عیال اللہ ہے، اپنا عیال سمجھ کر اس کے ساتھ عدل و احسان کرنا پرہیز گاری کی بنیاد کیوں نہیں سمجھا جاتا؟ اخلاقیات و معاملات کو اللہ کے حکم کے مطابق چلانا، کیوں تقویٰ کی علامت نہیں سمجھا جاتا؟ جبکہ ان کے برعکس کرنے والے متقی اور پرہیز گار کہلائے جاتے ہیں؟

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ خدا کے احکام زندگی کے تمام شعبوں کے لئے ہیں، صرف عبادت میں بند نہیں۔ عبادت کے علاوہ جب احکام دوسرے شعبوں سے متعلق بھی ہیں تو اطاعت و فرمانبرداری کا تعلق عبادت کی طرح دوسرے شعبوں کے متعلق بھی ہو گا۔ ان شعبوں کو نظر انداز کر کے صرف عبادت میں تقویٰ کو محصور کر کے، کیا تقویٰ اور فرمانبرداری کے تصورات مکمل ہو سکتے ہیں؟ یقیناً نہیں ہو سکتے۔ زندگی کا بنیادی شعبہ معیشت بھی ہے۔

ظاہر ہے کہ اس شعبہ کے متعلق بھی خدا تعالیٰ کی تعلیمات ہوں گی۔ اسلام کی اقتصادیات و معیشت کے متعلق رہنمائی و ہدایت! کچھ ذہن آسانی کے ساتھ اس بات کو تسلیم کرنے سے ڈرتے ہیں۔ لیکن جب ہم قرآن کا مطالعہ اور بغور جائزہ لیتے ہیں تو ہم اس بات کو مانے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اسلام نے اپنے اقتصادی نظام

کو اپنے دین کا بنیادی حصہ قرار دیا ہے۔

اس لئے تقویٰ و فرمانبرداری کے تصورات بلکہ ان کی حقیقتیں ناقص و نامکمل ہیں، جب تک وہ تصورات انسان کی اقتصادی زندگی میں بھی کار فرما نہ ہوں۔ یعنی انسان کی اقتصادی زندگی خدا تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصولوں اور قوانین کے مطابق ہوں، جس میں ظلم اور استحصا سے پاک، عدل و احسان کے تصورات شامل ہوں۔

تقویٰ

عام طور پر تقویٰ کے معنی پرہیز گاری کی جاتی ہے۔ اگر ہم اس لفظ کی وسعت کو دیکھتے ہوئے صرف سادھے انداز میں اس کا مطلب بیان کریں تو ہم ان الفاظ سے بیان کر سکتے ہیں: ”اللہ کے احکامات کی تعمیل کرنا اور ان کی خلاف ورزی سے محفوظ رہنا۔“

اور ظاہر ہے کہ یہ حقیقت اقتصادی نظام سے بھی ایسا ہی تعلق رکھتی ہے، جیسا کہ دوسرے شعبوں سے ہم اس بات کو قرآن کی آیات کی روشنی میں دیکھ کر واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سورہ اللیل میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَىٰ ۚ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ۚ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۝ (اللیل: ۳۱)

”رات کی قسم! جبکہ (اس کی تاریکی کائنات کی تمام اشیاء کو) چھپا دیتی ہے اور روز روشن کی قسم! جبکہ (آفتاب کی بجلی) تمام کائنات کو روشن کر دیتی ہے اور (دراصل) اس خالق کی قسم! جس نے تخلیق عالم کے لیے نر اور مادہ کا وسیلہ پیدا کیا۔“

یعنی جس طرح دن اور رات مختلف ہیں، مذکر اور مؤنث الگ الگ ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ۝ (اللیل: ۴)

”بلاشبہ تمہاری مساعی مختلف قسم کی ہیں۔“

ان مختلف کوششوں اور الگ الگ عملی سرگرمیوں میں سے ایک عملی کوشش کچھ لوگوں کی یہ بتائی گئی ہے:

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۝ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ۝ (اللیل: ۷-۹)

”پھر جس نے (اللہ کی راہ میں) دیا اور تقویٰ کی راہ اختیار کی اور بھلی بات کی تصدیق کی، تو اس کے لیے

ہم آسانی کی راہ ہموار کر دیں گے۔“

اور کچھ لوگوں کی یہ کوشش بتائی گئی ہے:

وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۝ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ۝ (اللیل: ۱۰-۱۲)

”اور جس نے بخل کیا اور اللہ تعالیٰ سے بے نیازی برتی اور بھلی بات کو جھٹلایا، تو ہم اسے بتدریج مشکل

میں ڈال دیں گے۔“

مذکورہ بالا آیتوں میں لوگوں کے دو اقسام بتائے گئے ہیں:

جن میں سے ایک گروہ کی روش ”دینے“ کی ہے، جس کو آیت میں لفظ ”اعطاء“ سے بیان کیا گیا ہے۔ جس کو اللہ نے اپنا پسندیدہ عمل بتانے کے ساتھ اس کو تقویٰ سے بھی تعبیر کیا ہے، جیسا کہ آگے والی آیتوں میں ارشاد ہے:

وَسَيُجْزَىٰهَا أَلَّا تَنفَىٰ ۝ الَّذِي يُوَفِّي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ۝ (اللیل: ۱۸-۱۹)

”اور جو نہایت پرہیز گار ہے وہ اس سے بچا لیا جائے گا، جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے۔“
دوسری روش بخل کی ہے، ”نہ دینے“ کی ہے۔ جس کی مذمت کی گئی ہے، اس کو بے پرواہی اور بے نیازی (حقوق سے غفلت) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اگر آیات کا حاصل مفہوم نکالا جائے تو یہ بتا ہے کہ ایک عمل ”دینے“ کا ہے، جس کو قرآن میں اکثر مقامات پر اقامۃ الصلاة کے بعد متصلاً انفاق و زکوٰۃ کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے اور ان آیتوں میں اس کو تقویٰ کہا گیا ہے۔

جس سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل آسان ہو جاتا ہے کہ جو آدمی اللہ کی راہ میں دیتا ہے، دینے کا راستہ اختیار کرتا ہے، وہ متقی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ کا دروازہ دینے کے راستے سے ہی ہو کر گذرتا ہے۔
اور دوسرا عمل، اس کا مقابل بخل ہے، یعنی اللہ کے راستے میں نہ دینا، اپنے پاس جمع کر کے رکھنا۔ یہ عمل تقویٰ کے بالکل برعکس اور اس کی ضد ہے۔ جس کا مطلب یہ ہو گا کہ بخل کرنے والا اور جمع کر کے اللہ کے رستے میں نہ دینے والا متقی نہیں بن سکتا۔

یہاں ایک اہم نکتہ اور بنیادی بات سمجھنی ضروری ہے

وہ یہ کہ آدمی بخل کیونکر کرتا ہے؟ کس وجہ سے اللہ کے راستے سے دینے سے کتراتا ہے؟ وہ کیا مانع ہے جو آدمی کو دینے سے روکتا ہے؟

اب غور کرو! نہ دینے کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک آدمی کے پاس کچھ نہیں ہے، ظاہر ہے وہ بھی نہیں دے گا۔

ایک آدمی کے پاس ایک دن، ایک ماہ یا ایک سال کا قوت ہے، وہ اس خوف سے نہ دے گا کہ کل کیا کھائے گا، کہاں سے لائے گا۔ سوچے گا کہ تنخواہ سے پہلے کہاں سے اپنا گھر بار چلاؤں گا۔ اناج سے قبل کیا کروں گا وغیرہ۔

اس قسم کے لوگوں کے لئے حکم ہے:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ۝ (۱۱)

(بنی اسرائیل: ۲۹)

”اور (دیکھو!) نہ تو اپنا ہاتھ اتنا سیٹر لو کہ گردن میں بندھ جائے اور نہ بالکل ہی پھیلا دو۔ دونوں صورتوں کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر طرف سے ملامت پڑے اور در ماندہ ہو کر رہ جاؤ۔“

ان دونوں قسموں کے علاوہ ایک آدمی جمع کر کے رکھتا ہے، دیتا نہیں۔ کیوں نہیں دیتا؟ جواب ظاہر ہے کہ دینے سے اس کو خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ مال کم ہو جائے گا۔ میرا کروڑ پتی بننے کا خواب یا خواہش چکنا چور ہو جائے گی۔ میرا ایک بنگلہ ہے، دوسرا نہیں لے سکوں گا۔ ایک بیجورہ گاڑی ہے، دوسری کے لینے کی تمنا دھوری رہ جائے گی۔ بڑا شوروم نہیں بنا سکوں گا۔ بڑا بیوپاری اور سرمایدار کیسے بنوں گا؟ اگر اپنا مال غریبوں کو دوں گا۔ ایسے کتنے ہی غیر ضروری خواہشات کے سمندر اس کے ذہن میں تلاطم برپا کرتے رہتے ہیں، جو اس کے دل سے خوفِ خدا کا نور ختم کر دیتے ہیں، پھر تاریکیوں کے بادل ہر وقت اس کے دل پر منڈلاتے رہتے ہیں، پھر وہ آدمی اپنی ہی خواہشات کا قیدی بن کر ہمیشہ کے لئے ایسا غلام بن جاتا ہے، جو شاید کبھی بھی آزادی کے لفظ سے آشنا ہو سکے۔

یہی آخری صورت بخل کی تقویٰ کی ضد ہے، دوسرے لفظوں میں سرمایہ پرستی، پیسے کا غلام بن جانا، جمع مال کی ایسی ہوس کہ وہ پورے ہونے کے لفظ سے واقف ہی نہ ہو، تقویٰ کے برعکس ہے۔

آپ آیات کے الفاظ میں غور کرو!

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ (اللیل: ۵)

”پھر جس نے (اللہ کی راہ میں) دیا اور تقویٰ کی راہ اختیار کی۔“

وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْلَىٰ (اللیل: ۸)

”اور جس نے بخل کیا اور اللہ تعالیٰ سے بے نیازی برتی۔“

یعنی اعطاء کرنے والا (دینے والا) متقی (تقویٰ کو اختیار کرنے والا) ہے۔ اور ”بخیل“، وہ مستغنی

(سرمایہ پرست اور شاہوکاری کا طلبگار) ہے۔

ترجمہ میں استغناء کے معنی بے نیازی (بے پرواہی) کی گئی ہے، جو لفظ کے اصلی و لغوی معنی ہیں، لیکن جب بے نیازی معیشت کے متعلق ہوگی تو اس سے مراد بخل کی طلب، اس کو جمع کرنا، خدا کے راہ میں نہ دینا ہوگی۔

اسی طرح اعطاء (دینا، اللہ کی راہ میں کھل کر دینا، جس کو تقویٰ کا درجہ دیا گیا ہے) ایک سطحی اور سادہ عمل نہیں، بلکہ یہ لفظ اس متقی انسان کی مسلسل دینے کی روش کی نشاندہی کرتا ہے، گویا ”دینا“ اس آدمی کی زندگی کا جز یا حصہ بلکہ طبیعت ثانیہ بن جاتا ہے۔ اس کو دینے میں مزہ آتا ہے، رکھنے میں خلش اور دل میں ہلکھلک رہتی ہے۔

وہ جتنا حاصل کرتا جائے گا، اپنی ضروریات کے بعد دیتا جائے گا، بلکہ بعض اوقات تو اپنی ضروریات پر

بھی دوسروں کو ترجیح دے گا:

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر: ۹)

”اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ خود محتاج ہی کیوں نہ ہوں۔“

اور یہی تقویٰ ہے، کہ اللہ کی مرضی کے مطابق عمل کرنے میں مزہ آئے اور اس کے خلاف کرنے میں خلش پیدا ہو۔

بخل کو بھی اسی طرح سمجھنا چاہیئے۔ قناعت و کفایت شعاری کا نام بخل نہیں، جیسا کہ ہم کرتے ہیں کہ جب کوئی دوستی اور قرابتداری میں خرچ نہیں کرتا تو کہتے ہیں کہ: ”یار! فلاں تو کوئی بخیل ہے۔“

بلکہ مطلب ہے کہ دولت کی ہوس، مال جمع کرنے کی کبھی نہ پوری ہونے والی خواہش، سرمایہ پرستی۔ گویا زندگی کا مقصد و محور دولت حاصل کرنا اور اس کو عیاشی پر لٹانا ہے۔ ایسی ہی روش والوں کے لئے اس سورہ میں آگے ارشاد ہے:

وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ۖ فَأَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّىٰ ۚ لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى ۖ الَّذِي

كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ (اللیل: ۱۶ تا ۱۳)

”اور یقیناً آخرت اور دنیا ہمارے ہی لیے ہیں۔ پس میں نے تمہیں دہکتی آگ سے آگاہ کر دیا ہے۔ اس میں نہیں جھلسے گا مگر انتہائی بد بخت۔ جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔“

اسی طرح اس وعید سے بھی دل کانپ اٹھتا ہے جو وحی کی ابتدائی نازل ہونے والی ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے، اگرچہ یہ آیتیں پہلی وحی نہ صحیح، البتہ وحی کے ابتدائی زمانہ سے بھر حال ان کا تعلق ہے۔

سرمائے پرست کو لاکار اجار ہا ہے:

كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِٖ لَكَنَافٍ ۚ ۚ أَنْ رَّأَاهُ اسْتَغْلَىٰ (العلق: ۷ تا ۶)

”ہرگز نہیں، انسان حد سے نکل جاتا ہے۔ اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے۔“

(لیطیٰ پر بحث آگے آئے گی۔)

وہ اپنے آپ کو سرمایہ پرست دیکھنا پسند کرتا ہے۔

(یہاں پر بھی الاستغناء والا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو اوپر والی آیات میں مذکور ہے۔)

مفسرین حضرات نے اس سے مراد ابو جہل لیا ہے، لیکن مصداقِ آیت ہر سرمایہ پرست ہے۔

ہمارے ہاں عام طور پر ابو جہل کو ایک بت پرست علامتی کردار کے طور پر متعارف کرایا جاتا ہے یا جانا

جاتا ہے، لیکن یہاں پر اس کی شناخت بت پرستی کے ساتھ مستغنی یعنی سرمایہ پرست سے بھی کرائی گئی ہے۔

أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ ۖ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ ۖ أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَىٰ الْهُدَىٰ ۖ أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَىٰ ۖ

(العلق: ۱۳ تا ۹)

”بھلا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو منع کرتا ہے؟ ایک بندے کو، جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ بھلا آپ ہی بتائیں کہ اگر وہ بندہ راہِ راست پر ہو، یا پرہیز گاری کی تلقین کرتا ہو۔“

نماز پڑھنے والے بندے سے مراد حضور ﷺ ہیں۔ جن کو وہ بت پرست اور سرمایہ پرست نماز پڑھنے اور تقویٰ اختیار کرنے کی تبلیغ کرنے سے منع کرتا ہے، اس کے پروگرام میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔

اب ان آیات میں غور کرو! لیطغی اور استغنی میں تدبر کرو! اب دیکھو! اگر سرکش (لیطغی) سے مراد سرمائے پرست کو چھوڑ کر صرف بت پرست لے تو پھر وہ بت پرست اللہ کی جس صلاۃ و عبادت سے منع کرتا ہے، وہ صرف نماز (عبادت) نظر آئے گی۔ لیکن اگر سرکشی کے لفظ (لیطغی) کو استغنی کے تناظر میں دیکھا جائے (جیسے کہ سورہ اللیل میں استغناء کے معنی طلب مال و جمع مال ہیں) اور یہ بھی یاد رہے کہ لیطغی کی آگے تفسیر الاستغناء سے کی گئی ہے۔ (یعنی وہ سرکش ہے، وہ اپنے آپ کو سرمایہ پرست دکھانا پسند کرتا ہے) اور تقویٰ کو دینے کے مفہوم کے تناظر میں دیکھا جائے تو پھر سرکش انسان (ابو جہل) آپ کو بت پرست ہونے کے ساتھ سرمائے پرست بھی نظر آئے گا۔

اور حضور ﷺ عبادت اور نماز قائم کرنے والے، خدائے واحد کی پرستش کے تمام لوازمات کے امین ہونے کے ساتھ سرمایہ شکن، تقویٰ یعنی دینے والی روش اختیار کرنے والا، اس کی پرچار کرنے والا بندہ سمجھ میں آئے گا۔

(مطلب یہ ہو گا کہ ابو جہل ایک سرمائیدار ہے، جمع کرنے اور رکھنے والا ہے جو آپ ﷺ کے پروگرام میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے، کیونکہ آپ ﷺ کا پروگرام سرمایہ شکن اور ”نہ رکھنے“ بلکہ ”دینے“ کے اصولوں پر قائم ہے۔)

جب آیت کا اس اعتبار سے مطلب لیا جائے گا تو آپ ﷺ کی نماز حضرت شعیب علیہ الصلاۃ والسلام کی نماز کی طرح صرف بت شکنی کا درس نہیں دیتی بلکہ سرمایہ شکنی کا بھی درس دیتی ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہے:

قَالُوا اَيُّشَعْيَبُ اَصْلُوْكَ تَأْمُرُكَ اَنْ تَتْرُكَ مَا يَعْْبُدُ اٰبَاؤُنَا اَوْ اَنْ تَفْعَلَ فِىْ اَمْوَالِنَا مَا نَشَآءُ اِنَّكَ لَآَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿٨٤﴾ (ہود: ۸۴)

”لوگوں نے کہا: اے شعیب! تیرا یہ نمازیں (جو تو اپنے خدا کے لیے پڑھتا ہے) تجھے یہ حکم دیتی ہیں کہ ہمیں آکر کہے: ”ان معبودوں کو چھوڑ دو جنہیں تمہارے باپ دادا پوجتے رہے ہیں، یا یہ کہ تمہیں اختیار نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہو کرو۔“ بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو!“

یہاں غور کرنے کے قابل یہ بات ہے کہ ایک سرکش (ابو جہل) ایک سرمایہ پرست ہونے کی حیثیت سے اللہ کے بندے (محمد ﷺ) کو صلاۃ سے کیوں روکتا ہے؟ اور کیا صرف بتوں کی مخالفت کی وجہ سے اس

نماز کا ادا کرنے والا تکلیفیں اٹھاتا ہے، مشقتیں برداشت کرتا ہے، یا یہ کہ سرمایہ پرست کی خواہشات کے لئے بھی اس میں حوصلہ شکنی ہے؟

یہ دیکھنے اور سمجھنے کے بعد آئیے ان آیتوں کو دیکھیں جو سرمایہ پرست کو لاکار رہی ہیں۔

كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ﴿٥﴾ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ﴿٦﴾ فَلْيَنْعُ نَادِيَهُ ﴿٧﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ﴿٨﴾ (العلق: ۱۸ تا ۲۱)

”ہرگز نہیں، اگر یہ شخص باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر اس کو گھسیٹیں گے۔ وہ پیشانی، جو جھوٹی اور خطا کار ہے۔ وہ اپنی مجلس (کے حامیان) کو بلا لے۔ ہم بھی دوزخ کے فرشتوں کو بلا لیں گے۔“

سورہ علق میں ایک لفظ لیطغی آیا ہے، یہ مادہ یا اس کے قریب المعنی دوسرے الفاظ قرآن میں بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔

اس کے معنی ہیں، سرکشی اختیار کرنا، حدود سے تجاوز کرنا۔

سورہ علق کی آیتوں میں ابو جہل کی سرکشی کا بیان ہے۔

اور ابو جہل کی ایک بنیادی سرکشی، معیشت کے بارے میں اس کی روش تھی۔ یعنی وہ سرمایہ پرست اور مال و دولت کا پوجاری تھا۔ (اور ہم نے کہا تھا کہ آگے سرکشی کا تفصیل و بیان الاستغناء سے کیا گیا ہے، جس کا دوسرا مطلب یہ ہوا کہ سرکشی سے مقصد ہے سرمایہ پرستی، مال و دولت جمع کرنا) اب جہاں کہیں بھی قرآن میں یہ مادہ یا اس کے قریب المعنی الفاظ آئیں گے، وہاں اس معنی (سرمایہ پرستی) کو بھی ضرور ملحوظ رکھنا ہو گا۔ ایک جگہ آیا ہے:

اِذْهَبْ اِلَى فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغٰى ﴿٢٣﴾ (طہ: ۲۳)

”(نیز حکم ہوا) اے موسیٰ! تو فرعون (یعنی بادشاہ مصر) کی طرف جا۔ وہ بڑا شرکش ہو گیا ہے۔“

اس معنی میں ایک لفظ طاغوت بھی آیا ہے، جو کہ نمرود کو علامتی کردار کے طور پر پیش کر رہا ہے۔

ہدایت و گمراہی، ہمارے ہاں دو متضاد حقیقتوں کے طور پر متعارف ہیں۔

جن درویشوں کا اوپر ذکر ہوا ہے، (یعنی ایک تقویٰ اور دینے والی، دوسری بخل اور روکنے والی) ان دونوں روشوں کو بھی ہدایت اور گمراہی کی دو متضاد حقیقتوں کی روشنی میں دیکھنا اور سمجھنا چاہیے، جیسا کہ سورہ فاتحہ میں ہدایت کے راستہ پر قائم رہنے اور گمراہی کی راہ سے محفوظ رہنے کے لیے دعا کے پیرایہ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اوپر ذکر کی گئی دونوں روشوں کو اگر ہم ہدایت و گمراہی کی دو متضاد راہوں کے تناظر میں دیکھیں تو ہمیں ان آیات کو سامنے رکھنا چاہئے، جن میں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں روشوں کو مذکورہ تناظر میں اس طرح بیان کیا ہے:

وَهٰذِيْٓنَا السُّجَّدٰتِیْنَ ﴿٥﴾ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿٦﴾ وَمَا اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿٧﴾ فَكِّرْ رَقَبَةً ﴿٨﴾ اَوْ اِطْعَمْ

فِي يَوْمٍ ذِي مَسْجَبَةٍ ۖ يَتَّبِعُهَا ذَا مَفْرَبَةٍ ۖ أَوْ مَسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿١٥﴾ (البقرہ: ۱۶۳۱)

”اور کیا ہم نے اسے سعادت و شقاوت کی دونوں راہیں نہیں دکھا دیں؟ پس وہ نہ دھمک سکا گھائی (عقبہ) پر۔ تم سمجھے کہ (ہم نے جو یہاں) عقبہ (کا لفظ کہا ہے، سواس) سے کیا مقصود ہے؟ (عقبہ سے مراد یہ ہے کہ) انسان کی گردن کو غلامی کے پھندے سے چھڑا دینا۔ بھوکوں کو کھانا کھانا اور یتیم کو (علی الخصوص) جب کہ وہ اپنے قریبی لوگوں میں سے ہو۔ اور محتاج و مسکین کی مدد کرنا۔“

یہ ہدایت کی روش ہے، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ گمراہی کی روش، نہ دینے اور انفاق کی بجائے خیرہ اندوزی، زرا اندوزی اور جمع کرنے کی ہوگی۔ اب سورہ مدثر کی طرف آؤ! دیکھو یہاں اللہ تعالیٰ نے مذکورہ روش والوں کو کس طرح لکا رہا ہے؟

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ﴿١١﴾ وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا ﴿١٢﴾ وَبَنِينَ شُهُودًا ﴿١٣﴾ وَمَهْدُتٌ لَهُ مَنَهِيْدًا ﴿١٤﴾ ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ ﴿١٥﴾ (المدثر: ۱۵ تا ۱۱)

”تم مجھے اور اس شخص کو چھوڑ دو، جسے میں نے اکیلا پیدا کیا۔ اور (پھر) اسے بہت سامان دیا اور سامنے موجود رہنے والے بیٹے دیے۔ اور ہر طرح کا سامان اس کے لیے مہیا کر دیا پھر (اس پر بھی) وہ طمع رکھتا ہے کہ اسے اور زیادہ دوں۔“

اسی طرح مال کی کثرت کے طلبگاروں کے لئے سورہ تکوین میں بھی وعید آئی ہے۔

أَلْهَكُمُ الشَّكَاوَةُ ۖ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴿١﴾ (الشکاوہ: ۲۳۱)

”کثرت لہذا اند اور فوائد دنیوی کی غفلت نے تمہیں بیدار نہ ہونے دیا! یہاں تک کہ قبروں کا چہرہ تمہیں نظر آگیا!“

سورہ ہمزہ میں بھی مال و دولت کو جمع کرنے کی مذمت بیان کی گئی ہے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ﴿١﴾ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ﴿٢﴾ (الہمزہ: ۲۳۱)

”تنباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو عیب جو اور طعنہ زن ہے۔ جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن رکھا۔“

ان آیات اور مذکورہ نتائج سے یہ بات کھل کر سامنے آئی جاتی ہے کہ قرآن کے نقطہ نگاہ سے مال جمع کرنا، سرمایہ پرستی کی خواہش کرنا گمراہی کا راستہ اور تقویٰ کی ضد ہے۔

لامحدود سرمائے حاصل کرنے کی روش بڑی خطرناک روش ہے، یہ روش معاشرے میں گناہوں کی حقیقی محرک ہے۔ اس روش سے سوسائٹی میں فتنہ اور فساد اور گونا گوں قسم کی ہلاکتیں جنم لیتی ہیں۔

یہ روش ناانصافی اور ظلم کو جنم دیتی ہے۔ اس کی وجہ سے بخل، خود غرضی اور دھوکہ دہی جیسے جرائم پیدا ہوتے ہیں۔ ایک جگہ آیا ہے:

وَيَقُومُوا أَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْيَمِزَانِ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَتَعَوَّافِي

الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٥﴾ (ہود: ۸۵)

”اور اے میری قوم کے لوگو! ناپ اور تول انصاف کے ساتھ پوری پوری کیا کرو، لوگوں کو ان کی چیزیں (ان کے حق سے) کم نہ دو اور ملک میں شر و فساد پھیلاتے نہ پھرو!“

یہ سرمایہ پرستی محنت کا استحصال کرتی ہے، مزدور کو اپنا حقیقی حق محنت عطا کرنے سے رکاوٹ بنتی ہے، ہاری کے ہاتھوں سے اناج چھین لیتی ہے۔ اسی طرح یہ روش مارکیٹنگ پر اجارہ داری قائم کر کے قیمتوں کو اپنی من مانی پر بڑھاتی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ بھی ہے کہ لامحدود سرمایہ دوسروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھائے بغیر، استحصال کیے بغیر ناممکن ہے، اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ یہ روش انسانی ہلاکت کا بھی باعث بنتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ سرمایہ دار جو دوسروں کے استحصال پر اپنی عیاشی کی محلاتیں تعمیر کرتا ہے، محنت کش کا حق سلب کر کے اربوں روپیوں کا نفع کماتا ہے، دوسروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اشیاء کی قیمتیں مصنوعی طریقوں سے بڑھا کر کروڑوں روپیوں کا نفع حاصل کرتا ہے، کیا وہ چندر رسمی عبادات اور چند ہزار زکوٰۃ کے ادا کر کے متقی بن سکتا ہے؟ اس کا اب استحصالی مال، حلال و پاک بن جاتا ہے؟

جب ایسی سرمایہ داریت ایک ازم کی شکل اختیار کر لے تو اللہ کی مشیت ایسا نظام ختم کرنا چاہتی ہے، وہ ایسے اسباب پیدا کرتی ہے، جو نیچے طبقہ کو اوپر لے آئیں اور توازن قائم کریں۔ اسی کا نام انقلاب ہے۔ اور حقیقی متقی اور مومنین وہ ہیں جو ایسے نظام کو ہلاک و تباہ کرنے والی کوششوں کا حصہ بنیں۔

اردو شرح حجۃ اللہ البالغہ

تصنیف: حجۃ الاسلام امام شاہ ولی اللہ

شارح: مجدد العصر حکیم الاسلام، امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی

مولانا عبید اللہ سندھی نے قرآنی انقلابی تعلیم سے متاثر ہو کر اپنے آبائی دین، اپنے ماں باپ، عزیز رشتہ دار اور آخر میں اسی تعلیم کو سر بلندی دینے کے لئے وطن عزیز تک کو خیر باد کہی۔ اس نے امام الحکمت، امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفے کو زندہ کیا، زندہ کیا کیا اسے آج کل کے اہل عقل کو سمجھانے کے لئے ان کی زبان میں پیش کیا۔ اہل وطن ابھی اس کی صحیح عظمت کو نہیں پہچان سکے اور اس بے نفس فاضل یگانہ کے انقلابی کارناموں سے بے خبر ہیں۔ لیکن اہل ہند بالعموم اور ہندوستانی مسلمان بالخصوص اس صابر و شاکر، نفس کش، فقیر منش انقلابی کے کارناموں کا صحیح اندازہ لگانے کے قابل ہو جائیں گے تو اس کی پوری پوری قدر پہچانیں گے۔ اس وقت انہیں معلوم ہو گا کہ حضرت مولانا عبید اللہ سندھی نے ان کو امام الحکمت، امام ولی اللہ دہلوی سے روشناس کرا کے ان پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔

صفحات: 335، ہدیہ: =/250 روپے

شاہ ولی اللہ کے اقتصادی نظریات و افکار

شاہ ولی اللہ ایک دینی عالم اور رہبر ہے، آپ کا مقصد دینی تعلیمات کی صداقتوں کو بدلتے ہوئے حالات کے مطابق لاجیکل اور سائنٹیفک اصولوں پر سمجھانا تھا۔ یعنی شاہ صاحب ایک دینی عالم تھے اور دین کو زندگی کی اصل و غایت قرار دیتے ہیں۔ اسی نظر سے زندگی کو دیکھتے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کے نزدیک دین کا تصور بڑا وسیع اور جامع ہے۔ دین ایک ہی ہے، باقی اس کے مختلف مظاہر اور اشکال و صورتیں ہیں۔ دین زندگی کو ایک مقصد عطا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ زندگی کے بارے میں جو شاہ صاحب کا فلسفہ ہے، وہ البتہ دوسرے مذہبی لوگوں سے علیحدہ نہیں۔ ان کے خیال میں زندگی محدود نہیں اور نہ ہی وہ محدود ہو سکتی ہے اور نہ وہ موت پر ختم ہوتی ہے۔

عام طور پر دین کو مابعد الطبیعیاتی نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے اور مذہب اور دین کی ضرورت بھی اسی حوالے سے پیش کی جاتی ہے، جیسا کہ ابن خلدون نے کہا ہے^۱۔ لیکن شاہ صاحب دین کو ایک ہمہ گیر اور اس دنیا کی اور آخرت کی زندگی کے متعلق تمام شعبہ جات کو مربوط کر کے پیش کرتے ہیں۔ یہ بات شاہ صاحب کے فلسفے اور حکمت کے بنیادی اصولوں میں سے ہے، اسی وجہ سے شاہ صاحب دنیا اور آخرت دونوں کی اصلاح کو نبوت کے مقاصد میں شمار کرتے ہیں، جیسا کہ حجۃ اللہ البالغہ میں ارتقاات پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فاعلم! ان اصل بعثة الانبياء وان كان لتعلم وجوه العبادات والا وبالذات لكن قد تنضم مع ذلك ارادة احوال الرسوم الفاسدة والحث على وجوه من الارتقاات وذلك قوله (ﷺ) بعثت

^۱ ابن خلدون کی رائے یہ ہے کہ انسان کو نبوت کی ضرورت فقط اس زندگی کے بعد آخرت کی زندگی اور اس کے امور معلوم کرنے کے لیے پڑتی ہے۔ جہاں تک اس دنیا کی معیشت کا تعلق ہے، انسان اپنے ان معاشی نظاموں کے لیے نبوت کا محتاج نہیں۔ ابن خلدون اپنے اس دعوے کے ثبوت میں یہ دلیل دیتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ قومیں جو مسلمان نہیں، ان میں دنیاوی ترقی موجود ہے، وہ اگرچہ نبوت کی روشنی سے محروم ہیں، لیکن اس کی وجہ سے ان کی دنیاوی ترقی میں کوئی حرج نہیں ہوا۔ اس سے ابن خلدون یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ نبوت بعض آخرت کے مسائل پر محدود ہے اور دنیا کے معاملات میں اس کا دخل نہیں۔

نبوت کے متعلق ابن خلدون کے اس نظریے نے عربوں کی ذہنیت پر بہت اثر ڈالا ہے۔ عرب ابن خلدون سے بڑھ کر اپنے ہاں کوئی اور حکیم نہیں پاتے۔ اور ابن خلدون کا یہ حال ہے کہ وہ نبوت کو محض آخرت کی گتھیاں سمجھانے کے لیے وقف مانتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ دنیاوی ترقی کے لیے انبیاء کی ضرورت ہی نہیں۔ لا محالہ ابن خلدون کا یہ فکر انسان کو دنیا کے معاملات میں مستغنی کر دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ افراد اور قوم کے حق میں بھی خوش آئندہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ نبوت کو صرف امور آخروی کا دار سمجھنے سے یہ ہوا ہے کہ آج کے عرب دنیاوی امور کو حل کرنے کے لیے بے بسی پورنی حکماء کے افکار اور ان کے پروپیگنڈے کے شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن شاہ صاحب نے نبوت کی جو تشریح کی ہے، اس کا فائدہ یہ ہے کہ شاہ صاحب ہی حکمت پڑھنے والا اس مصیبت سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ (شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، ص: ۲۰۶ تا ۲۰۵ سندھ ساگر اکادمی)

لسحق المغازف وقوله عليه الصلاة والسلام بعثت لاتيهم مكارم الاخلاق (حجۃ اللہ البالغہ: ج ۲، ص: ۲۳۰ باب اقامة الارتقاات واصلاح الرسوم، زمزم پبلشرز)

”یہ واضح رہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا منشاء اگرچہ بالذات عبادات الہی سے متعلق ہے، مگر عبادات کے ساتھ ساتھ اس منشاء میں رسوم فاسدہ کو فنا کر کے اجتماعی زندگی میں بہترین نظام کا قیام بھی شامل ہے۔ اور اسی لئے پیغمبر ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: بھیجا گیا ہوں میں گانے بجانے کے آلات کو مٹانے کے لئے اور میں اس لیے مبعوث کیا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔“

یہ ہے ذہنی پس منظر شاہ صاحب کے جملہ افکار و تصورات کا اور اسی کی روشنی میں ہمیں ان کے اقتصادی نظریات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے خیال میں برصغیر پاک و ہند میں شاہ صاحب وہ پہلے حکیم و فلاسفر تھے، جنہوں نے علم معیشت پر باقاعدہ قلم اٹھایا، نہ صرف یہ کہ علم معیشت کو دین کا بنیادی حصہ قرار دیا بلکہ اس کا دوسرے شعبہ ہائے زندگی سے جو تعلق تھا، اس کو بھی واضح کیا۔ حقیقت تو یہاں تک ہے کہ شاہ صاحب کے بعد یورپ میں جو سیاسی تحریکات وجود میں آئیں، وہ اقتصادی نظام کے بنیاد پر تھیں، لیکن حضرت سندھی کا کہنا ہے کہ ان تحریکوں سے بہت پہلے شاہ صاحب سیاست اور اقتصادیات کے باہمی ربط پر روشنی ڈال چکے تھے۔ بقول حضرت سندھی:

”شاہ صاحب نے سیاسی اقتصادیات پر وگرام کو سیاست کی اہم اساسی مقلات میں سے تسلیم کیا ہے۔“

آگے فرماتے ہیں: ”روس کے انقلاب نے دنیا کو سیاسی اقتصادیات کے نظام سے آشنا کر دیا ہے، جب ہم نے اس کو دیکھا، تب ہمیں حجۃ اللہ البالغہ کے اس بحث کی عظمت سمجھ میں آئی۔“ (تفسیر سندھی، ج ۱، ص: ۳۰)

اور شاہ صاحب کے فکر میں ایسی ہم آہنگی اور ترتیب و ارتباط ہی کی وجہ سے مولانا سندھی نے لکھا ہے: ”بفضلہ تعالیٰ اس قدر وسعت فہم پیدا ہونے کے بعد ہم امام ولی اللہ کی تحریک کو کارل مارکس کے نظریات کے مقابلے میں دنیا کے لیے زیادہ مفید ثابت کر سکتے ہیں۔“ (شاہ ولی اللہ اور اس کی سیاسی تحریک، ص: ۷۰ سندھ ساگر اکادمی)

اس کی وجہ ایک جگہ یہ بیان کی ہے کہ: ”اس وقت یورپ میں امپیریلزم کے رد عمل کے طور پر، جو غلط سیاست اور غلط مذہبیت کی پیداوار تھا، کمیونزم پیدا ہو چکا ہے، اس میں خدا کا انکار لازمی ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کے انکار کی وجہ سے ہی وہ بھی امپیریلزم کی شکل اختیار کرتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا پہلا قدم استعماریت ہے، جس کا لازمی نتیجہ امپیریلزم ہو گا۔ اسے دوسری بڑی جنگ ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء میں امپیریلٹ طاقتوں کے ساتھ مل کر کام کرنا پڑا، جس کی وجہ سے اسے اپنا کنٹرنن یعنی بین الاقوامی نظام توڑ کر ان سرمایہ دار طاقتوں کے ساتھ مصالحت کرنی پڑی۔ نام نہاد کمیونزم میں جس قدر مسکین نوازی ہے، اس سے کہیں زیادہ مسکین نوازی

امام شاہ ولی اللہ کے فلسفہ میں ہے اور اس میں مزدور اور کاشت کار کے حقوق کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ لیکن اس کی بنیاد خدا کے صحیح اور شفاف تصور پر ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک کارکن اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس زندہ تصور کے ساتھ گزارتا ہے کہ خدا تعالیٰ اس کے سامنے ہے یا کم از کم یہ کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ یہ تصور بھی ایک زندہ اور پائیدار شکل میں اپنے سامنے رکھتا ہے کہ اگر اس نے کم تو لایا کسی کے حق کو ناجائز طور پر پاؤں تلے روند اتو وہ دنیا میں بھی سزا پائے گا اور مزید مرنے کے بعد بھی اسے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے عملوں کی جوابدہی کرنی ہوگی۔“ (عنوان انقلاب، بحوالہ شاہ ولی اللہ کا نظریہ معیشت اور عصر حاضر میں اس کی افادیت، ص: ۳۹ تا ۵۰ طیب پبلشرز)

شاہ صاحبؒ کے اقتصادی نظریات میں تین چیزوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہے:

۱۔ اخلاق اور معیشت کا باہمی تعلق

۲۔ عدل اور

۳۔ تصور ملکیت

اخلاق اور معیشت کا باہمی تعلق

حکیم الہند امام شاہ ولی اللہ، اسلامی تاریخ بلکہ دنیا کے پہلے مفکر اور فلاسفر ہے جس نے انسانی زندگی کو دو ارتقاات میں تقسیم کر دیا:

(۱) معاشی ارتفاق (۲) الہی ارتفاق۔ پھر ان دونوں کے باہمی ربط و ارتباط کو بھی واضح کیا۔ ایک کے اثرات دوسرے پر جو مثبت یا منفی انداز میں پڑتے ہیں، ان کو بھی بیان کیا۔

شاہ صاحبؒ کے فکر میں تصوریت پسندانہ نظریہ کو رد کر دیا گیا ہے، بلکہ سماجی ارتقا اور سماج کی تشکیل میں جو مادی اور کائناتی اصول کار فرما ہیں، ان کی بنیاد پر آپ حقائق کو منکشف کرتے ہیں پھر ان کا اخلاقیات سے جو تعلق ہے، وہ بتاتے ہیں اور قوموں کے عروج و زوال میں معیشت کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی لکھتے ہیں:

”شاہ صاحبؒ کے نزدیک اقتصادی عدم توازن نے مذہب کے سر بہ فلک قلعوں کو مسمار کیا ہے، اس لئے سماج کی اقتصادی اصلاح، مذہبی اور اخلاقی اور اصلاحی اور روحانی کمالات اور ترقی کے لئے سب سے بڑی ضرورت ہے۔ وہ سوسائٹی کی اقتصادی اصلاح کو انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا اہم جزو قرار دیتے ہیں۔“ (شاہ ولی اللہ کا سیاسی و سماجی فلسفہ، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی؛ امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات، ص ۲۲۰ تا ۲۲۱)

”شاہ صاحبؒ سے پہلے جتنے بھی دانشور اور مفکرین گذرے ہیں، ان میں سے غیر مسلم مفکرین ہوں یا مسلم مفکرین۔ وہ اس سلسلے میں علم مابعد الطبیعیہ (Meta physics)، علم فزکس (Physics)، علم ارتقا (Evolution)، علم النفس (Psychology)، علم منطق (Logic)، جمالیات (Aesthetics)، فلسفہ قانون (Philosophy of law)، سماجی علم / سماجیات (Sociology) اور فلسفہ تاریخ (Philosophy of History) کا ذکر تو کرتے ہیں، لیکن اجتماعی اخلاق کا جو تعلق علم معیشت سے ہے، وہ اس کا اشارہ تک بھی نہیں کرتے۔

یونانی حکماء میں سے ارسطو (Aristotle)، افلاطون (Plato)، سقراط (Socrates)، اپی کیور (Epicure) وغیرہ نے ان دونوں موضوع پر لکھا ہے اور خوب لکھا ہے، لیکن ان کے باہمی ربط پر کسی نے قلم نہیں اٹھایا۔ مسلم حکماء میں سے ابن مسکویہ، غزالی، ماروردی، راغب، کندی، فارابی، ابن سینا، ابن رشد، ابن خلدون، ابن عربی وغیرہ نے انفرادی اخلاقیات پر طویل بحثیں کی ہیں، ہر ایک خلق و وصف کی بال کی کھال اتاری ہے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی اجتماعی اخلاق اور معاشیات کو ملا کر بحث نہیں کی۔ مغربی حکماء میں سے کانت (kant)، سپنر (Spencer)، شوپنہار (Schopenhauer)، ڈی کارٹ (Descartes)، مل (Mill)، سپنوزا (Spinoza) اور ہیگل (Hegel) نے اجتماعیات و اخلاقیات پر بہت کچھ لکھا ہے، لیکن ان کے باہمی ربط پر کسی نے بھی روشنی نہیں ڈالی۔“ (شاہ ولی اللہ کا فلسفہ عمرانیات و معاشیات، اخلاق و معیشت کا تعلق اور شاہ ولی اللہ)

اب تک حکماء یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ بلند اخلاقی نظریات سے اجتماعی اخلاق بلند ہو سکتے ہیں، اس لئے ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ اجتماعیات کو اخلاقیات کے ماتحت رکھا جائے۔ لیکن ان انفرادیت پسند صوفیاء اور حکماء، جنہوں نے اخلاق کو معاشیات پر مقدم رکھا ہے، ان کے اس رجحان کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ نہ تو افراد کی صحیح خطوط پر تعمیر اور تشکیل ہو سکی ہے، جس کے کوئی قابل قدر نتائج و اثرات سوسائٹی اور کلچر پر مرتب ہوتے ہوں، یا وہ اخلاقی اقدار قوم کی مجموعی یا مشترک نفسیات کا حصہ بن سکے ہوں۔ اور نہ ہی سماج اخلاقی لحاظ سے مستحکم اور مضبوط ہوا ہے۔ جیسا کہ مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں: ”عام طور پر تصوف فلسفہ اخلاق سے شروع ہوتا ہے، گو حیوانی زندگی کے لئے اقتصادی ضروریات کا اعتراف کیا جاتا ہے، لیکن انسانیت کے ساتھ اقتصادیات کا جو تعلق ہے، اس پر کسی نے توجہ نہ کی۔ اس کی وجہ سے ہماری سیاست کھوکھلی ہو گئی۔ ہمارے بڑے بڑے عقلمند اور زیادہ با اخلاق صوفیہ سب کے سب اجتماعی سیاست سے دور رہنا پنا کمال سمجھتے رہے۔ تصوف کی کتابوں کی سب سے بڑی کوتاہی یہی تھی کہ ان کے مدون کرنے والوں نے انسانی اخلاق اور اقتصادیات کے باہمی رشتے اور ان کے ایک دوسرے سے متاثر ہونے کی اہمیت کو نہ سمجھا۔“ (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۳۲ تا ۳۳۔ سندھ ساگر اکادمی)

اس کے برخلاف امام شاہ ولی اللہؒ کا نظریہ یہ ہے کہ اجتماعی معاشیات کا اجتماعی اخلاق پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے، لہذا صحت مند معاشی نظام، صحت مند تہذیب کے ظہور پذیر ہونے کے لیے ناگزیر ہے۔ جب تک قوم کے جسم کے اندر فاسد معاشی نظام کا خون گردش کر رہا ہو، تب تک اجتماعی اخلاق کا حسن نکھر کر نمایاں نہیں ہو گا۔ جب وہ بیماری ختم ہو جائے گی تو اخلاقیات کا تازہ خون ان کے جسم میں پھیلے گا، جس کے نتیجے میں ایسے ثمرات پیدا ہوں گے، جن کی خوشبو سے معاشرہ مہک اٹھے گا۔ اسی لئے اجتماعی اخلاق کی درستگی کے لئے ضروری ہے کہ اجتماع انسانی میں عادلانہ نظام معیشت قائم کیا جائے۔

جیسا کہ قاضی جاوید لکھتے ہیں: ”اسی طرح شاہ ولی اللہؒ نہایت واضح انداز میں غیر انسانی معاشی نظام سے پیدا ہونے والے نفسیاتی اثرات کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ یہ غیر انسانی معاشی نظام انسانوں کو جملہ انسانی صفات سے محروم کر کے نیم انسانوں بلکہ حیوانوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ عمل صرف محنت کشوں ہی کے ساتھ نہیں ہوتا، بلکہ بالاتر طبقات بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔

محنت کش جبری مشقت پر مجبور ہوتے ہیں اور آزادی جسمانی و روحانی توانائی کو ترقی نہ دے سکنے کی بنا پر اپنے جسم کو فنا اور اپنی روح کو تباہ کر لیتے ہیں، اس طرح پوری نسل انسانی ایک غیر انسانی صورت حال کا شکار ہو جاتی ہے، جو بقول شاہ ولی اللہؒ محرموں اور ذہنی مریضوں کو جنم دیتی ہے۔“ (فکر شاہ ولی اللہؒ ص ۱۹۳)

اس بات کو ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ”شاہ صاحب کے خیال میں سونے اور چاندی کے انباروں سے زیادہ خطرناک وہ طرز معاشرہ ہے جو امیر و غریب میں امتیاز قائم کر کے غریبوں کے دلوں میں سرمایہ داری کی ہوس پیدا کرتا ہے۔ سونے چاندی کے برتن، زرق برق ریشمی اور بیش قیمت لباس، فیشن اور تکلفات امیروں کے دماغ میں کبر و غرور اور برتری کا تصور پیدا کرتے ہیں اور ناداروں کے دلوں میں حرص و طمع وہ اضطراب پیدا کر دیتی ہے جو ان کو رشوت ستانی، چوری، خیانت اور عصمت فروشی اور دوسرے جرائم پر آمادہ کرتا ہے۔ غرض کہ سماجی زندگی کے بیش قیمت تکلفات، سرمایہ داری اور شاہ پرستی وہ زہریلے جراثیم ہیں کہ جب تک قانون ان کی اجازت دیتا رہے گا، سرمایہ داری کی جڑیں مضبوطی ہوتی رہیں گی۔ دوسری طرف نادار اور حریص لوگوں میں جرائم کا میلان بڑھتا رہے گا۔“ (شاہ ولی اللہ کا سیاسی اور سماجی فلسفہ، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات، ص ۲۲۳)

ایک جگہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں:

ولما كان الشئ الساري في زمن ابراهيم عليه السلام هو نسيان التوحيد نزل الحق باياته باساعة التوحيد وتوليد العبادات من طهارة وصلوة وذكوة وحج وصوم وذكاة ولما كان الشئ الساري في زمن نبينا محمد ﷺ اختلال البطل و انقلاب الاراد تفاقات خاصة على اصحابها وكان الامر اشد واقسى نزل الحق بازائه بالجهد و اشاعة العبادات وتوقيتها والقضاء بزوال دولة الروم والعجم وانتظام امر النبوة كههيئة

الار تفاق الرابع ففتح ﷺ بابا من الخير لم يفتح قبله وانتظمت به امة من الناس هي خیر امة

اخرجت للناس (التفهيمات الالهية ج ۱، ص ۶۰ تا ۶۱۔ البلة الابراهيميه، البلة البعيدة)

”چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں انسانیت توحید کو بھول چکی تھی، اس لئے اس شر سے دنیا کو پاک کرنے کے لئے حق اس شکل میں نازل ہوا کہ توحید کی اشاعت کی جائے اور طہارت، نماز، حج، روزہ اور ذکر الہی کی عبادات پیدا کر لی جائیں۔

اس کے بعد ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کے عہد میں ملتوں میں خلل پڑ گیا تھا اور خصوصیت سے انسان کی معاشی اور تمدنی زندگی میں بد نظمی اور بے انصافی پیدا ہو چکی تھی اور یہ خرابی پہلی خرابی سے بھی زیادہ شدید شکل میں ظاہر ہوئی تھی اور زیادہ بڑے نتائج پیدا کرنے والی تھی اور اس کی خرابی بہت دور تک پہنچ چکی تھی، اس لئے عبادات کی اشاعت اور ان کے اوقات متعین کرنے کے ساتھ جہاد کا بھی حکم ہوا اور حکمت الہی نے فیصلہ کیا کہ رومی اور ایرانی حکومتی نظاموں کو برباد کر دیا جائے اور نظام نبوی کو بین الاقوامی پیمانے پر منظم کیا جائے۔ چنانچہ اب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے نوع انسانی کے لئے بھلائی کا دروازہ کھل گیا، جواب تک نہ کھلا تھا اور آنحضرت ﷺ کے ذریعے انسانوں کی ایک ایسی جماعت منظم ہو گئی جو نوع انسانی کے لئے بہترین فائدے پہنچانے والی تھی۔“

اس قول سے شاہ صاحب یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کو اخلاقی طور پر مستحکم بنائیں۔ ان کی تعلیمات کا غرض و غایت یہ ہوتا ہے کہ انسان کے اندر ایسی اوصاف پیدا ہوں، جن کی وجہ سے ایسے اعمال صادر ہوں جو خدا کی تخلیقی مشیت اور اس کی رضا کے مطابق ہوں۔ مطلب کہ انسان، خدا کا مطلوب بندہ (Ideal Personality) بن جائے۔

لیکن اخلاقی اصلاح اور مطلوب کردار پیدا کرنے کے لئے اقتصادی اصلاح لازمی ہے، کیونکہ اقتصادی عدم توازن، سماجی ابتری اور سماجی کشمکش پیدا کرتا ہے، جس کے اخلاق پر اور انسان کے اندرونی ماکات پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں، نتیجے میں عام انسانی تقاضاؤں کے مطابق اعمال صادر نہیں ہوتے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ کے مشن کا ایک بنیادی جزا اقتصادی اصلاح بھی تھا۔

اس بات کو ایک جگہ حجتہ اللہ البالغہ میں یوں بیان فرماتے ہیں:

اعلم ان الخواطر التي يجدها الانسان في نفسه وتبعثه على العمل بهوجها لاجرم ان لها اسبابا كسنة الله

تعالى في سائر الحوادث والنظرو التجربة يظهران۔۔۔ منها مزاجه الطبيعي المتغير بسبب التدبير

المحيط به من الاكل والشرب ونحو ذلك۔ (حجتہ اللہ البالغہ، ج ۱، ص ۳۱۹ تا ۳۲۰۔ باب فی اسباب الخواطر الباعثة على

الاعمال، زمزم پبلشرز)

”انسان کے دل میں چھوٹے چھوٹے خیالات پیدا ہوتے ہیں، وہ اسے کسی کام پر آمادہ کرتے ہیں، ان کو حضرات کہتے ہیں۔ یہ حضرات خود بخود پیدا نہیں ہو جاتے، بلکہ جس طرح کارخانہ الہی میں پرچیز کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے، ایسے ہی انسان کے دل میں پیدا ہونے والے ان حضرات کے بھی بہت سے اسباب ہوتے ہیں۔ ان سببوں میں سے ایک سبب انسان کا مزاج طبعی ہے، جو انسان کے معاشی ماحول کے اثرات مثلاً کھانے، پینے وغیرہ سے بدلتا رہتا ہے۔ یہ مزاج طبعی بھی انسان کے دل میں کام کی خواہش پیدا کرنے کا بڑا سبب ہوتا ہے۔“

یعنی عمل کے محرکات اور عملی داعیے پیدا کرنے والے حضرات کے پیدا ہونے میں انسان کے معاشی حالات کا بہت حد تک دخل ہے، کیونکہ انسان کے معاشی حالات انسان کے مزاج کو متاثر کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں عمل کے محرکات پیدا ہوتے ہیں، پھر وہ عمل اچھے یا برے نتائج والے پیدا ہوتے ہیں۔

مطلب کہ اگر انسان کی رہن، سہن، اٹھنا، بیٹھنا اور پہننا اچھا اور مہذب ہے تو اعمال بھی اچھے ہونگے، اگر وہ جنگلی یا خراب اور غیر مہذب ہیں تو اعمال بھی ان کے مطابق صادر ہوں گے۔ بدور بازغہ میں کھل کر لکھا ہے کہ:

انبا الاخلاق بالاحوال (بالعلوم) (بدور بازغہ: ص ۴۱، المقالة الاولى، مطبوعہ برقی پریس بجنور، یوپی)

”عملوں کو پیدا کرنے والی اوصاف یا اندرونی خلق، انسان کے حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ معلومات کے اضافے سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔“

یعنی حاصل یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اچھی زندگی اور اپنے اخلاق کی درستگی تب ہی کر سکتا ہے، جب وہ معاشی طور پر مستحکم ہو۔ اور یہ معاشی استحکام صرف چند افراد میں محصور پایا نہ جاتا ہو، نہ کہ افراد معاشرہ محض اخلاقی اصولوں کے طور پر اپنے اوپر یہ ذمہ داریاں اٹھائیں کہ وہ معاشرہ سے اقتصادی بدحالی ختم کرنے کے لئے تیار ہیں، لیکن یہاں مقصد ایسا معاشی نظام مراد ہے، جس کو عام طور پر نظریاتی طور پر قبول بھی کیا جاتا ہو اور عملی طور پر وہ نافذ العمل بھی ہو۔

معاشی استحکام سے مراد کیا ہے؟

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اخلاقی اقدار کی بہتری کے لئے (یا بہترین کردار پیدا کرنے کے لئے) سماج میں عادلانہ اقتصادی نظام ضروری ہے، تو عادلانہ اقتصادی نظام سے مراد کیا ہے؟ اس بات کا جواب شاہ ولی اللہؒ اس طرح دیتے ہیں کہ:

انسان اپنی سماجی زندگی (Social life) میں چار مرحلوں سے گذر کر اپنے اخلاق کی تکمیل کر کے دنیا میں ترقی کی انتہا کرے گا۔ وہ مرحلہ یہ ہیں: (۱) قصباتی زندگی (۲) شہری زندگی (۳) قومی زندگی (۴) بین الاقوامی زندگی

شاہ ولی اللہ دوسرے فلاسفوں کی طرح یہ مانتے ہیں کہ انسان مدنی الطبع (Sociable) ہے کہ انسان کے فطری تقاضے اسے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اور یہی فطری تقاضے، اس کے عملوں اور فعلوں کے حقیقی محرک ہیں، کہ آدمی کوئی بھی کام کرتا ہے، اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ضروریات کو پوری کریں، یا جو چیزیں ضروری سمجھتا ہے، ان کے حصول کے لئے وہ ایکشن (To act) لیتا ہے۔

اپنی ضروریات کا احساس اور ان کے حاصل کرنے کے لئے وسائل سے کام لینے کے شعور میں انسان، دوسرے تمام حیوانات (Inhuman) سے برتر ہے اور یہ برتری اس کی نوعی خصوصیت اور طبعی الہام کا جز ہے۔ یہ الہام اس کو ذات مطلق کی طرف سے ابتداء ہی میں ودیعت کیا گیا ہے۔ انسانی شعور کی سطح دیگر حیوانات کی طرح جامد نہیں بلکہ متحرک ہے، وہ کسی ایک جگہ پر ٹھرتی نہیں، اسی لئے انسان اپنی حیوانی تقاضاؤں کو پورا کرنے کے لئے دیگر حیوانات کی طرح محض اشیاء کی طبعی حالت اور عمل کی دستوری صورت پر انحصار نہیں کرتا، بلکہ ان کو نئی نئی صورتوں اور شکلوں میں بدلتا رہتا ہے، کیونکہ فطرت نے اسے اپنی ضروریات کی تسکین کے لئے مزید تین صلاحیتیں ودیعت کی ہوئی ہیں:

۱۔ ذوق جمال (Aesthetic Taste):

انسان اپنی ضروریات کی فوری اور سادہ تسکین سے مطمئن نہیں ہوتا، بلکہ اشیاء کو زیادہ سے زیادہ حسین اور شائستہ بنانے میں بھی کوشاں رہتا ہے، اس کا پہلا قدم تو محض ضرورت کی حد تک تھا، لیکن وہ درجہ بدرجہ حسن و خوبی، عمدگی اور نفاست و رعنائی کی اعلیٰ سطح تک پہنچتا اور اس سفر میں کسی جگہ رکتا نہیں ہے۔

۲۔ رائے عامہ یا اجتماعی مفاد (Public Weal) یعنی آدرش پسندی اور دور اندیشی:

انسان سماج میں رہ کر اپنے آپ سے اوپر ہو کر سوچتا ہے، ایسے کام کرتا ہے، جن کا نتیجہ آنے والی نسلوں کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے۔ اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں ان اشیاء کو اختیار کرتا رہتا ہے جو سماج کے لئے مفید ہوتی ہیں اور جو نقصان دہ ہوتی ہیں، ان کو ختم کرتا ہے یا ان میں رد و بدل کر کے اصلاح کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح تجربات و مشاہدات اور گذرے ہوئے تاریخی واقعات کی روشنی میں اصول و قواعد استنباط و استخراج کر کے ان کے مطابق بہترین سماج تشکیل دینا چاہتا ہے۔

۳۔ مادہ ایجاد و تقلید (Creation & Emulation)

شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر انسان اپنی ضروریات کا پورا شعور رکھتا ہو، یا ان کی تسکین کے وسائل سے خود بہرہ ور ہو۔ بلکہ انسانی تاریخ اس بات کی آئینہ دار ہے کہ زندگی کے سفر میں اکثر انسانوں کو دستور کے خلاف تکلیفیں اور مشقتیں پیش آتی رہتی ہیں۔ ایسی حالت میں دانشور، عوام کی رہنمائی کرتے

ہیں، وہ اپنے فہم و ادراک سے کوئی کارآمد طریقہ ڈھونڈ نکالتے ہیں پھر دوسرے لوگ اس طریقہ کو اختیار کر کے اپنا غرض پورا کرتے رہتے ہیں۔

اس کی مختصر وضاحت اور ترتیبی تشریح یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ یہ فرماتے ہیں کہ سماج کی ارتقائی صورت کے یہ چار مراحل ہیں، ایک مرحلہ کے بعد دوسرا مرحلہ آتا ہے، ہر مرحلہ میں دو قسم کے عناصر موجود ہوتے ہیں: ضروری اور اضافی

ضروری عناصر کی موجودگی کے بغیر وہ مرحلہ وجود پذیر نہیں ہوتا، جبکہ اضافی عناصر اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہوئے اسے مکمل کرتے ہیں۔ لیکن صرف مراحل کی درجہ بدرجہ تبدیلی، انسانی زندگی کی ترقی نہیں کہلا سکتی بلکہ ہر مرحلہ کو مذکورہ تینوں چیزوں (رائے عامہ، ذوق جمال، ایجاد) کے مطابق سنوارا جانا بھی ضروری ہے، یعنی انسان تمدنی ترقی میں اجتماعی مفاد کو سامنے رکھے، اس کے ساتھ محض بربریت والی زندگی پر کفایت نہ کرے بلکہ آگے رعمنائی و خوبصورتی پیدا کرتا چلا جائے، اسی طرح اگر ایک طبقہ یا قوم اپنے وسائل کو کتب لانے میں یا وہ مشقتیں دور کرنے میں جو کسی مرحلے کا لازمی حصہ ہوتی ہیں، اہلیت نہیں رکھتی تو دوسروں کا فرض ہے کہ وہ اس کو ان سے نجات دلادے۔ بدور بازغہ میں اس کو مختصر اور جامع الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

الحكمة المعاشية ان تستوفى حوائجك على مراعاة مقتضى الاخلاق الفاضلة من الديانة والسبت الصالح وغيرهما ومقتضى العلوم التجارية والرأى الكلى ولها ابواب منها الاكل والشرب والنظافة والزينة واللباس والسكن والبش والقعود والسفر والكلام والمنازل والجماع والمرض والمصلب وتلك اعمدها واصولها (بدور بازغہ - ص ۵۵)

فصل فی مباحث الحكم المتعلقة بالارتقاء الثاني تفصیلاً

”حکمت معاشی (فن معاشیات) یہ ہے کہ اپنی ضروریات کو۔ اخلاق فاضلہ مثلاً دیانت، اچھی وضعداری (سمت صالح) وغیرہ کے تقاضوں اور علوم تجربیہ اور رائے کلی کے تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے۔ پورا کیا جائے۔ کھانا پینا، نظافت و صفائی، زینت و آرائش، لباس و پوشاک، مسکن و مکان، چلنا پھرنا، نشست و برخاست، سفر و سیاحت، باہمی گفتگو، خواب و استراحت، جنسی خواہشات و مباشرت، امراض و آفات یہ اس کے ستون اور اصول ہیں۔“

حاصل یہ کہ حکمت معاشیہ سے مراد یہ ہے کہ دیانت اور سمت صالح جیسے اخلاق فاضلہ، تجربی علوم اور مصلحت عامہ کے تقاضاؤں کے مطابق اپنی ضروریات و حوائج کی تسکین کی جائے۔

عدل

شاہ صاحبؒ کی فلاسفی کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی حقیقی ترقی

اس میں ہے کہ وہ اپنے اندر چار اخلاق پیدا کرے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ تمام انبیاء کی تعلیمات کا خلاصہ نکالا جائے تو وہ یہی چار اخلاق بننے ہیں:

۱۔ طہارت: اس کی حقیقت اور اس کی طرف میلان ہر سلیم الفطرت انسان کے اند و بدعت کیا گیا ہے۔ اور طہارت سے مراد محض جسمانی وضوء اور غسل یا دوسری ظاہری نجاستوں اور آلودگیوں سے حفاظت مراد نہیں، بلکہ جسمانی اور روحانی دونوں شامل ہیں۔ (یعنی بدنی اور خارجی طہارت کے ساتھ خیالات و اعتقادات کی پاکیزگی اور گناہوں کے پیدا کرنے والے اسباب و خواطر پر ایسا کنٹرول کہ گناہ کے داعیے و تصورات پیدا ہی نہ ہو سکے۔)

۲۔ تواضع: خدا تعالیٰ کے لئے خضوع یعنی نہایت درجہ کی عجز و نیاز مندی۔

۳۔ سماحت: تیسری چیز سماحت اور فیاضی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس طلب لذت، حب انتقام، بخل و حرص وغیرہ سے مغلوب نہ ہو۔ اس کے ذیل میں محنت، جدوجہد، صبر و عفو، سخاوت، قناعت اور تقویٰ جیسی اچھی اخلاقی اوصاف تمام آجاتی ہیں کہ آدمی دنیا کی اشیاء کی محبت میں منہمک نہ ہو جائے، بلکہ اچھے اخلاق و اچھی عادات اپنے اندر پیدا کرے۔

۴۔ عدالت: اعتدال و توازن۔ نہ دوسرے پر ظلم کرنا، نہ ہی کسی پر ظلم ہوتے ہوئے دیکھنا۔ انصاف پسندی۔

سیاسی اور اجتماعی نظاموں کی روح رواں یہی خصلت ہے۔ ادب، کفالت شعاری، حریت، سیاست مدنیہ اور حسنہ معاشرت وغیرہ سب عدالت کی شاخیں ہیں۔ چنانچہ مولانا حفظ الرحمن لکھتے ہیں:

”اخلاق کے علماء کے نزدیک یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ اجتماعی اخلاق میں سے کس خلق کو زیادہ اہمیت و مرتبہ دیا جائے۔ اخلاقیات کے کتب میں اس بحث کو فضیلت کے باب میں بیان کیا جاتا ہے۔ ان میں سقراط، ارسطو، افلاطون، ابن مسکویہ اور موجودہ دور کے علماء اخلاق کے مباحث کو تفصیل سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ان مباحث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سقراط ہر چیز کی صحیح پہچان کو سب سے زیادہ فضیلت تسلیم کرتا ہے۔ ارسطو ”اوساط“ کے نظریے کا قائل ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر دو بری اشیاء کے درمیان میں ایک فضیلت (اچھائی) پوشیدہ ہوتی ہے۔ افلاطون کبھی تو اپنے استاد سقراط کا تابع نظر آتا ہے تو کبھی نفس کی حسرتوں اور خواہشوں پر کنٹرول اور ضابطے کا نام فضیلت قرار دیتا ہے۔ ابن مسکویہ، ارسطو کی تائید میں لگا ہوا ہے اور موجودہ دور کے علماء اجتماعی فضیلتوں کو بناں کسی درجے و درجے کے مختلف اقسام میں تقسیم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن امام ولی اللہ اصول اخلاق کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے اجتماعی اخلاق کے لئے صرف ایک ہی فضیلت کو اصل اور معیار قرار دیتے ہیں، جو عدل ہے۔“

آگے ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں: ”اجتماعی اخلاق میں عدل کی حیثیت کو جس طرح شاہ صاحبؒ نے واضح کیا ہے، وہ اہل حق کے لئے ایک بہترین نظریہ ہے، جو فضیلت سے تعلق رکھنے والے قدیم مباحث کے اختلافات کے لئے محاکمہ و فیصل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس سے اجتماعی اخلاق میں عدل کی بلندیوں کے ساتھ وہ سب مشکلیں حل ہو جاتی ہے، جو فضیلت کے بحث میں علماء کے سامنے آچکی ہیں۔“ (شاہ ولی اللہؒ اور اخلاق و معیشت کا باہمی تعلق)

لیکن یہاں پر عدالت سے مراد محض مساوات و برابری یا کسی کو اپنا حق پورا پورا کر کے دینا نہیں، بلکہ عدالت سے مراد ہے کہ:

العدالة، وهي ملكة في النفس تصدر عنها الافعال التي يقام بها نظام المدينة والحی بسهولة

(حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص ۵۵۲ زمزم پبلشرز)

”عدالت نفس میں راسخ ایک کیفیت ہے، اس سے وہ افعال صادر ہوتے ہیں جن سے قبیلہ اور مملکت کا نظام بہ سہولت قائم ہوتا ہے۔“

شاہ صاحبؒ نے عدالت کی اہمیت پر ایک جگہ یوں بیان فرمایا ہے: خصلت چہارم عدالت است وآں خصلتے است کہ صدور اقامت نظام عادل و سیاست کلی ازوے باشند۔

”چوتھی خصلت عدالت ہے، انسانی سوسائٹی کے نظام عدل کا انحصار اسی پر ہے، اسی سے اجتماع انسانی کی سیاست عالیہ چل سکتی ہے۔“ (ہمععات بحوالہ شاہ ولی اللہؒ کا فلسفہ عمرانیات و معاشیات ص: ۳۲۶ مع حجۃ اللہ البالغہ، حکمت قرآن)

چنانچہ ایک جگہ حجۃ اللہ البالغہؒ میں فرماتے ہیں:

العدالة، وهي ملكة يصدر منها اقامة النظام العادل المصلح في تدبير المنزل وسياسة المدينة ونحو ذلك بسهولة۔ واصلها جبلة نفسانية تنبعث منها الافكار الكلية والسياسيات المناسبة بما عند الله وعند ملائكتہ (حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، ص: ۲۸۲۔ زمزم پبلشرز من ابواب الاحسان)

”عدالت میں وہ ملکہ یا خصلت ہے، جس سے ایسا نظام عدل پیدا ہوتا ہے جو نہایت آسانی سے تدبیر منزل اور سیاست مدینہ اور بین الاقوامی اجتماعات کے قیام کا سبب بنتا ہے۔ اس خلق کی بنیاد اس جذبہ انسانیت پر ہے، جس سے جمہوریت پسند افکار پیدا ہوتے ہیں اور پھر آگے چل کر اپنے مناسب حال سیاست پیدا کر لیتے ہیں، جو حکمت الہی کے مطابق ہوتی ہے۔“

آگے فرماتے ہیں:

والعدالة اذا اعتبرت باوضاع الانسان في قيامه ويقظته ومشيه وكلامه وزيه ولباسه وشعره سييت

ادباً، اذا اعتبرت بالاموال وجمعها وصرفها سييت كفالة واذا اعتبرت بتدبير المنزل سييت حرية واذا

اعتبرت بتدبير المدينة سمعيت سياسة واذا اعتبرت بتألف الاخوان سييت حسن المحاضرة او حسن

المعاشرة (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲، ص: ۲۸۳، زمزم پبلشرز)

”عدالت ایک ایسا طریقہ و بنیاد ہے جو انسانی زندگی کے عادات و اطوار و احوال جیسا کہ اٹھنا، بیٹھنا، سونا، چلنا، پھرنا، بولنا، صورت و لباس وغیرہ میں اس کا خیال کیا جائے تو اس کو ادب کہا جاتا ہے۔ اور اگر مالی حیثیت یعنی جمع و خرچ (آمدن و روانگی) سے متعلق باتوں میں اس کو سامنے رکھا جائے تو اس کا نام کفایت ہے اور اگر تدبیر منزل (گھر چلانے کی منصوبہ بندی) میں اس کا صحیح استعمال کیا جائے تو وہ آزادی (Civil liberty) ہے۔ اور اگر اس کا نام حسن معاشرت ہے۔ (یعنی ایک دوسرے سے محبت، شفقت اور اچھے مراسم سے پیش آنا۔)“

مطلب یہ کہ شاہ صاحبؒ نے عدالت کے خلق کو اقتصادیات، سیاسیات اور سماجیات کی بہتری کے لئے بنیاد قرار دیا ہے۔ اور جو سماج عدالت سے خالی و عاری ہوگا، اس میں اخلاقی زوال اور خطرناک جرائم کا وجود ناگزیر ہے۔

شاہ صاحبؒ نے انسان کی سماجی زندگی کے تین طریقے بیان کیے ہیں:

۱۔ رفاہیت بالغہ (Luxury)

۲۔ رفاہیت ناقصہ (Barbarism)

۳۔ رفاہیت متوسطہ (Modesty)

چنانچہ بدور بازغہ میں ہے: والناس علی ضرب: منهم ذوالرفاهية البتناءهية والامعان البفرطی الاستقراء ومنهم ذوالمرتبة الوسطی منها۔ ومنهم القاصر فیہا لایستوفی حوائجہ الاقربیا من استیفاء البهائم وسنبین لك ان الواجب ان يجعل میزان الحکمة المعاشية ذا المرتبة الوسطی (لاغیر) (بدور بازغہ، ص: ۵۵)

”زہن سہن اور ضروریات کے پورا کرنے میں لوگوں کے حالات تین مختلف قسم کے ہوتے ہیں: پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو بے انتہا آسائش پسند اور ہر قسم کی عیش و عشرت کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ دوسری قسم متوسط طبقہ ہے، جو نہ زیادہ آسائش پسند ہوتے ہیں اور نہ مفلوک الحال زندگی بسر کرتے ہیں اور نہ ہر قسم کی عیش و عشرت کے دلدادہ ہوتے ہیں۔

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو پہلی قسم کے بالکل برعکس ضروریات زندگی کو چوپایوں کے قریب قریب نہایت سادگی کے ساتھ پورا کرتے ہیں۔“

(مثال کے طور پر اس بات کو ایک آسان مثال سے اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ کھانے پینے کے لئے چاندی سونے کے برتنوں کا استعمال رفاہیت بالغہ ہے اور زمین پر رکھ کر کھانا رفاہیت ناقصہ ہے۔ اس لئے

دونوں سے پرہیز کرنا چاہیے اور مٹی یا لکڑی وغیرہ کے برتن استعمال کرنے چاہیے۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ انسان زندگی کے سفر میں ایک جگہ نہیں ٹکتا۔ وہ اپنی زندگی میں تغیر و تبدل سے گزرنا پڑتا ہے، اسی طرح انسانی سماج میں استعمال ہونے والی اشیاء بدلتی رہتی ہیں۔ پہلی چیزوں کی جگہ دوسری چیزیں لیتی رہتی ہیں۔ جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ انسان جب کسی چیز کو استعمال کرتا ہے تو اسے اچھی سی اچھی شکل میں استعمال کرنا چاہتا ہے، اس سے اس کے مزاج میں صحت پیدا ہوتی ہے، انسان کی صلاحیتیں نکھرتی ہیں، اس کے اخلاق سنورتے ہیں اور اگر سماج ایک جگہ ٹھہر جائے تو اس سے کندہ بنی، کج فہمی، عجز اور بے تدبیری پیدا ہوتی ہے۔ لیکن دوسرے طرف پر تعیش اور مترفانہ زندگی بھی معاشرے کے لئے خطرناک ثابت ہوتی ہے، آپس کے جھگڑوں کا باعث بنتی ہے۔ اگر آدمی اس مترفانہ زندگی میں گھر جائے تو وہ حقیقی سعادت و نیکی سے محروم ہو جاتا ہے۔ دنیوی لذات کی تیز خواہش، فتنہ و فساد پیدا کرتی ہے اور یہ انسان کے مرنے کے بعد کی زندگی کے لئے مضر ہوتی ہے۔

اسی وجہ سے شاہ صاحبؒ رفاہیت متوسطہ یا اعتدال کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ: ”انسان اپنی معاش میں رفاہیت اور ذوق حسن یا ظرافت کا خیال رکھے اور کوشش کرے کہ انسان اپنی تمام ضرورتیں اوسط درجے کی رفاہیت سے پوری کرے۔“ (شاہ ولی اللہ کا فلسفہ عمرانیات و معاشیات ص ۲۶۷ مع جہ اللہ البالغہ، حکمت قرآن) بدور بازغہ میں لکھا ہے کہ: ”حکمت معاشیہ کا معیار لازماً درمیانی قسم یعنی متوسط طبقہ کو بنانا چاہیے، جو افراط و تفریط سے پاک ہے۔ یہی صراط مستقیم، خیر الامور اور قوام اصلی ہے۔“ (بدور بازغہ، ترجمہ ڈاکٹر قاضی مجیب الرحمن: ص ۱۷۷ اسدھ ساگر اکادمی)

ایک جگہ ارتقاات کے باب میں فرماتے ہیں: ”اور اسی لیے اس مقدس ہستی کی تعلیم میں ”رہبانیت“ کو اخلاقی حیثیت نہیں دی گئی، بلکہ انسانوں کے باہمی اختلاط و اجتماع کی زندگی کو ترجیح دی گئی ہے، لیکن اس اجتماعیت کا امتیاز یہ قرار دیا ہے کہ اس کے معاشی نظام میں نہ دولت و ثروت کو وہ حیثیت حاصل ہو جو عجمی بادشاہوں کے یہاں حاصل تھی اور نہ ایسی کیفیت ہو کہ تمدن سے بیزار دہقان اور وحشی لوگوں کی طرح ان کی معیشت ہو۔“ (جہ اللہ البالغہ بحوالہ اسلام کا اقتصادی نظام۔ ص: ۲۹)

اعتدال سے ہٹ جانے سے جو معاشرے میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، ان پر بحث کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب معاشرہ عدل و اعتدال سے ہٹ جائے اور اثر افیہ طبقہ رفاہیت بالغہ (Luxury) اور پر تکلف و عیاشانہ زندگی بسر کرنے لگے، تو اس معاشرے میں غیر اخلاقی اور غیر ضروری پیشہ ور افراد پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے سوسائٹی اخلاقی اور تمدنی دونوں اعتبار سے تباہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بعض لوگ تو حسین و جمیل دوشیزہ لڑکیوں کو قص و سرور اور بدن کی لذت آمیز حرکات کی تعلیم دینے کے لئے درس گاہیں کھول لیتے ہیں۔ بعض خوشنما اور دلفریب طلائی و نقرئی زیورات تیار کرنے میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ

سے تجارت، زراعت اور ضروری صنعت و حرفت تباہی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی عیاشی کے لئے بڑی خطرہ رقم کی ضرورت ہوتی ہے، جس کو پورا کرنے کے لئے وہ ہاری اور مزدور پر بھاری ٹیکس لگا کر وہ رقم وصول کرنے لگتے ہیں۔ اگر کوئی دینے کے قابل نہ ہو تو اس پر جبر کیا جاتا ہے اور یہ صورت حال ہلاکت و تباہی کا باعث بنتی ہے، اس کی مثال میں شاہ صاحبؒ عہد نبوت کے بادشاہی نظام قیصر و کسریٰ کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں: چنانچہ لکھتے ہیں:

”جب پارسیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے ہوئے صدیاں گزر گئیں اور دنیوی تعیش کو انہوں نے اپنی زندگی بنالیا اور آخرت تک کو بھلا دیا اور شیطان نے ان پر غلبہ کر لیا تو اب ان کی تمام زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ وہ عیش پسندی کے اسباب میں منہمک ہو گئے اور ان میں ہر شخص سرمایہ داری اور تمول پر فخر کرنے اور اترانے لگا۔ یہ دیکھ کر دنیا کے مختلف گوشوں سے وہاں ایسے ماہرین جمع ہو گئے جو بیجا عیش پسندوں کو داد عیش دینے کے لیے عیش پسندی کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے اور سامان عیش مہیا کرنے کے لیے عجیب و غریب دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے اور قوم کے اکابر اس جدوجہد میں مشغول نظر آنے لگے کہ اسباب تعیش میں کس طرح وہ ایک دوسرے پر فائق ہو سکتے اور ایک دوسرے پر فخر و مباہات کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان امراء و سرمایہ داروں کے لیے یہ سخت عیب اور عار سمجھا جانے لگا کہ ان کی کمر کا پنکد یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا ہو یا ان کے پاس عالی شان سر بفلک محل نہ ہو جس میں پانی کے حوض، سرد گرم حمام، بے نظیر پائیں باغ ہوں اور ضرورت سے زائد نمائش کے لیے بیش قیمت سواریاں، حشم و خدام اور حسین و جمیل باندیاں موجود ہوں۔ اور صبح و شام رقص و سرور کی محفلیں گرم ہوں اور جام و سبوسے شراب اور غوانی چھلک رہی ہو اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا ہوں جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو اور جس کا ذکر قصہ طولانی کے مرادف ہے۔

غرض یہ غلط اور گمراہ کن عیش ان کے معاشی نظام کا اصل الاصول بن گیا تھا اور کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ یہ صرف نواب اور امراء کے طبقہ ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ پوری مملکت میں ایک عظیم الشان آفت اور وبا کی طرح سرایت کر گیا تھا اور عوام و خواص سب میں یہی جذبہ فاسد پایا جاتا اور ان کے معاشی نظام کی تباہی کا باعث بن رہا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ مملکت کی اکثریت پر یہ حالت طاری تھی کہ دلوں کا امن و سکون مٹ گیا تھا، ناامیدی اور کالی بڑھتی جاتی تھی اور بہت بڑی اکثریت رنج و غم اور آلام و مصائب میں گھری نظر آتی تھی، اس لیے کہ ایسی مفرطانہ عیش پرستی کی لیے زیادہ سے زیادہ رقوم اور آمدنی درکار تھی اور وہ ہر شخص کو مہیا نہ تھی۔ البتہ اس کے لیے بادشاہ اور نوامراء اور حکام نے معاشی دستبرد شروع کر دی اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کاشتکاروں، تاجروں، پیشہ ور اور اس طرح دوسرے کارپروازوں پر طرح طرح کے ٹیکس عائد کر کے ان

کی کمر توڑ دی اور انکار کرنے پر ان کو سخت سے سخت سزائیں دیں اور مجبور کر کے ان کو ایسے گھوڑوں اور گدھوں کی طرح بنایا جو آپاشی اور ہل چلانے کے کام میں لائے جاتے ہیں اور پھر کارکنوں اور مزدور پیشہ لوگوں کو اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ اپنی حاجات و ضروریات کے مطابق بھی کچھ پیدا کر سکیں۔ خلاصہ یہ کہ ظلم و بد اخلاق کی انتہا ہو گئی تھی۔

اس پریشان حالی اور افلاس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو اپنی اخروی سعادت و فلاح اور خدا سے رشتہ بندگی جوڑنے کیلئے بھی مہلت نہ ملتی تھی۔ اور اس ”فاسد نظام“ کا ایک مکروہ پہلو یہ بھی تھا کہ جن صنعتوں پر نظام عالم کی بنیاد قائم ہے، وہ اکثر ایک قلم متروک ہو گئیں اور امراء و روساء کی مرضیات و خواہشات کی تکمیل ہی سب سے بڑی خدمت اور سب سے بہتر حرفہ شمار ہونے لگا۔ اور جمہور کی یہ حالت تھی کہ ان کی تمام زندگی بد اخلاقیوں کا نمونہ بن گئی تھی اور ان میں سے اکثر کا گزارہ بادشاہوں کے خزانوں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہو گیا تھا۔ (مثلاً ایک طبقہ فوجی ملازم کے بیٹے ہونے کی حیثیت سے بیت المال سے وظیفہ لیتا تھا) تو دوسرا مدبرین مملکت کے نام سے پل رہا ہے۔ کوئی بادشاہ اور امراء کی خوشامد میں قصہ خوانی کر کے شاعری کے نام سے وثیقہ پارہا ہے تو کوئی صوفی اور فقیر بن کر دعا گوئی کے زمرہ میں مالی استحصال کر رہا ہے۔

خلاصہ یہ کہ کسب معاش کے بہترین طریقوں کا فقدان تھا اور ایک بڑی جماعت چاپلوسی، مصاحبت، چرب زبانی اور دربار داری کو ذریعہ معاش بنانے پر مجبور ہو گئی تھی اور یہ ایک ایسا فن بن گیا تھا جس نے ان کے افکار عالیہ اور ذہنی نشوونما کی تمام خوبیاں مٹا کر پست و ارزل زندگی پر قانع کر دیا تھا۔ پس جب یہ فاسد مادہ وبا کی طرح پھیل گیا اور لوگوں کے دلوں تک سرایت کر گیا تو ان کے نفوس دناوت و خست سے بھر گئے اور ان کے طبائع اخلاق صالحوں سے نفرت کرنے لگیں اور ان کے تمام اخلاق کریمانہ کو گھن لگ گیا اور یہ سب اس فاسد معاشی نظام کی بدولت پیش آیا جو عجم و روم کی حکومتوں میں کار فرما تھا۔ آخر جب اس مصیبت نے ایک بھیانک شکل اختیار کر لی اور مرض ناقابل علاج حد تک پہنچ گیا تو خدا تعالیٰ کا غضب بھڑک اٹھا اور اس کی غیرت نے تقاضا کیا کہ اس مہلک مرض کا ایسا علاج کیا جائے کہ فاسد مادہ جڑ سے اکھڑ جائے، اس کا قلع قمع ہو جائے۔ اس نے ایک نبی امی ﷺ کو مبعوث کیا اور اپنا پیغامبر بنا کر بھیجا۔ وہ آیا اور اس نے روم و فارس کی ان تمام رسومات کو فنا کر دیا اور عجم و روم کے رسم و رواج کے خلاف صحیح اصولوں پر ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی۔

اس نظام میں فارس و روم کے فاسد نظام کی قباحت کو اس طرح ظاہر کیا کہ معاشی زندگی کے ان تمام

اسباب کو ایک قلم حرام قرار دیا جو عوام اور جمہور پر معاشی دستبرد کا سبب بنتے ہیں اور مختلف عیش پسندوں کی راہیں کھول کر حیات دنیوی میں بیجا انہماک کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً مردوں کے لئے سونے چاندی کے زیورات اور حریر و دیبا کے نازک کپڑوں کا استعمال اور تمام انسانی نفوس کے لیے خواہ مرد ہو یا عورت ہو، ہر قسم کے چاندی اور سونے کے برتنوں کا استعمال اور عالیشان کوشکوں اور رفیع الشان محلات و قصور کی تعمیر اور مکانوں میں فضول زیبائش و نمائش وغیرہ، کہ یہی فاسد نظام کے ابتدائی منازل اور معاشی نظام کی تباہی کا منشا و مولد ہیں۔

بھر حال خدائے تعالیٰ نے اس ہستی کو اخلاق کریمانہ اور نیک نہادی کے لیے معیار اور طاہر و پاک امور کے لیے میزان بنادیا۔“ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۲۴۲ تا ۲۴۳ مزمر پبلشرز۔ ترجمہ مولانا حفظ الرحمن، اسلام کا اقتصادی نظام، ص: ۲۸۵ تا ۲۸۶)

سوسائٹی کے لیے جو ضرر رساں اسباب ہیں، ایک جگہ ان کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

و غالب سبب خراب البدان فی الزمان شیئان: احدهما تضییقہم علی بیت المال، بأن یعتادوا التکسب بالأخذ منہ علی انہم من الغزاة او من العلباء الذین لہم حق فیہ او من الذین جرت عادة السلوک بصلتہم کالزہاد والشعراء او بوجہ من الوجوۃ التکدی ویكون العبدۃ عندہم هو التکسب دون القيام بالصلحۃ فیدخل قوم علی قوم فینغضون علیہم ویصیرون کلا علی البدینۃ۔ والثانی ضرب الضرائب الثقیلۃ علی الزراع والتجار والمتحرفۃ والتشدید علیہم حتی یفقدوا الی اجحاف البطاوعین واستئصالہم والی تنعم اولی باس شدید وبغیہم۔ وانما تصلح البدینۃ بالجباۃ السیرۃ واقامۃ الحفظۃ بقدر الضرورۃ۔ فلیتنبہ اهل الزمان لہذا النکتۃ۔ واللہ اعلم۔ (حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱ ص ۷۱ مزمر پبلشرز)

” ہمارے زمانے میں شہروں کی تباہی اور شہری زندگی کی خرابی کے دو بڑے سبب ہیں:

(۱) اکثر لوگ (بغیر محنت کے) شہر کی مفید خدمت کئے بغیر پبلک فنڈ سے یونہی روپیہ بنورنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً کبھی فوجی خدمات کے عوض میں، کبھی علمی بلند مرتبہ کے صدقے میں، کبھی زہد و عبادت کے زور پر، کبھی شعر و شاعری کی بدولت و وظیفہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور کوئی ذریعہ نہ ہو تو مانگنے ہی لگ جاتے ہیں۔ بعض عہدیدار اپنے عہدے کے فرائض سرانجام نہیں دیتے اور خواہ مخواہ تنخواہیں وصول کرتے رہتے ہیں۔ جب ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے تو وہ ایک دوسرے کے لیے تنگی کا باعث بن جاتے ہیں۔

(۲) دوسرا سبب یہ ہے کہ کاشت کاروں، تاجروں اور اہل حرفہ پر بہت گراں بار ٹیکس لگا دیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ جو کمزور لوگ ٹیکس ادا کرتے رہتے ہیں، وہ توفیر رفتہ تباہ حال ہو جاتے ہیں اور جو ذرا طاقتور ہوتے ہیں، وہ سرکشی اختیار کر لیتے ہیں۔ قومی زندگی کی ترقی و فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہے کہ سول بیر و کریٹ اور ملٹری کی مقدار بقدر ضرورت ہو اور ٹیکس بھی ہلکے رکھے جائیں۔ ہمارے زمانے کے لوگ اس

”اخلاق صالہ“ یا ”اخلاق کریمانہ“ یا ”اخلاق فاضلہ“ یہ شاہ صاحب کا ایک اصطلاح ہے، اس سے مراد یہ سات خلق ہیں: ۱۔ حکمت ۲۔ عفت ۳۔ ساحت ۴۔ شجاعت ۵۔ فصاحت ۶۔ دیانت ۷۔ سمت صالح: اذا اعلبت الفکر فی الفحص عن حقائق الاخلاق الفاضلۃ وجدتها سبعة: الحکمة والعفة والسباحۃ والشجاعة والفصاحة والدیانة والسمت الصالح (بدور بازغہ، المقالة الاولی فی احکام امام الانسان، ص: ۳۸ مدینہ برقی پریس پجنور (یو پی))

باریک بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے۔“

شاہ صاحبؒ کی اس عبارت سے محنت پر روشنی پڑتی ہے اور بہترین نظام وہ ہے جس میں محنت کر کے کھایا جائے، ہر ایک آدمی محنت کر کے کمائے اور اپنا رزق خود پیدا کر کے نفع حاصل کرے۔ اور محنت سے مراد بھی یہ ہے کہ وہ پیشے اختیار کیے جائیں جو تمدن کی ترقی کے حقیقی معمار ہیں۔ آگے ان کی تفسیر میں لکھا ہے:

یعنی زراعت، صنعت، حرفت و تجارت۔

یعنی حقیقی عامل پیدائش محنت ہے اور محنت سے مراد ہے کہ ایسے سماج کی تعمیر کرنا، کوئی نفعہ بخش اور مفید خدمات سرانجام دینا۔ بغیر محنت کے کھانا، تعمیری کام کئے بغیر یونہی عوام کا پیسہ بٹورنا، دوسروں کے ہاتھوں پر پلانا، یہ چیزیں سماج کی ہلاکت و فلاکت کا باعث بنتی ہیں۔ اور اسی کے ساتھ یہ بات بھی کہتے ہیں کہ گورنمنٹ ملازمین بقدر ضرورت رکھے جائیں، بلکہ عوامی فنڈ کو عوامی بہبود اور اجتماعی فلاحی کاموں میں استعمال کیا جائے۔ اور ایک اہم بات یہ بیان فرمادی کہ اگر ٹیکسوں کی ضرورت پڑ جائے تو وہ بھی صاحب استطاعت لوگوں پر بقدر ضرورت رکھے جائیں، عام محنت کش لوگوں پر ان کا بوجھ نہ ڈالا جائے، ورنہ اگر اپنی عیاشی کے لئے بڑے بڑے ٹیکس لگائے جائیں تو ایک طرف تو کمزور اور بے سہارہ طبقہ ٹیکسوں کا بوجھ نہ سہتے ہوئے جانوروں جیسا بن جائے گا، جو اپنے اخلاق کی درستگی اور اس میں شائستگی پیدا نہیں کر سکے گا۔ یوں زندگی کی ضروریات میں جکڑا ہوا ہو گا، جس کے نتیجے میں اچھے کردار سوسائٹی میں متعارف نہیں ہو سکیں گے۔

لیکن اگر وہ طبقہ کچھ طاقتور یا قابل مزاحم ہے تو وہ مزاحمت کرے گا، جس کے نتیجے میں بغاوت پیدا ہوگی، جو سوسائٹی اور قوم کو داخلی طور پر کمزور بنادے گی۔

بھر حال حاصل یہ کہ دونوں چیزیں کسی بھی قوم کی تباہی و ہلاکت کا بنیادی محرک ہوتی ہیں: (۱) بغیر محنت کے کھانا (۲) غریب اور محنت کش عوام پر ٹیکسوں لگا کر اس کی بنیاد پر عیاشی کی محلات کو تعمیر کرنا۔
البتہ اگر سماجی فلاح اور اجتماعی مفاد کی لئے ٹیکس ضروری ہو تو اس بارے میں شاہ صاحبؒ کا نظریہ یہ ہے کہ:
”مقام ٹیکس مالداروں سے لئے جائیں گے اور ان اموال میں سے لئے جائیں گے جو بڑھتے ہیں جیسے مولیشی

، زراعت، تجارت وغیرہ۔“ (شاہ ولی اللہؒ کا فلسفہ عمرانیات و معاشیات ص: ۲۹۲ مع حجة الله البالغہ، حکمت قرآن)

یہ بات ہمارے دور کے لئے بہت اہم ہے کہ شاہ صاحبؒ نے تمدن کی بدلتی ہوئی کروٹوں کو جان کر وہ باتیں پہلے ہی سمجھ لی تھی جو بعد میں واقع ہونے والی تھی۔ یقیناً یہ شاہ صاحبؒ کا بڑا کمال ہے کہ آپ کے دور میں مشنری اور فیکٹریاں وجود پذیر نہ ہوئی تھیں، لیکن آپ نے تمدنی ترقی رفتار کو جان کر محنت کی اہمیت کو واضح کر دیا، محنت کے استحصال کے جو اسباب ممکن اور متوقع ہو سکتے تھے، ان پر روشنی ڈالی اور جمہوری نظام میں جو متوقع نقائص اور خارجی اثرات اس پر اثر انداز ہونے والے تھے، ان کی نشاندہی کی۔

شاہ ولی اللہ کا تصور ملکیت

بدور بازغہ میں شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

ولھنا قیاسان متعارضان: اھدھبا ان الترفۃ حسن یقتضیہ الطبع ویصح بہ الہزاج والدماغ والقلب
و یستقیم بہ الاخلاق والعلوم وکل غباوۃ وسوء خلق فانہا ینشأ من سوء التدیبر فی الاکل وسائر
التدیبرات وکل ذکاء وحسن خلق ولطف انہا ینشأ من صحت التدیبر وثانیہما ان الترفۃ قبیح الاحتیاجہ
الی منازعات ومشاکات وکلہ وتعب اعراض عن جانب الغیب وتدیبر الآخرۃ۔ (بدور باغ، ص: ۵۶۳۵۵)

” پس اس مقام پر دو متعارض قیاس کام کر رہے ہیں:

ایک یہ نظام معیشت میں دولت و ثروت ایک محبوب و محمود شے ہے، اس لیے کہ اگر وہ صحیح اصول پر قائم ہے تو اس کی بدولت انسانوں کا دماغی توازن اعتدال پر رہتا اور اس سے ان کے اخلاق کریمانہ صحیح اور درست رہتے ہیں۔ نیز انسان اس قابل بنتا ہے کہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہو۔ اس لیے کہ بیکسانہ اور مجبورانہ افلاس، سوء تدبیر اور مزاج کے اختلال کا باعث ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ نظام معیشت میں دولت و ثروت ایک بدترین چیز ہے، جبکہ وہ باہمی مناقشات اور بغض و حسد کا سبب بنتی اور خود اہل دولت و ثروت کے اطمینان قلب کو تعجب اور حریصانہ کد و کاوش کے زہر سے مسموم کرتی ہو اور قوموں کو استحصال بالجبر اور دوسروں پر معاشی دستبرد کے لیے آمادہ کرتی ہو، کیونکہ اس صورت میں یہ بد اخلاقی کے مرض میں مبتلا کر دیتی، آخرت اور یاد الہی یعنی روحانی زندگی سے یکسر غافل و بے پرواہ بنا دیتی اور مظلوموں پر نئے مظالم کا دروازہ کھولتی ہے۔ لہذا پسندیدہ راہ یہ ہے کہ دولت و ثروت ”نظام معیشت“ میں ایسا درجہ رکھتی ہو جو توسط اور اعتدال پر قائم ہو اور افراط و تفریط سے پاک ہو۔“

مطلب یہ ہے کہ دنیا کی محبت میں منہمک نہ ہو جائے، اس کی ہوس میں اپنے آپ کو فنا نہ کر دے، بلکہ دنیا کی چیزوں کو امانت سمجھ کر استعمال کرے۔ دنیا کو بالکل اہمیت نہ دینا، تہذیبی ترقی کے لئے نقصان ہے، دنیا کی اشیاء کو اپنی ملکیت سمجھنا، اپنے اخلاق کے لئے زہر قاتل ہے۔ درمیانی راہ یہ ہے کہ ان کو حق نہیں بلکہ عطیہ خداوندی سمجھ کر بطور نیابت اور خلافت کے طور پر استعمال کرے۔

ملکیت کے بارے میں شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

اعلم: ان الله تعالى لما خلق الخلق وجعل معاشهم في الارض واباح لهم الاستفعا بها فيها وقعت بينهم المشاحة والمشاجرة، فكان حكم الله عند ذلك ان يحريم ان يزاحم الانسان صاحبه فيما اختص به لسبق يده اليه او يد مورثه او لوجه من الوجوه المعتبرة عندهم الا ببإدلة او تراض معتمد على علم من غير تدليس وركوب غرر (حجة الله البالغة، ج ٢، ص ٥١٩ زمزم پبلشرز)

”اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر پیدا کر کے اس کی روزی کاسمان بھی نہیں فراہم کر دیا ہے اور سب انسانوں کو حق دیا ہے کہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ لیکن انسان کی خود غرضانہ مسابقت (Competition) اور باہمی تنازع کو روکنے کے لیے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ جو شخص کسی قطعہ زمین سے سب سے پہلے نفع حاصل کرنا شروع کر دے، وہ اس کی ملکیت ہوئی۔ اب کسی دوسرے کو حق نہیں ہے کہ اس سے انتفاع کر سکے تاوقتیکہ پہلے قبضہ کرنے والا رضامندی کے ساتھ خود ہی اس کو نہ دیدے یا برضائے خود مبادلے کے لئے آمادہ نہ ہو جائے۔ ان دونوں صورتوں میں بھی کسی قسم کا فریب اور دھوکہ نہیں ہونا چاہیے۔“

یعنی رزق و روزی انسان کی بنیادی ضروریات ہیں، ان کے لئے ذرائع و وسائل سے استفادہ حاصل کرنا، ہر ایک انسان کا بنیادی حق ہے، لیکن یہ صورت اپنی عملی زندگی میں تقابلی کشش کی فضا کو جنم دیتی ہے، اسی لئے اشیاء اور ذرائع پیداوار کی تقسیم اور انتقال، اصول و قواعد کے تحت رکھا جائے گا، تاکہ اس کشش کے اسباب و محرکات ختم کئے جائیں۔ اور اس میں بھی قاعدہ یہ ہے کہ وہ اصول دوسروں کے تنگی، غریب یا دھوکہ کا باعث نہ بنیں بلکہ ان میں انسانی بھلائی مضر بلکہ ان کا لازمی نتیجہ ہو۔ اور اسی قاعدہ کے تحت کسی چیز کا اپنے پاس ہونے کا نام ”حق ملکیت“ ہے۔ اور حق ملکیت سے مراد، ”حق انتفاع“ ہے، کیونکہ کوئی بھی آدمی کسی بھی چیز کا حقیقی مالک نہیں، بلکہ حقیقی اور اصلی مالک خدا تعالیٰ ہی ہے۔

ایک جگہ زمین کی ملکیت کے بارے میں ارشاد ہے:

الاصل فيه ما أو مانا ان الكل مال الله ليس فيه حق لاحد في الحقيقة لكن الله تعالى لما اباح لهم الانتفاع بالارض وما فيها وقعت المشاحة فكان الحكم حينئذ أن لا يهييج احد مباسبق اليه من غير مضارة، فالارض البيئته التي ليست في البلاد ولا في فنائها اذا عمرها رجل فقد سبقت يده اليها من غير مضارة فمن حكمه ان لا يهييج عنها۔ والارض كلها في الحقيقة بمنزلة مسجد اور باط جعل وقفاً على ابناء السبيل وهم شركاء فيه فيقدم الاسبق فالاسبق، ومعنى الملك في حق آدمي كونه احق بالانتفاع من غيره (تجۃ اللہ البالغہ: ج ۴، ص ۵۲۲ مزم پبلشرز)

”یعنی اس میں شک نہیں کہ مال سب کا سب اللہ تعالیٰ کا ہے، اصل میں اس میں کسی کا حق نہیں ہے۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور اس کی پیداوار سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیدی تو لوگوں نے حرص اور لالچ کا اظہار شروع کر دیا (یعنی زیادہ زمین پر قبضہ کرنے لگے۔) اس لیے قاعدہ یہ بنایا گیا کہ جو شخص کسی زمین پر پہلے قبضہ کر لے بشرطیکہ اس سے کسی کو نقصان اور ضرر نہ پہنچتا ہو، تو اسے اس فائدہ اٹھانے سے نہ ہٹایا جائے۔ لہذا غیر کاشت شدہ زمین کو جو شہر اور اس کے مضافات میں نہ ہو، جو شخص پہلے کاشت کرے بشرطیکہ اس سے کسی کو نقصان نہ پہنچتا ہو، اس کا حکم یہی ہے کہ اسے اس سے نہ ہٹایا جائے۔ ساری زمین حقیقت میں مسجد یا سرائے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ دونوں آنے جانے والوں پر وقف ہیں اور سب لوگ ان میں برابر

کے شریک۔ مگر جو پہلے آکر قبضہ کر لے، وہ اسی کی ہوجاتی ہے۔ (لیکن ظاہر ہے کہ کوئی شخص اتنی ہی جگہ پر قبضہ کرنے کا حق رکھتا ہے، جتنی جگہ وہ بیٹھے) ایسے ہی زمین پر کسی آدمی کے قبضہ کے صرف یہ معنی ہیں کہ وہ دوسرے شخص کی بہ نسبت اس قطعہ زمین سے فائدہ اٹھانے کا فائق (ترجیحی) حق رکھتا ہے۔“

لیکن جب یہ ”حق انتفاع“ حاصل کرنے کا وہ شخص اہل نہ رہے تو پھر اسے اس حق سے یا تو خود دستبردار ہونا چاہیئے یا ریاست (اولی الامر) کو اس کا بندوبست کرنا چاہیئے۔

حاصل یہ کہ اصل اصول یہ ہے کہ ذرائع پیداوار اور وسائل معاش کی تقسیم ایسی ہونی چاہیئے جس سے نہ طبقاتی نظام پیدا ہو اور نہ دوسروں کے لئے تنگی کا باعث بنے اور نہ ہی دولت کے پھیلاؤ اور گردش کے لئے رکاوٹ پیدا کرے۔ جیسے ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی لکھتے ہیں: ”جو کاروبار دولت میں گردش کو کسی خاص طبقے کے اندر محدود کرے، وہ ملکی معیشت کے لئے تباہ کن ہے۔ شاہانہ نظام زندگی جس میں مٹھی بھر افراد یا چند خاندان کے عیش و عشرت کے سبب دولت کی صحیح اور منصفانہ تقسیم میں خلل واقع ہو یا رکاوٹ پیدا ہو، اس کا مستحق ہے کہ اس کو جلد سے جلد ختم کر کے عوام کی مصیبتیں ختم کی جائیں اور انہیں مسایانہ زندگی بسر کرنے کا موقعہ فراہم کیا جائے۔“ (شاہ ولی اللہ کا سیاسی اور سماجی فلسفہ، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات، ص: ۲۲۴-۲۲۵)

مزم دور اور سرمائیدار کے نزاع کے بارے میں کہتے ہیں:

ان کان استنماء فيها باليس له دخل في التعاون كاليسر اوبها هو تراض يشبه الاقتضاب كالريافان
المفلس يضطر الى التزام ما لا يقدر على ايفائه وليس رضا رضا في الحقيقة - فليس من العقود
البرضية ولا الاسباب الصالحة وانها هو باطل وسحت باصل الحكمة البدنية

(تجۃ اللہ البالغہ: ج ۴، ص ۵۲۰ مزم پبلشرز)

”اگر مال بڑھانے میں تعاون کو دخل نہ ہو یا ایسی رضامندی ہو جس میں جبر پایا جائے تو اس قسم کے معاملات ناپسندیدہ اور غیر صالحہ ہیں اور یہ اجتماعی زندگی کے اصول کے لحاظ سے باطل اور گناہ ہیں۔“

اس عبارت سے دو چیزیں مترشح ہوتی ہیں: ایک یہ کہ معاشری کی اقتصادی فلاح اس میں ہے کہ اس معاشرہ میں ”تعاون کا دخل“ اصل الاصول اور اقتصادی نظام کی بنیاد کی حیثیت رکھتا ہو، یعنی ایسی مشقت، جس کا نتیجہ سماج کی تعمیر ہو اور وہ محنت ہے۔ چونکہ اسلام میں سرمایہ کی بنیاد محنت ہے، اس لئے شاہ ولی اللہ اس کا دخل لازم قرار دیتے ہیں، یعنی اس کا حصہ شامل ہو۔ دوسری یہ بات کہ ”ایسی رضامندی جس میں جبر پایا جائے، اس سے انکار لازم ہے۔“ جس کے معنی ہیں کہ محنت کش کا معاوضہ اس کی مجبوری کو سامنے رکھتے ہوئے متعین نہ کیا جائے بلکہ اس کی بنیادی ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے طے کیا جائے، ورنہ وہ استحصال شمار ہو گا۔

اس کی مثال میں شاہ صاحبؒ نے دو مثالیں بیان فرمائی ہیں: (۱) قمار (Gambling) (۲) سود (Usury)

ان دونوں میں ایک بات تو مشترک ہے، وہ یہ کہ ان میں بغیر محنت کے سرمایہ پہ لوٹا جا رہا ہے، کوئی ایسا کام نہیں کیا جا رہا، جس کے نتائج و اثرات سوسائٹی میں پیدا ہوتے ہوں۔ اور رہا کی مثال سے یہ وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ جبری رضامندی کا کوئی اعتبار نہیں، بلکہ حقیقی اور دل کی رضامندی کا اعتبار ہے، اسی لئے دوسروں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا اور نفع حاصل کرنا، استحصال اور غیر اخلاقی و غیر انسانی صورت ہے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی نے اس طرح بیان کیا ہے:

”شاہ صاحبؒ کا دوسرا اہم معاشی اصول یہ ہے کہ مزدور، کاشت کار اور وہ افراد جو ملک اور قوم کے لئے دماغی کام کریں، دولت کے اصل مستحق ہیں۔ ان کی ترقی اور خوشحالی ہی ملک اور قوم کی اصل ترقی اور خوشحالی ہے۔ جو معاشرہ محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے اور جس میں مزدوروں اور کاشت کاروں پر بھاری ٹیکس لگائے جاتے ہوں، ملک اور قوم کا دشمن ہے، اس کا خاتمہ ہونا چاہیے، حاجت مند مزدوروں کی رضامندی قابل اعتبار نہیں جب تک کہ محنت کی وہ قیمت ادا نہ کی جائے جو امداد باہمی کے اصول پر لازماً ہوتی ہے۔ پیداوار اور آمدنی جو تعاون باہمی کے اصول پر نہ ہو، خلاف قانون ہے۔

کام کرنے والوں یعنی مزدوروں اور کاشت کاروں کے کام کے اوقات محدود و متعین کئے جائیں۔ انہیں اتنا وقت ضرور ملنا چاہئے کہ وہ اپنی روحانی اور اخلاقی اصلاح کر سکیں اور ان میں اپنے مستقبل کے بارے میں غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد انیسویں صدی اور اس کے بعد بیسویں صدی میں مزدور تنظیموں کی طرف سے یہی مطالبہ پیش کیا گیا اور بہت سے ملکوں میں اس مطالبہ کو منظور کیا گیا، لیکن مزدوروں اور کام کرنے والوں کی مادی فلاح اور بہبود کے لئے سب سے پہلے شاہ صاحبؒ نے یہ نظریہ پیش کیا۔ تعاون باہمی کا بہت بڑا ذریعہ تجارت ہے، اس کو تعاون باہمی ہی کے اصول پر جاری رہنا چاہئے۔ جس طرح تاجروں کے لئے جائز نہیں کہ وہ غلط قسم کی مسابقت یا مقابلے سے تعاون باہمی کو نقصان پہنچائیں، اسی طرح حکومت کے لئے بھی درست نہیں کہ وہ بھاری ٹیکس لگا کر تجارت کے فروغ اور ترقی میں رکاوٹ ڈالے۔“

(شاہ ولی اللہ کا سیاسی اور سماجی فلسفہ، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار و نظریات، ص: ۲۲۳)

اپنے ملک اور قوم کی سماجی ترقی کے لئے شاہ صاحبؒ کا نظریہ یہ ہے کہ لین دین کے معاملات صاف اور شفاف، دھوکہ اور غرر (Fraud) سے بالکل محفوظ ہوں۔ سوسائٹی کے تمام افراد محنت و مشقت کر کے نئی چیزیں ایجاد و اختراع کر کے آگے کی طرف سفر کرے۔ سب مل جل کر اشتراک عمل اور باہمی رواداری سے اپنے سماج میں کردار ادا کریں۔ حصولِ رزق کے مواقع سب کے لئے یکساں ہوں، وہ قدرتی اشیاء جن کا فائدہ پوری قوم کو ہوتا ہو، یا وہ پوری قوم کے لئے ضروری ہوں (یعنی ان کو قابل انتفاع بنانے میں کسی فرد یا

جماعت کا کوئی بھی دخل نہ ہو) ان کو حتی الامکان اپنی اصلی صورت میں رکھا جائے اور وہ اس طرح ہو کہ ان سے ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کے مطابق نفع حاصل کر سکے۔ قدرتی اشیاء کو بقدر ضرورت استعمال کیا جائے۔ ہر ایک انسان اپنی ضروریات اس طرح پوری کرے جس سے دوسرے کو تنگی یا ضرر نہ پہنچے۔ چنانچہ حجۃ اللہ میں لکھتے ہیں:

لما كان الناس مدنيين بالطبع لا تستقيم معاشهم بالتعاون بينهم نزل القضاء بايجاب التعاون بينهم وان لا يخلو احد منهم مباله دخل في التمدن الا عند حاجة لا يجد منها بدا

(حجۃ اللہ البالغہ ج ۴، ص: ۵۱۹ زمزم پبلشرز)

”چونکہ انسان مدنی الطبع ہیں، اس لئے ان کی معیشت ان کے باہمی تعاون کے بغیر درست نہیں ہو سکتی۔ اس لئے حکم ہوا کہ تمام لوگ باہمی تعاون سے کام لیں اور یہ بھی حکم ہوا کہ جس چیز کو تمدن میں دخل ہے، کوئی آدمی کسی شدید حاجت کے بغیر اس سے خالی نہ رہے۔“

تعاون اور اشتراک عمل سے قوم کی ترقی وابستہ ہے، اس لئے وہ وسائل و ذرائع جو تعاون کی روح سے خالی ہیں یا ان میں محنت و مشقت نہیں، وہ حرام اور ناجائز ہیں اسی طرح جن میں جبری رضامندی پائی جاتی ہوں وہ بھی فتنج ہیں، قمار، سٹہ، رشوت، سود، دھوکہ اور غرر سب تمدنی اصولوں کے لحاظ سے غلط ہیں۔ اسی طرح وہ معاملات جو نزاع اور جھگڑے کا باعث بنتے ہیں، وہ بھی حرام ہیں۔

آگے فرماتے ہیں: فاصل التسبب حيازة الاموال الباحة او استنباء ما اختص به بياستبد من الاموال الباحة كالتنازل بالرعي والزراعة باصلاح الارض وسقي الباء ويشترط في ذلك ان لا يضيّق بعضهم على بعض بحيث يفضى الى فساد التمدن (حجۃ اللہ البالغہ ج ۴، ص: ۵۲۰ زمزم پبلشرز)

”معاشی وسائل کو وسیلہ کار بنانے کے لئے بنیادی اصول یہ ہے کہ جائز مال کو قبضے میں لایا جائے اور اس کو اس طرح ترقی دی جائے جس طرح ترقی دینا جائز ہے۔ مثلاً مویشیوں کی افزائش نسل، آب پاشی اور اصلاح زمین کے ذریعے سے زراعت کرنا وغیرہ۔ لیکن اس باہمی تعاون سے معاشی وسائل کو حاصل کرنے کی شرط لازمی یہ ہے کہ یہ معاشی سرگرمیاں اور ذرائع پیداوار میں تصرفات ایک دوسرے کی معاشی زندگی کی تنگی کا باعث نہ بن جائیں ورنہ تمدن میں فساد پیدا ہو جائے گا۔“

آپ اس بات پر زیادہ زور دیتے ہیں کہ اجتماعی مفاد ہر صورت میں ملحوظ نظر ہو، کسی کو کوئی ضرر پہنچنے کا اندیشہ بھی نہ ہو۔

حجۃ اللہ البالغہ میں ہے:

الاصل فيه انه لبا توجّه للناس في شئ مباح حقوق مترتبة، وجب ان يراعى الترتيب في قدر ما يحصل لكل

فائدہ (حجۃ البالغہ، ج ۴، ص ۵۲۶: مزرم پبلشرز)

”اصل املاک میں یہ ہے کہ جس چیز میں بہت سے لوگوں کے حقوق علی الترتیب لازم ہوں، تو ایسی صورت میں واجب یہی ہے کہ ترتیب کی اس قدر رعایت رکھی جائے کہ جس سے سب کو فائدہ پہنچے۔“
آپ پیشوں کی تقسیم و تنظیم کے بارے میں بھی توجہ دلاتے ہیں اور حکومتی منصبی فرائض میں سے ایک اہم فریضہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ پیشوں کی صحیح تقسیم ہونی چاہیے، اگر پیشوں کی تنظیم صحیح نہ کی جائے گی تو معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوگا۔ اور ایسے پیشے اختیار کرنا ضروری ہیں جن سے تمدنی تعمیر اور سماجی تشکیل و ترقی وابستہ ہو۔

نقصان دینے والے پیشے، مثلاً، شراب کا کاروبار، یا دوسری نشہ آور چیزوں کا پیشہ اختیار کرنا یا اور نقصان دینے والی اشیاء کا پیشہ اختیار کرنا ممنوع ہونا چاہیے۔ اسی طرح اس بات کو بھی سختی سے رد کرتے ہیں کہ لوگ ایک ہی پیشے کے پیچھے پڑ جائے اور اصلی پیشے چھوڑ دے۔ مثلاً، صنعت و زراعت کو چھوڑ کر سب لوگ سرکاری کلرک (ملازمت) کے پیچھے پڑ جائے تو اس سے بھی سوسائٹی میں عدم توازن اور بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ اور انفرادی طور پر پیشہ اختیار کرنے کے بارے میں یہ اصول بتاتے ہیں کہ آدمی کو ایسا پیشہ اختیار کرنا چاہیے جس سے وہ اپنی بنیادی ضرورتیں آسانی سے پوری کر سکے، ورنہ وہ آدمی بھوک سے مر جائے گا یا بھیک مانگنے پر مجبور ہوگا۔
پیشوں کی منصوبہ بندی کے بارے میں فرماتے ہیں:

اعلم! انه اذا اجتمع عشرة آلاف انسان في بلدة مثلاً فالسياسة البدنية تبحث عن مكاسبهم فانهم ان كان اكثرهم مكتسبين بالصناعات وسياسة البلدة والقليل منهم مكتسبين بالزراعة ففسد حالهم في الدنيا (حجۃ البالغہ، ج ۴، ص ۵۳۸: ۵۳۹: مزرم پبلشرز)

”یاد رکھو! اگر کسی شہر میں مثال کے طور پر دس ہزار نفوس کی آبادی ہو، تو سیاست مدینہ کا تقاضا یہ ہے کہ اہل شہر کے پیشوں پر گہری نگاہ ڈالی جائے، کیونکہ اگر ان میں سے اکثر صنعت و حرفت اور سرکاری ملازمتوں میں مشغول ہیں اور معدودے چند افراد ایسے ہیں کہ گلہ بانی اور زراعت کا کام کرتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے دنیاوی احوال میں فساد برپا ہو جائے گا۔“
ملکیت کے بارے میں شاہ صاحبؒ کی مذکورہ عبارات کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا حفظ الرحمن نے یہ نتائج اخذ کئے ہیں:

(۱) معیشت میں فطری تفاوت درجہات کے باوجود تمام مخلوق یکساں اور برابر ہے اور خدا نے تمام معاشی وسائل میں زمین اور پیداوار زمین کو سب کے لیے مباح الاصل پیدا کیا ہے۔ اور تعیین و تشخیص (ذاتی ملکیت) جائز قبضہ سے ہی وجود میں آتی ہے۔

(۲) اور کسی فرد کو ان اموال مباح میں اسی قدر اور اسی طریقہ سے قبضہ و تصرف جائز ہے کہ اس سے دوسرے فرد کے لیے معاشی ضیق کے اسباب پیدا نہ ہو جائیں۔

(۳) نیز معاشی معاملات میں باہمی تعاون و ”اشتراک عمل“ واجب اور ضروری ہے۔

(۴) اور یہ تعاون ایسے صحیح اور صالح طریقوں پر مبنی ہونا چاہیے کہ اس سے نظام تمدن میں ابتری نہ پھیل جائے، یعنی ان کے ذریعے معاشی معاملات میں ایک دوسرے کو مدد ملے، نہ کہ ایک کا فائدہ دوسرے کی مضرت پر موقوف ہو۔

(۵) پس اس صالح معاشی نظام میں وہ تمام معاملات ناجائز اور حرام ہیں، جن میں تعاون باہمی کا مطلق دخل ہی نہ ہو، بلکہ ایک فرد کی تباہی اور مضرت پر دوسرے فرد کی مالی منفعت کا مدار ہو، جیسا کہ مثلاً قمار (جوا) خواہ وہ غیر مہذب طریقوں سے عمل میں آئے یا سٹہ اور لاٹری وغیرہ مہذب طریقہ ہائے تجارت کے ذریعے سے۔

(۶) اور وہ معاملات بھی ناجائز اور حرام ہیں جن میں بظاہر اگرچہ باہمی رضا اور تعاون نظر آتا ہے، لیکن ان کی تہہ میں زبردستی کے سوا اور کچھ نہ ہو، جیسا کہ مثلاً ربو (سودی لین دین) اور ایسے تمام اجارات و معاملات جن میں ایک جانب سرمایہ دار کا سرمایہ ہے اور دوسری جانب ایک مفلس و نادار کی اضطراری ضرورت۔ اور سرمایہ دار مفلس کے افلاس اور اس کی اضطراری حاجت سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اجارہ، رہن اور دوسرے لین دین میں اس سے ایسی شرائط منظور کر لیتا ہے جو انصاف اور عدل کی نگاہ میں کسی طرح جائز نہیں تھیں، مگر مفلس کے افلاس اور ضرورت مند کی ضرورت نے ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا۔

(۷) پس اس قسم کے تمام معاملات اگرچہ باہمی رضا مندی سے بھی طے پا جائیں، تب بھی اسلام اور خدائے کائنات کے نزدیک باطل اور ظلم ہیں اور صالح معاشی نظام میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں خواہ ان کے ظاہری فائدے کتنے ہی خوشگوار کیوں نہ ہوں۔ اس لئے کہ اس قسم کے کاروبار کا آخری نتیجہ عوام کی ہلاکت و افلاس اور ایک مخصوص طبقہ کی اجارہ داری کے سوا کچھ نہیں ہے، اس لیے یہاں مہاجرینی سود کا کاروبار بھی ملعون ہے اور سودی بنکوں کا سسٹم بھی مذموم و مطرود۔ اور یہاں مستاجروں کے وہ تمام طریقہ ہائے تجارت بھی حرام ہیں، جن میں اجیر کی جائز اور عادلانہ اجرت و حقوق کی حق تلفی ہو اور اس کے اضطرار اور پریشان حالی سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہو اور اجیر کی وہ خیانت بھی ناجائز جس سے صاحب سرمایہ کو ناحق نقصان پہنچانے کی سعی کی جائے۔ (اسلام کا اقتصادی نظام ص ۶۹ تا ۷۸: اسلامیت)

حقیقت میں شاہ صاحبؒ کی اقتصادی فلاسفی کی یہی خصوصیت ہے کہ شاہ صاحبؒ نے علم الاخلاق اور علم الاجتماع میں علم الاقتصاد کی اہمیت کو واضح کیا، لیکن صرف علم الاقتصاد ہی کو سب کچھ نہیں سمجھا، اس کے ساتھ

جو اخلاقیات کے تقاضے ہیں، وہ بھی ضروری قرار دیتے ہیں۔ اور ان دونوں چیزوں کو کوئی خارجی اثرات کا نتیجہ قرار نہیں دیتے، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ اعتدال و توازن میں ہی انسان کی حقیقی ترقی و فلاح مضمر ہے اور یہی انسان ذات کی نوعی تقاضا ہے۔ یعنی آپ مذہب، اخلاق اور معیشت کے باہمی تعلق کو واضح کرتے ہیں اور بہترین سماج کی تعمیر و تشکیل کے لئے ان سب کے باہمی توازن کو حقیقی محرک قرار دیتے ہیں اور انسان کی سماجی زندگی کے ارتقائی مراحل کے طے کرنے میں معیشت کو بنیادی جز کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور قوموں کے عروج و زوال کو اسی نقطہ سے دیکھتے ہیں۔

آخر میں ہم مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے کتاب شاہ ولی اللہؒ اور ان کا فلسفہ سے یہ قول نقل کر کے اپنے مضمون کو ختم کرتے ہیں:

”اگر انسانی زندگی کو اس کی اقتصادی ضروریات سے لیکر اس کی اعلیٰ اور ترقی یافتہ شکل تک ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں سمجھی جائیں تو اس انسانی زندگی کے لیے جو بھی فلسفہ بنے گا، وہ مکمل ہو گا اور وہ تمام زندگی کو بحیثیت مجموعی ایک وحدت سمجھ کر اس کے لیے نظام مرتب کرے گا۔ اس لیے انسان کی اجتماعی زندگی کے لیے ایک ایسا اقتصادی نظام ہونا چاہیے جو اس کی اقتصادی ضروریات کو پورا کرے۔ چنانچہ جب انسان اپنی حیوانی زندگی کی ضروریات سے مطمئن ہوں گے اور ان کے پاس روٹی، کپڑے کے دھندوں سے کچھ فاضل وقت بچے گا تو پھر کہیں وہ اپنی اعلیٰ تر استعدادوں اور بلند لطائف کی تکمیل کی طرف متوجہ ہو سکیں گے۔

ان حالات کے پیش نظر اگر یہ کہا جائے کہ جو نظام فکر یا فلسفہ اقتصادی زندگی کی ضرورتوں کو نظر انداز کرتا ہے، وہ فلسفہ نہ تو مکمل ہے نہ صحیح، تو یہ کہنا بے جا اور نادرست نہ ہو گا۔

انسانیت جب کبھی اس قسم کی اقتصادی مصیبت میں گرفتار ہو جاتی ہے، تو اس کو نجات دینے کے لیے کبھی تو انبیاء کے ذریعے الہام خداوندی صورت پذیر ہوتا ہے اور کبھی یہ الہام کسی صدیق اور حکیم کو اپنے اظہار کا واسطہ بناتا ہے۔ چنانچہ ان کی کوششوں سے جب اجتماع انسانی کا یہ اقتصادی نظام درست ہو جاتا ہے، تب کہیں جا کر انسانیت کے سامنے اپنے اخلاق کی تکمیل کے لیے راستہ کھلتا ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں اگر انسان کے اخلاق اس طرح پایہ تکمیل کو پہنچے تو مرنے کے بعد اس کو قبر اور حشر کی مصیبتوں سے نجات مل جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حیات بعد الموت میں انسان کا جنت کی نعمتوں سے مستفید ہونا، دراصل اسی تکمیل اخلاق کا نتیجہ ہے، جو انسان دنیا کی اس زندگی میں کرتا ہے۔ اب حیات انسانی کا ایک درجہ تو دنیا کی یہ زندگی ہے۔ انسان اس میں اپنے اخلاق کی تکمیل کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہو کر موت کی راہ طے کر کے جنت میں پہنچتا ہے۔ یہ اس کی زندگی کا دوسرا درجہ ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کی ترقی کا قدم رک نہیں جاتا، وہ اور آگے بڑھتا ہے۔ اور زندگی کے تیسرے درجہ میں قدم رکھتا ہے۔ یہاں اسے رویت رب العلمین کی سعادت کبریٰ سے سرفراز ہونے کی

صلاحیت حاصل ہوتی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ کس طرح انسانی زندگی کی ابتدا سے لیکر اس کے آخری درجہ تک اس حکمت کا سلسلہ کہیں نہیں ٹوٹتا۔ اور شاہ صاحبؒ کا نظام فکر اتنا جامع، عالمگیر اور ہمہ گیر ہے کہ وہ انسان کی ابتدائی ضروریات سے۔ جنہیں ہم حیوانی زندگی کے لوازم کہتے ہیں۔ لیکر انسانیت کی ترقی کی آخری اور ارفع ترین منزل تک جتنے ارتقائی مراحل اور مقامات ہیں، ان سب کو اپنے اندر لے لیتا ہے۔

اب اگر اس نظام فکر کی اساس نبوت کو مان لیا جائے اور جہاں نبوت نہ ہو، وہاں انبیاء کے پیروؤں میں سے صدیق اور حکیم یہ کام کریں تو اس تشریح کے بعد نبوت انسانیت کے لیے کس قدر فطری چیز بن جاتی ہے اور جیسا کہ عام طور پر غلطی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ نبوت کا کام صرف اس زندگی کے بعد کے مسئلوں کو حل کرنا تھا، اس کی بھی تردید ہو جاتی ہے، پھر نبوت کی تعلیم صحیح معنوں میں حسنۃ فی الدنیا اور حسنۃ فی الآخرة کا حامل بھی بن جاتی ہے۔“ (شاہ ولی اللہؒ اور ان کا فلسفہ ص: ۲۰۸ تا ۲۰۹ سندھ ساگر اکادمی)

اس مضمون کے لیے مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

۱۔ تفسیر سندھی ۲۔ شاہ ولی اللہؒ اور اس کی سیاسی تحریک ۳۔ شاہ ولی اللہؒ اور ان کا فلسفہ

۴۔ اسلام کا اقتصادی نظام

۵۔ حجتہ اللہ البالغہ

۶۔ بدور بازغہ

۷۔ افکار شاہ ولی اللہؒ

۸۔ شاہ ولی اللہؒ کا فلسفہ عمرانیات و معاشیات

۹۔ شاہ ولی اللہؒ کا نظریہ معیشت اور عصر حاضر میں اس کی افادیت

۱۰۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ، سیاسی حالات و افکار۔

۱۱۔ شاہ ولی اللہؒ اور ان کے افکار و نظریات (مولانا عطاء الرحمن قاسمی)

۱۲۔ معیشت اور اخلاق کا باہمی تعلق اور شاہ ولی اللہؒ (مولانا حافظ الرحمن)

”ربوبیت“ عصر حاضر میں

رب: لغت میں رب کے معنی پرورش کرنے اور نشوونما دینے والے کے ہیں۔ قرآن حکیم نے رب کو ”آقا“ کے معنی میں بھی استعمال کیا ہے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ نے زلیخا سے کہا کہ تیرا شوہر میرا رب یعنی آقا ہے: (قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي) قیدیوں سے حضرت یوسفؑ نے کہا کہ تم سے ایک اپنے آقا (رب) کو شراب پلائے گا: (أَمَّا أَحَدُكُمَا فَيَسْقِي رَبَّهُ خَمْرًا)

العالمین: انسان، قومیں، لوگ۔ اس کے ساتھ کائنات میں ہر نوع کی مخلوق بھی اس سے مراد ہے۔

خدا کی مخلوق کی ان گنت انواع میں انسان بھی شامل ہے۔ لیکن انسان اور دوسری مخلوق میں ایک بنیادی فرق ہے، اقبال کے الفاظ میں انسان کے علاوہ تمام مخلوق عالم مجبور ہے، جب کہ انسان عالم مختار ہے۔ انسان کے علاوہ ہر مخلوق کا فرد اپنی جدوجہد اور ہمت سے اپنا رزق حاصل کرتا ہے، کائنات کی کسی مخلوق میں یہ نظام رائج نہیں ہے کہ کسی نوع کے ایک یا چند افراد تو آرام کریں اور باقی افراد ان کی ضروریات کی تکمیل کے لئے محنت و مشقت کریں، یہ نظام ربوبیت ساری فطرت میں رائج ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ مخلوق کی ان انواع میں آزاد ارادہ اور انتخاب کی آزادی کا داعیہ موجود نہیں ہوتا۔ یہ مخلوق اپنی جبلتوں کے ماتحت عمل کرتی ہے، اگرچہ ان میں بعض شعور کی حامل بھی ہیں مگر شعور بھی جبلی تقاضوں کے ماتحت کام کرتا ہے۔

اس کے مقابل انسان خود مختار اور آزاد ارادہ کا مالک ہے، وہ اپنے انتخاب میں بھی خود مختار ہے۔ قرآن حکیم نے ارادہ اور انتخاب کی اس آزادی کو ”امانت“ (TRUST) کی اصطلاح میں بیان کیا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ اس امانت کو پہاڑوں، دریاؤں اور دوسری تمام مخلوق کے سامنے پیش کیا گیا مگر کسی نے اسے قبول نہیں کیا، مگر انسان سے اس معاملہ میں ظلم و جہول واقع ہوا کہ اس نے اس بارگراں کو اٹھالیا۔ لہذا اس ”امانت“ یا آزاد ارادہ و انتخاب کے باعث انسانوں کے تشکیل کردہ نظام معیشت میں فطرت کے نظام ربوبیت کی نوعیت بدل گئی۔

انسان مسمود ملائکہ بھی ہے اور اس میں شیطان بھی موجود ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ انسان کی تخلیق میں جہاں طین لازم (MUD) ہے وہاں روح خداوندی کا نفع بھی موجود ہے۔ ملائکہ اور روح خداوندی کے

تقاضے، طین لازم اور شیطان کے تقاضوں سے قطعاً مختلف ہیں۔ انسانی فطرت میں جہاں جبلتیں اور ان کے حیوانی تقاضے ہیں وہاں الوہی قوت (DIVINE ENERGY) اور اس کے تقاضے بھی موجود ہیں۔

روح خداوندی کا نفع جہاں انسانی فطرت میں رحمت، محبت، مساوات، امن اور ضبط نفس، خود شعوری اور تعقل و علم کی قوتیں پیدا کرتا ہے، وہاں جسم کے تقاضے اس میں خود غرضی، لالچ، ہوس اندوزی، جنسی بے راہ روی، دوسروں کے مال و دولت پر زبردستی قبضہ کرنے کی کوشش، جنگ و فساد اور نفسانی لذتوں کے لئے ہر طرح کے حربہ کو استعمال کرنے کے رجحانات پیدا کر دیتے ہیں۔

قرآن حکیم اس سارے قصہ کو آدم کے دو بیٹوں ہابیل (ABEL) اور قابیل (QAIN) کی باہمی چپقلش اور بالآخر قابیل کے ہاتھوں ہابیل کے قتل ہونے کی داستان میں بیان کرتا ہے۔ ڈاکٹر علی شریعتی نے اس پر بڑی تفصیل اور خوبی سے روشنی ڈالی ہے، جس سے انسان کی تاریخ کا طبقاتی کریکٹر متعین ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہابیل اور قرآن نے بتایا ہے کہ آدم کے کہنے پر دونوں قربان گاہ میں اپنی اپنی نذر لے کر آئے۔ ہابیل قربانی کے لئے اونٹنی یا کوئی جانور لایا جب کہ قابیل اناج کے دانے لایا۔ یہ قصہ علامتی ہے۔ (SYMBOLIC) اونٹنی یا جانور انسانی تاریخ کے دور شکار کی علامت ہے، جس میں وہ دریاؤں اور جھیلوں سے مچھلی اور دوسرے پرندوں کا شکار کرتا اور جنگلوں سے پھل، سبزی اور جنگلی حیوانوں کا گوشت حاصل کرتا تھا۔ اور یہ بات عیاں ہے کہ دریاؤں اور جنگلوں پر کسی قبیلے یا افراد کا ذاتی قبضہ نہیں ہو سکتا تھا۔ انسان جہاں سے چاہتا اپنی خوراک حاصل کر لیتا تھا۔ (رَعْدًا حَيِّثُ يَشْتُمُّهَا الْبَقَرَةُ) چونکہ ان ذرائع رزق پر کسی کا ذاتی قبضہ نہیں تھا اور شکار وغیرہ کو قبیلے کا بزرگ سب میں مساوی تقسیم کر دیتا تھا، قبیلہ کے اجتماعی مفاد اور فرد کے ذاتی مفاد میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ اس دور شکار میں محبت، مساوات، امن اور بھائی چارہ کی فضا قائم تھی۔

مگر جب ان خانہ بدوش قبیلوں کو دجلہ و فرات وغیرہ کی وادیوں میں گندم کے خود روپودے ملے اور انہیں ان کی افادیت پر آگاہی ہوئی کہ یہ اناج گوشت اور پھل کی طرح چند دن کے بعد خوراک کے ناقابل ہونے کی بجائے ایک برس تک صحیح حالت میں رہ سکتا ہے، تو انہوں نے اناج کی کاشت شروع کر دی اور خانہ بدوش قبیلے دریاؤں کے کناروں پر آباد ہونا شروع ہو گئے۔

زمین کے جس خطہ پر جو فرد اناج کاشت کرتا تھا، وہ خطہ زمین اور پیداوار اس فرد کی ملکیت قرار پا جاتا تھا۔ یہاں سے ذرائع پیداوار پر ذاتی ملکیت (PRIVAT PROPERTY) کے ادارہ کی ابتدا ہو گئی۔ قرآن نے اس صورت حال کو ”ہبوط آدم“ سے تعبیر کیا ہے، کہ انسان ذاتی ملکیت سے پاک معاشرہ کی جنت سے نکل کر اب ذاتی ملکیت والے معاشرہ کی ارضی حیثیت میں آ گیا ہے۔

ذرائع پیداوار پر ذاتی ملکیت کے معاشرہ کے ارتقاء نے ریاست اور اس کے اداروں جیسے فوج، پولیس، عدالتیں، بیوروکریسی کو پروان چڑھایا اور یہ ریاست اور اس کے ادارے ”ذاتی ملکیت“ کی حفاظت کے لئے وجود میں آئے تھے، اس لئے یہ جبر اور ظلم کی علامت تھے۔ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار پر طاقتور قبیلوں اور افراد کے زیادہ سے زیادہ تعداد میں قبضہ کے لئے جنگ و فساد اور لوٹ مار نے سر اٹھایا۔ اور ان جنگوں میں پکڑے جانے والے قیدی افراد کو کئی خوراک کے باعث قتل کر دینے کی بجائے اب کے ان سے محنت اور مشقت کا کام لیا جانے لگا اور انہیں ”غلام“ (SLAVE) کہا جانے لگا۔ فاتح قبیلہ کے افراد کی ملکیت میں آنے کے بعد ان غلاموں کی حیثیت آقا (SLAVE OWNER) کی دوسری اشیائے ملکیت جیسی ہو گئی اور یہ انسانی سطح سے گر کر ایک ”شے“ (THING) بن گئے۔ انہیں قتل کیا جاسکتا تھا، انہیں بیچا جاسکتا تھا۔ ان سے پر تشدد مشقت لی جاسکتی تھی۔ انہیں دوسری زمینوں اور سلطنتوں پر قبضہ کرنے کے لئے جنگوں میں استعمال کیا جاسکتا تھا۔ بائبل تو قتل ہو چکا تھا مگر قابیل زندہ رہا اور یہی قابیل اب ذاتی ملکیت اور آقا والے معاشرہ کی شکل میں آگیا اور تاریخ میں حکمران (فرعون) صاحب مال و دولت (قارون) اور ان کے حقوق کی حفاظت و جواز کے لئے آسمانی سند دینے والے مذہبی پیشوا (علم باعور یا ہامان) کی شکل میں آج تک بار بار ابھر رہا ہے۔

انسان کے آزاد ارادہ اور انتخاب نے فطرت کے نظام ربوبیت سے بغاوت کر کے اپنا نظام ربوبیت تخلیق کر لیا، جس میں دس فیصد افراد تمام ذرائع پیداوار، ریاست اور علم و ہنر کے اداروں پر قابض ہو گئے، جب کہ نوے فیصد ان تمام چیزوں سے محروم رہے اور صرف اپنی محنت بیچ کر اپنا اور اپنی اولاد کا پیٹ پالنے پر مجبور ہو گئے۔

معاشرہ کے ارتقاء کے ساتھ آقا نے جاگیر دار اور جاگیر دار نے مشین کی ایجاد کے بعد کارخانہ دار کی شکل اختیار کر لی اور غلام نے زرعی غلام پھر اجرتی غلام کی حیثیت اختیار کر لی۔ ہمارے عہد میں اجرتی غلام، جسے مزدور یا پروتاریہ کہا جاتا ہے، کی محنت نے سارے صنعتی ارتقا اور ٹیکنالوجی کو ترقی دی ہے۔ اس کی محنت نے سرمایہ داری نظام کو پیدا کیا جو بعد میں سامراج کی شکل اختیار کر گیا اور جس نے ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی اقوام کے خام مال کے ذخائر کو لوٹا اور ان کے افراد کی محنت کو سستے داموں خرید کر ان کی محنت سے پیدا شدہ اشیاء کو انہیں کے ممالک میں بیچنے کے لئے نوآبادیاتی نظام قائم کیا۔ اور یہ نظام وقت کے ارتقائی عمل کے ساتھ ساتھ پیچیدہ سے پیچیدہ تر شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ مغربی اقوام نے منڈیوں کی تلاش اور ان پر قبضہ کی خاطر دو مہیب جنگیں لڑی ہیں اور دوسری جنگ کے بعد قدیم نوآبادیاتی نظام نے نئے نوآبادیاتی نظام کی شکل اختیار کر لی ہے۔ آج یہ نظام ملٹی نیشنل کارپوریشنوں، ورلڈ بینک، آئی ایم ایف، ورلڈ ٹریڈ کانگریس اور گیٹ جیسے

اداروں کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور محنت کش کی محنت کے استحصال اور کمزور و پسماندہ اقوام کے ذرائع پیداوار اور افراد کی محنت کی لوٹ مار کا عمل زیادہ پیچیدہ اور دلفریب بنا دیا گیا ہے۔

تاریخ کا یہ تناظر بتاتا ہے کہ جب تک مراعات یافتہ طبقہ کی دسترس سے اقتدار، ذرائع پیداوار اور علم و تہذیب کے اداروں کو انکار نہ کروایا جائے گا اور ان پر ”عوام“ کی ملکیت قائم نہ کی جائے گی تب تک خدا نے انسان کی تخلیق کے ساتھ اس کی پرورش، نشوونما اور تکمیل کے لئے جو ذرائع رزق پیدا کئے تھے، معاشرہ کے عام افراد ان ذرائع سے مستفید نہیں ہو سکیں گے۔

تمام مذاہب کے مذہبی پیشواؤں کی طرح قرآن کی تفسیر کرنے والا مفسر بھی خدا کی ربوبیت عامہ اور اس ربوبیت کے ذرائع کا ذکر تو کر دیتا ہے مگر وہ انسان اور اس کے تاریخی عمل کو تاریخ کے آئینہ میں دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا، وہ اس بات کو نظر انداز کر جاتا ہے کہ زراعت کے عہد کے آغاز سے لے کر آج تک محنت کش اور دوسرے پسماندہ افراد غلام، زرعی غلام اور اجرتی غلام کی شکل میں خدا کے پیدا کردہ ذرائع رزق، اقتدار، قانون سازی، علم اور تہذیب کے اداروں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے۔

اس صورت حال کو بدلنے کے لئے انبیاء کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تھا، انہوں نے توحید الہی کے نظریہ کو پیش کیا۔ توحید شرک کی ضد ہے۔ انسانی معاشرہ کی وحدت، متضاد و متضادم معاشی مفاد رکھنے والے طبقات میں تقسیم ہو چکی ہے جو توحید کے تقاضوں کے برعکس ہے اور یہ شرک زدہ حالت ہے، کیونکہ توحید کے تصور کا منطقی نتیجہ ”وحدت“ کا قیام ہے، جس میں ہر شعبہ حیات میں پائی جانے والی تنوع اور تثلیث ختم ہو جاتی ہے۔ جبکہ شرک زدہ حالت میں یہ قائم رہتی ہیں، مگر مذہبی پیشواؤں نے مراعات یافتہ طبقات کے مفاد کے حق میں کتب مقدسہ سے سند عطا کر دی، جس سے ان کا اپنا بھی بھلا ہوتا تھا اور آج تک ہو رہا ہے اور توحید کے نصب العین کے مطابق طبقاتی معاشرہ کو تبدیل کر کے لاطبقاتی معاشرہ میں بدلنے کے مقصد کو غرور کر دیا۔ انبیاء کا لایا ہوا دین محض ظاہری عبادات اور رسوم و رواج کی ادائیگی تک محدود کر دیا گیا۔ اس کے انقلابی عمل کی دھار کو کند کر دیا گیا۔ نتیجتاً مذہب انسان کی مرض کا علاج ثابت نہیں ہو بلکہ اس کے حق میں ایفون بن گیا۔

چونکہ اس آیت مبارکہ کو اس کے تاریخی پس منظر سے الگ کر کے مطالعہ کیا جاتا رہا ہے، اس لئے پانچویں وقت کی نمازوں میں لازمی تلاوت کے باوجود مسلم معاشرہ میں پہلے ملوکیت قائم ہوئی، ذرائع پیداوار پر قابض جاگیر دار طبقہ پیدا ہوا، غلاموں کا بیج و شرع ہوتا رہا۔ غلام کے ساتھ عورت بھی مظلوم رہی۔ عوام علم اور تہذیب کی برکات سے بے بہرہ رہے، کیونکہ ان پر مراعات یافتہ طبقہ کا قبضہ تھا۔ آج ملوکیت کی جگہ سرمایہ دارانہ جمہوریت نے لے لی ہے اور جاگیر دار کی جگہ کارخانوں کا مالک طبقہ پیدا ہو چکا ہے۔ اگرچہ ”غلامی“ کا ادارہ ختم ہو چکا ہے مگر غلامی کی روح موجود ہے۔ آج بھی محنت کش کو کی یا کمین کہا جاتا ہے۔

یہ صورت حال صرف مسلم معاشرہ کے ساتھ ہی وابستہ نہیں ہے بلکہ ”عالمین“ کا لفظ تمام اقوام عالم کی صورت حال کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اسلام کے ظہور سے پہلے اور بعد کے مسلم اور غیر مسلم معاشرے اسی طبقاتی مفاد کی دلدل میں پھنستے رہے۔ اس سورہ مقدسہ کی رب العالمین کی اصطلاح اپنے بعد آنے والی آیات کے مفہوم کو واضح کر دیتی ہے کہ اللہ کی ربوبیت عام انسانوں تک نہیں پہنچ سکی، بلکہ ایک قلیل تعداد نے ربوبیت کے ذرائع پر قبضہ کر کے اکثریت کو آج تک اس سے مستفید ہونے سے روک رکھا ہے۔ بعثت محمد ﷺ نزول قرآن اور ختم نبوت کا معنی و مقصد اور مسلمان کا فریضہ ہی یہ تھا کہ وہ ذرائع ربوبیت کو عام انسانوں تک پہنچانے کے لئے راستے کی تمام نظریاتی اور عمرانی رکاوٹوں کو دور کر کے ہر فرد کو ان سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کرے، مگر مسلمان خود ہی جاگیر داری، ملکیت اور مراعات یافتہ طبقوں کی گرفت میں آگیا اور ختم نبوت کے باوجود اقوام عالم کو اس غیر انسانی حالت سے نکالنے کے لئے عالمی سطح پر انقلاب پیدا نہ کر سکا۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی تصنیف ”اسلام اینڈ کمیونزم“ میں ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ غلام، زرعی غلام اور اجرتی غلام کی ساری محنت آقا، جاگیر دار اور کارخانہ دار کے سامان قیاس و آسائش کا باعث بنتی رہی ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

After all the wealth and comforts of rich are the products of the labour of the poor (p191)

ترجمہ یعنی امراء کے تمام سامان قیاس و آسائش غریب کی محنت کی پیداوار ہیں۔

اسی سبب خلیفہ صاحب نے مدینہ منورہ میں قائم ہونے والی ریاست کو ”اشتر کی جمہوریت“ کہا ہے۔ ختم نبوت کے باعث اسلام چونکہ ”انٹرنیشنل انقلاب کی تحریک“ کی حیثیت رکھتا ہے اور مسلمان اس انقلاب کو عملی جامہ پہنانے کا ذمہ دار بھی ہے اور ہر اول دستہ بھی ہے، اسی لئے اسے ”امت وسط“ کہا گیا ہے۔

لہذا خدا کی ربوبیت اس کے پیدا کردہ انسانوں تک اسی وقت پہنچ سکتی ہے جب ربوبیت کے ذرائع کو چند افراد کی نجی ملکیت کے قبضہ سے نکال کر عوام کی ملکیت میں لایا جائے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ امراء کی دولت ان کی محنت کا نتیجہ ہے تو یہ بات صریحاً غلط ہے اور یہ غلط فہمی اس لئے پیدا ہوئی کہ محنت اور استحصال محنت میں فرق نہیں کیا گیا۔ اگر ایک شخص زمین یا مشین، کوئلہ یا کسی اور دھات کی کان یا پیٹرول و گیس کے ذخیرہ کا مالک ہونے کے باعث انہیں محنت کشوں کے حوالے کر دے کہ وہ اس زمین کو جو تیں، مشین کو چلائیں، کان سے کوئلہ وغیرہ نکالیں اور پیٹرول یا گیس کے ذخیروں سے ان اشیاء کو برآمد کریں۔ تو مالک کی محنت اتنی ہے کہ اس نے کسی نہ کسی حربہ سے ان ذرائع پیداوار پر قبضہ کر کے

ان پر اپنا قبضہ غاصبانہ قائم کر لیا۔ مگر ان پر پیداواری عمل تو صرف محنت کش کرتا ہے اور اسی کی محنت کی پیداوار پر قبضہ کر کے مالک، اپنا نفع حاصل کرتا ہے۔ جس سے مالک کی دولت میں تو دن دگنی اور رات چوگنی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، جس سے وہ زندگی کے تمام آرام و آسائش حاصل کرتا، قیاس و زندگی بسر کرتا اور علم اور تہذیب کی برکات سے مستفید ہوتا ہے اور معاشرہ میں مہذب اور باعزت کہلاتا ہے۔

اس کے مقابل محنت کش باوجود اپنی شدید محنت و مشقت کے اپنی محنت سے حاصل کردہ پیداوار پر حق ملکیت سے محروم رہتا ہے۔ اسی سبب اس کی دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، اسے اجرت کی شکل میں اتنے پیسے ملتے ہیں جن سے وہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی زندگی قائم رکھ سکے۔ اس کا کوئی آرام دہ اور وسیع بنگلہ تعمیر نہیں ہوتا، وہ تنگ و تاریک کوٹھڑی میں رہتا ہے۔ وہ اور اس کی اولاد علم سے بے بہرہ اور تہذیب کی برکات سے محروم رہتی ہے۔ نسل در نسل وہ محنت کش ہی رہتا ہے اور اس کی محنت کے استحصال سے وہ نام نہاد مالک مضبوط تر اور ارفع تر ہوتا چلا جاتا ہے، اس کی زمینوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اس کی فیکٹریوں کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے، وہ ملٹی نیشنل کارپوریشن کا مالک بن جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ G-7 کے زمرہ میں آجاتا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس فرد کو زمینوں، کانوں، مشینوں اور پیٹرول و گیس کے سرچشموں کا مالک کس نے بنایا؟ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ سلسلہ دور زراعت سے شروع ہوا، وہ قبیلے یا افراد جنہوں نے اپنی طاقت اور مکاری سے اس وقت کے ذرائع رزق۔ زمین، دودھ دینے والے جانوروں، گھوڑوں اور اونٹوں وغیرہ کے گلوں پر قبضہ جمالیا، وہی بعد میں جاگیر دار اور مشین کی ایجاد کے بعد کارخانہ دار بن گئے۔ آج بھی ان ذرائع پر جن کا قبضہ ہے وہ اپنی ہوشیاری اور ناجائز ذرائع سے مالک بنے ہوئے ہیں۔

مذہبی پیشوائے اپنی جلب منفعت کے لئے ان ذرائع پر ناجائز طریقوں سے قبضہ حاصل کرنے کو آسمانی سند عطا کر دی اور اس طبقاتی نظام معیشت کو خدا کا قائم کردہ نظام قرار دے دیا۔ حالانکہ خدا کے نظام ربوبیت کے مقابل، جس میں ہر فرد اپنی محنت سے خدا کے پیدا کردہ سامان ربوبیت سے اپنا رزق حاصل کرتا ہے، یہ طبقاتی نظام معیشت، جس میں چند افراد تو بغیر محنت کے دولت مند بنتے چلے جاتے ہیں اور اکثریت اپنی محنت و مشقت کے باوجود غریب تر ہوتی چلی جاتی ہے، شیطانی نظام ہے اور اس نظام کو چلانے والے ”خناس“ ہیں، یہ الناس کے مقابل غیر ناس ہیں اور یہ طبقاتی نظام ”طاغوت“ ہے، اس طبقاتی نظام کو خدا کا قائم کردہ نظام سمجھنے والے علماء اور مفسروں نے قرآن حکیم کی ان اصطلاحات کو معاشرہ اور معاشرتی عمل سے علیحدہ کر کے ان کے مفہوم کو دیوالائی بنادیا جن تک انسان پہنچ ہی نہیں سکتا۔ شیطان کی جو تشریح کی گئی ہے کہ وہ ایک چھلاوا ہے جسے انسان اپنی گرفت میں نہیں لاسکتا، حالانکہ قرآن حکیم نے انقلاب دشمن انسانوں کو شیاطین کہا

ہے۔ (بقرہ) اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہر شخص کا شیطان اس کے خون کے ساتھ گردش کرتا ہے۔ قرآن نے اس کو نفس امارہ بھی کہا ہے۔ یہ سب محسوس تشریحات ہیں جنہیں سمجھ کر ان پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ مگر علماء اور مفسرین کے دیوالائی شیطان، خناس اور طاغوت کو نہ سمجھا جاسکتا ہے اور نہ ان پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ سب اصطلاحیں نہ صرف معاشرہ سے تعلق رکھتی ہیں بلکہ یہ معاشی عمل سے متعلق ہیں۔

ذرا غور فرمائیے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنی پہاڑی کے وعظ میں کن افراد کو مخاطب کیا اور نجات کی نوید سنائی۔ چند آیات ملاحظہ کیجئے:

۱۔ مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، کیونکہ آسمان کی بادشاہی انہیں کی ہے۔

۲۔ مبارک ہیں وہ جو غمگین ہیں، کیونکہ وہ تسلی پائیں گے۔

۳۔ مبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں، کیونکہ وہ زمین کے وارث ہوں گے۔

۴۔ مبارک ہیں وہ جو راستبازی کے بھوکے اور پیاسے ہیں، کیونکہ وہ آسودہ ہوں گے۔

۵۔ مبارک ہیں وہ جو رحم رکھتے ہیں، کیونکہ ان پر رحم کیا جائے گا۔

۶۔ مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں، کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔

۷۔ مبارک ہیں وہ جو راستبازی کے سبب ستائے گئے ہیں، کیونکہ آسمان کی بادشاہی انہیں کی ہے۔

اب ان آیات پر غور کریں، کیا تاریخ میں پائے جانے والے حکمران، مال و دولت کے مالک اور ان کے نمک خوار دل کے غریب، غمگین، حلیم الطبع، راستباز، رحم رکھنے والے اور راستبازی کے سبب ستائے جانے والے تھے یا وہ لوگ تھے جو غلام، زرعی غلام اور اجرتی غلام کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہود علماء اور سلطنت روم کے حکمران اور صاحب اقتدار لوگ ان صفات عالیہ سے خالی تھے۔ اور انہیں کے سبب ۳۳ برس کی عمر میں جب کہ حضرت مسیحؑ صرف تین سال اپنے مٹھن کی تبلیغ کر سکے، انہیں صلیب پر لٹکا دیا گیا۔

قرآن کے خناس، شیطان اور طاغوت معاشی عمل سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ وہ ہیں جو خدا کے پیدا کردہ ذرائع رزق پر قبضہ کر کے اکثریت کو ان سے مستفید ہونے سے محروم کر دیتے ہیں۔ حال ہی میں ایک شخص نے اپنی ایک فونڈری سے تیس فونڈریاں بنادیں، حالانکہ اس تعداد کے بڑھانے میں اس کی ”محنت“ کا کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ شب و روز سیاست کرتا رہتا تھا، محنت تو وہ مزدور کرتے تھے جو اس کی ایک فونڈری میں کام کرتے تھے اور ان کی محنت کے استحصال نے ا وران کی اجرت کے اس نادا کردہ (UNPAID) اجرت کے حصہ نے ایک سے تیس فونڈریاں بنادیں۔ مگر اس کی سیاسی جماعت کے

حمایتی اور دوسرے علماء نے کبھی اس بات کا نوٹس نہیں لیا، کیونکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ طبقاتی نظام خدائی نظام ہے اور انسان کی محنت کا استحصال جائز ہے۔ ان کے نزدیک اس استحصال اور نادا کردہ اجرت سے جو دولت اکٹھی ہوتی ہے، اس میں سے زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو اس کا سارا مال پاک ہو جاتا ہے۔ اسے وراثت میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور اس میں سے ”ناداروں“ کو خیرات دی جاسکتی ہے۔ ان کے نزدیک خدا نے ایک تقدیر بنائی ہے جس سے یہ طبقاتی نظام پیدا ہوا، جبکہ ”تقدیرات حق لا انتھاست“ محض شاعرانہ لفاظی ہے، جس سے پر عمل کرنا ایک لاطائل بات ہے۔ کیونکہ ایک سے زیادہ تقدیروں کے ہونے کا معنی یہ ہے کہ طبقاتی نظام کے مخالف لاطبقاتی نظام بھی تقدیر الہی ہے۔ اور یہ تقدیر محنت کشوں، محروموں اور محکموں کے مفاد کے مطابق ہے اور جو انہیں حق دیتی ہے کہ وہ ذرائع پیداوار پر قبضہ کر کے اس تقدیر الہی کے منشا کو پورا کریں۔

ربو (سود) اور استحصال محنت

ربوبیت کے ضمن میں ایک سوال یہ سامنے آتا ہے کہ ربو (یعنی سود INTREST OR USUARY) اور استحصال محنت کے درمیان کیا فرق ہے؟ قرآن حکیم نے سود کو حرام قرار دے دیا اور اسے خدا اور رسول کے خلاف اعلان جنگ سے موسوم کیا ہے۔ عہد حاضر میں مشین کی ایجاد کے بعد بنکوں کے قائم ہو جانے سے سود کے متعلق نئی بحث سامنے آئی ہے اور وہ ہے محنت کا استحصال جو سارے منافع (قدر زائد) (SURPLUS) (VALUE) کا سبب اول ہے۔ علماء اس سلسلے میں سخت کنفیوژن کا شکار ہیں۔ ان کے پاس تجارتی سود کو ختم کرنے کے بعد پورے معاشی سلسلہ کو چلانے کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سود تو گناہ کبیرہ قرار پایا مگر محنت کے استحصال کے عمل کو جائز سمجھ لیا گیا۔

استحصال گناہ ہے

یہ بات اس مثال سے واضح ہوگی کہ ایک شخص بینک سے ایک کروڑ روپیہ سود پر حاصل کرتا ہے اور اس رقم سے وہ کارخانہ قائم کرتا ہے۔ اس میں کام کرنے کے لئے مزدور بھرتی کرتا ہے۔ ہر سال حاصل شدہ منافع کی رقم سے سود ادا کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ بینک کو ایک کروڑ روپیہ بمبہ سود کے ادا کر دیتا ہے۔ اتنے عرصہ میں وہ ایک کارخانہ سے تین کارخانہ قائم کرنے کا اہل ہو جاتا ہے بلکہ یہ کارخانہ قائم ہو جاتے ہیں اور تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ”سود“ کی ادائیگی کے بعد یہ منافع کہاں سے آتے ہیں؟ کہ اس کے کارخانوں کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ ملٹی نیشنل کارپوریشنیں اور کارٹل وجود میں آ جاتے ہیں۔

مشین کی ایجاد کے بعد عہد حاضر کے معاشین کے سامنے سب سے بڑا اصول یہی ہے۔ اس سوال کے جواب کے لئے کارل مارکس کو اپنی ساری زندگی وقف کرنا پڑی اور سائنسی مطالعہ کی اساس پر یہ معلوم ہوا کہ

منافع، جس سے بینک کا سود بھی ادا ہوا اور کارخانوں کی تعداد بھی بڑھی، مزدور کی محنت کا وہ حصہ ہے جو اسے ادا نہیں کیا گیا۔ اس نا ادا یافتہ اجرت (UNPAID LABOUR) کے اجتماع سے موجود ساری تہذیب کی چمک دمک اور ترقی وجود میں آئی ہے۔ اس پر میں نے اپنی تصنیف ”فلسفہ بیگانگی اور قرآن“ میں تفصیلی بحث کی ہے اور بتایا گیا ہے کہ سرمایہ داری نظام نے سامراجی شکل اختیار کر کے ایشیاء، افریقہ اور جنوبی امریکہ کی اقوام کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

بعض دینی حلقوں نے بغیر سود کے بینکاری پر زور دیا بلکہ اسے قائم بھی کر دیا گیا ہے۔ مگر بغیر سود کے جو رقم حاصل کی گئی اور اس سے کارخانہ قائم کیا گیا یا مضاربت کا کام شروع کیا گیا۔ مگر سود کے بغیر منافع کی شرح میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور جس محنت کش کی محنت کی بدولت یہ ساری ”ترقی“ وجود میں آتی ہے وہ بدستور مزدور ہی رہتا ہے، اس کی حالت پسماندہ رہتی ہے۔ تیسری دنیا میں تو اس کی پسماندگی افسوس ناک حد تک موجود ہے جبکہ یورپ و امریکہ میں ”فلاجی ملکیتوں“ کے ذریعے اسے چند سہولتیں مہیا ہو جاتی ہیں۔ مگر دونوں جگہ اس محنت کش کی ساری عمر کی محنت کے باوجود اس کا کارخانہ بھی قائم نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی اولاد در اولاد کو بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اور استحصال محنت پر مبنی نظام حیات سے جو تصور کائنات و حیات ابھرتا ہے، اس میں زندگی کو لایعنیت (FUTALITY) اور لاحاصل (ABSURDTY) قرار دیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مادیت، دہریت کا تصور بھی اور ایک رویہ بھی وجود میں آتا ہے۔ اس سے ابھرنے والے کلچر میں جبلتوں کے حیوانی تقاضوں کو کسی اخلاقی حدود کو قائم کئے بغیر مقاصد کے حصول میں مادر پدر آزادی حاصل ہوتی ہے۔

اسلام اور دوسرے مذاہب کی دینی قیادت اور مذہبی پیشوائیت محنت کے استحصال سے حاصل شدہ دولت کو خدا کا انعام تصور کرتی ہے۔ اس کے نزدیک گناہ اور گناہ کبیرہ کی موجودگی فرد کی خدا کے احکام کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے۔ اس کے تصور مذہب میں محنت کش کی محنت کی اجرت کا نا ادا شدہ حصہ جسے منافع کہا جاتا ہے، بالکل جائز ہے۔ بلکہ مذہبی دانش اس معاشی عمل کو سمجھنے سے بھی قاصر ہے۔ یہ صورت حال اس وقت تک تبدیل نہیں ہو سکتی جب تک ذرائع پیداوار پر فرد کی نجی ملکیت کی بجائے اجتماعی ملکیت قائم نہیں ہو جاتی۔ اگرچہ قائم ہوجانے کے بعد بھی مزدور کی محنت قدر زائد پیدا کرے گی مگر یہ منافع یا قدر زائد فرد کے مفاد کی بجائے پورے معاشرہ اور پوری انسانیت کے مفاد کے حق میں استعمال ہو گا۔

سرمایہ دار نظام میں پانچ سالہ منصوبہ (PLAN) کو دس بار قائم کرنے سے وہ نتائج برآمد نہیں ہوتے جو اشتراکی نظام میں ایک یا دو منصوبے اپنے نتائج پیدا کر دیتے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر گناہ کبیرہ کی فہرست میں ”محنت کے استحصال“ کو سرفہرست ہونا چاہیے۔ مگر تمام مذاہب کی دینی قیادت کے نزدیک شراب نوشی، قمار بازی، جنسی بے راہ روی اور ایسی ہی دوسری قباحتوں کو گناہ کبیرہ تصور کیا جاتا ہے۔ جب تک

استحصال محنت کی ماہیت اور اس سے ابھرنے والی اخلاقی خرابیوں کو سائنسی اساس پر سمجھنا جائے گا اس وقت تک استحصال محنت کو گناہ کبیرہ تصور نہیں کیا جائے گا۔ مولانا مودودی نے سوپر دو جلدوں میں بحث کی ہے مگر وہ سود اور استحصال محنت کے باہمی فرق کو سمجھ نہیں سکے۔

ڈاکٹر رفیع الدین کا استدلال

یہ بات کہ استحصال محنت سے حاصل شدہ رقم کو زکوٰۃ، صدقات و خیرات اور تقسیم وراثت کے ذریعے عوام تک پہنچا دیا جاسکتا ہے تو یہ بات عہد حاضر کی معاشی و عمرانی ضروریات کے پیش نظر ناکافی ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین نے اپنی تصنیف ”قرآن اور علم جدید“ میں مارکس پر تنقید کرتے ہوئے اس کی وضاحت ایک مثال کے ذریعے کی ہے۔ چنانچہ اس کا اقتباس دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شہری ریاست کی آبادی ساٹھ ہزار گھروں پر مشتمل ہے۔ ان میں آٹھ ہزار مرد سرمایہ دار اور صاحب نصاب ہیں۔ جن کے پاس ریاست کی بڑی بڑی ملازمتیں، نقدی، سونا، چاندی، زمینیں، صنعتی کارخانے اور کاروباری فرمیں ہیں۔ بارہ ہزار افراد متوسط درجہ کے ہیں جن کا گذارا اچھا ہے، لیکن بچت نہیں ہوتی، باقی چالیس ہزار افراد مزدور اور غرباء ہیں۔ شہر میں حکومت کی طرف سے دینی تعلیم و تربیت کا نہایت عمدہ انتظام ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص شریعت کے احکام کی پوری پابندی کرتا ہے۔ سرمایہ داروں میں سے ہر شخص اپنے فالتو مال میں سے شریعت کی مقرر کی ہوئی شرحوں کے مطابق ہر سال باقاعدگی اور دیانت داری کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرتا ہے اور مزید خیرات بھی کرتا ہے۔

ان سرمایہ داروں میں سے ایک سرمایہ دار ایسا ہے جو محسوس کرتا ہے کہ زکوٰۃ اور خیرات ادا کرنے کے باوجود اس کے نادار اور محتاج بھائیوں میں اور اس کے درمیان بڑا فرق ہے، وہ خود زندگی کی آسائشوں (COMFORTS) اور تکلفات (LUXURIES) سے بہرہ ور ہے، لیکن غرباء کو اشد ضرورت کی چیزیں بھی میسر نہیں آتیں یا بمشکل آتی ہیں۔ حالانکہ وہ دوسروں کو خیرات دیتا ہے، دوسروں سے خیرات لیتا نہیں۔ مگر اس کے مفلس بھائی محتاجی میں مبتلا ہیں۔ اور جب وہ سوچتا ہے کہ اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ تو اسے نظر آتا ہے کہ اس کی دولت مندی کا سبب زینۃ الحیوة الدنیائی کی محبت اور حرص ہے، جس نے اسے کفایت شعاری اور محنت پر اکسایا، وہ ایک ایک پیسہ پر نظر رکھتا ہے اور کم دینے اور زیادہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ (اس کا سبب مزدور کی محنت کا استحصال ہے جو مزدور کو کم دیتا اور اس کی محنت کی پیداوار پر زیادہ منافع حاصل کرتا ہے)، لہذا وہ اس سوچ کے ماتحت اپنے آپ کو حرص و ہوا سے بالکل پاک کرنے کی خاطر اور حضور ﷺ کے فرمانِ حقِ یحیٰ لا ٰخِیَہ مٰیحِب لِنَفْسِہٖ کہ ماتحت اور قرآن کے ارشادِ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ اَوْ قُلُ الْعَفْوَ کے مطابق فیصلہ کرتا ہے کہ اپنا تمام فالتو مال دیدے۔ چونکہ وہ سمجھتا ہے کہ خود شہر کے ہزاروں حاجت مندوں کی

ضروریات کا ٹھیک نسبی اندازہ قائم نہیں کر سکے گا اور اس کی تقسیم لوگوں کی ضروریات کے لحاظ سے کم و بیش ہو جائے گی اور چونکہ وہ جانتا ہے کہ حکومت ذمہ داری اور خداتر لوگوں پر مشتمل ہے، وہ حکومت کو اطلاع دیتا ہے کہ اس کے مال پر قبضہ کر کے اسے ازالہ افلاس کے کام میں لائے اور مناسب طور پر لوگوں میں تقسیم کر دے۔ فرض کیجئے ایک دو ماہ کے عرصہ میں باقی سرمایہ دار اس کی مثال سے متاثر ہو کر اور اس کی طرح بہتر اور بلند تر درجہ کے مسلمان بننے کی خواہش سے اسی طرح اپنا فالتو مال حکومت کے سپرد کر دیتے ہیں۔ (یہ یاد رہے کہ اپنا فالتو مال دیتے ہیں، اپنی زمینوں، کارخانوں، کانوں، تیل کے چشموں اور تجارتی فرموں کو ان کے قبضہ ملکیت میں نہیں دیتے)۔

ان سب کا فیصلہ شریعت کی رو سے قابل ستائش ہے، لیکن جب حکومت کے پاس اس قسم کی آٹھ ہزار درخواستیں پہنچتی ہیں تو حکومت پر بڑی ذمہ داری اس بات کی عائد ہوتی ہے کہ وہ اس سرمایہ کو اس طرح تقسیم کرے کہ اقتصادی طور پر لوگوں کی حالت بہتر ہو۔ وہ محسوس کرتی ہے کہ اگر اس سرمایہ کو اس نے مناسب پیش بندیوں کے بغیر غریبوں میں تقسیم کر دیا تو بڑے بڑے صنعتی کارخانے جن میں عوام کی ضروریات کی چیزیں عمدہ اور سستی تیار ہوتی ہیں، بند ہو جائیں گے۔ اس سے نہ صرف لوگوں کو اپنی ضروریات میسر نہ ہوں گی بلکہ بیکاری بڑھ جائے گی۔ اگر زمین چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی تو ان کی زراعت اقتصادی طور پر منفعہ بخش نہیں رہے گی اور پیداوار میں کمی آجائے گی اور پھر بعض لوگ اس لئے مفلس ہیں کہ انہیں محنت کی بجائے خیرات پر گزارہ کرنے کی عادت ہے، ایسے لوگ مفت میں مالدار ہو جانے کی وجہ سے اور کم ہو جائیں گے، سرمایہ کو بیٹھ کر کھائیں گے اور پھر مفلس ہو جائیں گے۔

اسلامی ریاست کا آخری اقتصادی نظام

لہذا حکومت فیصلہ کرتی ہے:

- ۱۔ کہ ایک طرف سے شہر کے تمام بے کاروں، ناداروں اور دوسرے افراد کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کی فہرستیں اور دوسری طرف سے شہر داروں کی تمام اقتصادی ضروریات کی فہرستیں تیار کر لی جائیں۔
- ۲۔ کارخانے اور فرمیں بدستور جاری رہیں اور جو لوگ ان میں ملازم ہیں وہ بدستور ملازم رہیں۔ حکومت ان کو تنخواہ دے اور خود کارخانوں کا انتظام کرے اور ان کی آمدنی سے (جس کا صرف ایک قلیل حصہ پہلے زکوٰۃ کی صورت میں حکومت کو ملتا تھا) اور کارخانے کھولے اور بعض ایسے مفلسوں کو ان کارخانوں میں کام کرنے پر لگا دے جو پہلے بیکاری کی وجہ سے افلاس میں مبتلا تھے اور بے قاعدہ خیرات پر گزارہ کرتے تھے۔
- ۳۔ کاشت کی زمین ایسے رقبوں میں بانٹ دی جائے کہ ہر رقبہ کی آمدنی متوسط درجہ کے خاندان کی تمام حیاتیاتی ضروریات اور بعض جمالیاتی ضروریات کے لئے کفایت کرے۔ پھر ملحقہ ٹکڑوں کے مالکوں کو کہا

جائے کہ وہ انجمنیں بنالیں اور اپنی زمینوں کو امداد باہمی کے اصول پر اس طرح کاشت کریں کہ وہ گویا ایک ہی قطعہ زمین ہے اور اپنی آمدنی کو مساوی طور پر آپس میں بانٹ لیں۔ اس طرح سے زراعت کی قیمتی مشینوں اور قیمتی کھادوں کو استعمال کر کے اپنی پیداوار اور اپنی آمدنی میں اضافہ کریں۔

۴۔ کوئی کارخانہ یا کوئی اجتماعی کاشت کا قطعہ زمین اس قدر چھوٹا نہ ہو کہ اس کی پیداوار مہنگی پڑے اور کوئی تجارتی فرم اس قدر کم سرمایہ سے کام نہ کرے کہ وہ اپنے کام کو موثر (EFFICIENT)، آسان اور ارزاں طریق سے نہ کر سکے۔ یہ فیصلہ چونکہ شہر کی آبادی کے تمام طبقات (CLASSISS) کو پوری طرح سے مطمئن کرتا ہے اور افلاس اور حرص کی دونوں بیماریوں سے مستقل نجات دیتا ہے، لہذا اتمام اسے قبول کرتے اور خوشی سے جاری کرتے ہیں۔

اشتراکی نظام کا الزام

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اس اقتصادی نظام کو اشتراکی نظام کہے تو اس کی مرضی ہے، لیکن درحقیقت یہ نظام ایک کامل اور نصب العینی اسلامی جماعت کا بے ساختہ ظہور میں آنے والا اقتصادی نظام ہے۔

اس معاشی نظام کے حق میں رسول اللہ ﷺ کی تائید

حدیث کے الفاظ یہ ہیں: عن ابی درداء قال قال النبی ﷺ ان الاشعریین (اشعری قبیلہ کے افراد) اذا مرسلوا فی الغزوۃ اوقل طعام عیالہم فی ثوب واحد ثم اقتسبوا بینہم بالسویۃ فہو منی وانا منہم ”ابو درداء سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اشعری قبیلہ کے لوگ جب جنگ میں نادار ہو جاتے ہیں یا شہر میں رہتے ہوئے ان کے بال بچوں کے لئے خوراک کم ہو جاتی ہے تو جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے، ایک ہی کپڑے یا برتن میں جمع کر دیتے ہیں اور آپس میں برابر برابر تقسیم کر لیتے ہیں۔ ان کا عمل میری خواہش کے عین مطابق ہے اور میں ان میں سے ایک ہوں۔ (یعنی میں ان میں سے ہوں اور وہ مجھ میں سے ہیں۔)“

اس حدیث مبارک سے معلوم ہوا کہ اگر دولت کو ایک مقام پر جمع کر کے جماعت کے تمام افراد میں برابر طور پر تقسیم کرنے کا ہی اصول بڑے پیمانے پر رائج کر دیا جائے، جس میں جماعت کے تمام افراد شامل ہو جائیں اور وصول کنندہ اور تقسیم کنندہ مرکزی جماعت یا حکومت کو قرار دیا جائے (جیسا کہ سوشلسٹ ریاستوں میں ہوتا ہے) تو یہ طریق بھی حضور اکرم ﷺ کے نزدیک ویسا ہی پسندیدہ ہو گا۔ کیونکہ دونوں طریقوں میں سوائے حجم اور پیمانہ کے کچھ فرق نہیں۔ حضرت یوسفؑ نے اسی اشتراکی طریق تقسیم سے لوگوں کو قحط میں فاقہ کشی سے بچا لیا تھا۔

نوٹ: حدیث میں لفظ بالسویۃ (مساوی طور پر) کے معنی یہ نہیں کہ اشعریین اپنے بچوں اور جوانوں کو برابر مقدار کی خوراک دیتے تھے۔ اسی طرح سے ریاست کے افراد کے درمیان میں دولت کی برابر تقسیم میں بھی برابری کا یہ مفہوم نہیں لیا جائے گا۔ (یعنی مساوات مطلق نہیں ہوگی بلکہ محنت کی پیداوار کے مطابق دیا جائے گا۔)

اس اقتباس سے سوشلسٹ معیشت کے نظام کی مکمل تائید ہوتی ہے۔ اور یہی نظام آریائی، سامی اور زرد نسل میں مبعوث ہونے والے انبیاء کا مقصد تھا۔ اسی نظام پر مشتمل معاشرہ کو توحیدی معاشرہ کہا جاتا ہے۔ جب کہ طبقاتی تفاوت والا معاشرہ شرک یا مشرک زدہ معاشرہ ہوتا ہے۔ جب عہد زراعت کی ابتدا سے انسان غلام اور آقا کے طبقوں میں تقسیم ہو گیا اور انسان کا انسان پر ظلم و جبر بڑھ گیا تو انبیاء کی بعثت کا سلسلہ شروع ہوا۔ تمام کتب مقدسہ جس حالت میں بھی آج پائی جاتی ہیں، ان میں طبقاتی تقسیم کا ذکر کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اور اس کے نتائج پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مذہبی پیشوائیت نے انبیاء کی اشتراکی معیشت اور طبقاتی معاشرہ کو لاطبقاتی بنانے کی تعلیمات کو مسخ کر دیا۔ مسلمان علماء کی تمام تفاسیر اس تصور سے خالی ہیں اور کھلم کھلا مراعات یافتہ طبقہ کے مفاد اور طبقاتی نظام کی خدا اور اس کے رسول کی طرف سے تائید کی جاتی ہے۔ یہی وہ تحریف ہے جس کا ڈھنڈورا مسلم علماء کتب مقدسہ میں پائے جانے کا پیسپتے ہیں حالانکہ ان معنوں میں خود قرآن کی تعلیم کو بھی مسخ کر دیا گیا ہے۔ قرآن کے الفاظ یحیون الکلم کا مفہوم اشتراکی معیشت اور طبقاتی معاشرہ کا ذکر کرنے والے الفاظ کو بدلنے کی کوشش کی گئی اور بہت جگہ بدل دیا گیا۔ مسلم علماء نے الفاظ کے معانی بدل دیئے، نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہے اور یہی بات تحریف کے ضمن میں امام ولی اللہ نے بھی کہی ہے۔

اس اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ، تقسیم وراثت اور صدقات و خیرات معاشرہ کے ہر فرد کو اس کی ضروریات زندگی مہیا نہیں کر سکتے، خصوصاً عہد حاضر میں جب کہ آبادی بڑھ چکی ہے اور ضروریات کی نوعیت بدل گئی ہے اور نظام معیشت زیادہ پیچیدہ ہو گیا ہے۔ یہ معاشی احکام اور تعزیرات وغیرہ عبوری دور کے لئے ہیں حتیٰ کہ مسلم معاشرہ میں مسلمان کی جان اور مال اجتماعی ملکیت میں آجائے اور اس کے عوض اسے جنتی معاشرہ کی نعمت عطا ہو جائے، جس میں اس کی جسمانی اور مادی ضروریات کی تکمیل کا سامان ہو گا اور اس کی جمالیاتی ضروریات بھی حاصل ہوں گی۔

سورہ حشرہ کی آیت مقدسہ جس میں کہا گیا ہے کہ دولت اغنیاء کے طبقہ میں ہی نہ رہے، اسے نچلے طبقوں میں گردش کرنا چاہیے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اغنیاء کی دولت جب بھی نیچے اترتی ہے تو صرف اجرت یا خیرات کی شکل میں اترتی ہے۔ اس دولت پر محنت کش کو مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہوتے۔ یہ دولت مزارعت، مضاربیت، لمیٹڈ کمپنی بلکہ ملٹی نیشنل کارپوریشن اور کارٹل کی شکل میں نیچے اترے گی۔ اس سارے عمل میں

محنت کش کو اجرت ملے گی اور اس کی محنت کے استحصال سے ایک کارخانہ سے بیسیوں کارخانے بنتے چلے جائیں گے مگر وہ بدستور محنت کش ہی رہے گا، اس کا ایک کارخانہ بھی نہیں بنے گا۔ ڈیوڈ ریکارڈو کی تجویز کے مطابق محنت کش کو اتنا ہی ملے گا جس سے وہ زندہ رہ سکے اور کارخانہ مالک کی دولت میں اضافہ کرتا رہے۔

قرآن حکیم نے حیات ارضی میں ہبوط آدم کے بعد جب یہ کہا کہ اب میری تعلیم اور ہدایت تمہارے پاس آتی رہے گی، اگر تم اس پر عمل کرو گے تو خوف (جنگ و فساد، خون ریزی، ڈاکہ زنی، چوری اور جبری عصمت درمی وغیرہ) اور حزن (بھوک، افلاس، ناداری، محکومی، جہالت اور بالادست طبقوں کی غلامی وغیرہ) سے نجات پا جاؤ گے جو طبقاتی معاشرہ کا کڑوا ثمر ہے اور دوبارہ اپنی کھوئی ہوئی جنت کو حاصل کر سکو گے۔

اس اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی غایت حیات قرب الہی کا حصول ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ فرد کی مادی اور جمالیاتی ضروریات پوری ہوں، تاکہ وہ اطمینان قلب کے ساتھ توجہ الی اللہ میں مصروف ہو سکے۔ یہاں تک کہ اس کے نفس میں اخلاقی نوا میس عالیہ کارسوخ ہو جائے اور وہ اپنی فطرت کے دباؤ سے ”نیکی“ کو بجالانے پر مجبور ہو جائے۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ مذہب کی غایت انسانی کے حصول کے لئے سوشلسٹ معیشت لازمی ولا بدی ہے اور سوشلسٹ معیشت کی نظریاتی اساس، مذہب عالم کے مشترک تصور کائنات، انسانی فطرت ہیں۔ الوہی نورانی قوت کی موجودگی جو موت کے بعد اپنے اچھے برے اعمال کے ساتھ قائم رہے گی اور اخلاقی و روحانی اقدار پر مبنی ہونی چاہیے۔ ان مذہبی اقدار کے بغیر اشتراکی معاشرہ کے فرد کا آئیڈیل مغرب کی مادر پدر آزادی قرار پا گیا جس سے اشتراکی معاشرہ میں انتشار پیدا ہو چکا ہے اور نہ ہی غیر اشتراکی معاشرے میں سوشلسٹ معیشت کے بغیر اجتماعی سطح پر اخلاقی و روحانی اقدار افراد کی نفسیات کا حصہ بن سکے ہیں۔ اس لئے یہ لازم ہے کہ سوشلسٹ معیشت، لاطبقاتی معاشرہ کی تشکیل اور مذہب عالم کا تصور کائنات و حیات اور اخلاق و روحانی اقدار میں نامیاتی ربط و تعلق قائم ہو جائے، تاکہ فرد کو اپنے غایت حیات کو حاصل کرنے کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہے، فرد کی زندگی مسلسل عبادت الہی میں ڈھل جائے۔ ان دونوں باتوں کے افتراق سے انسان اپنی منزل حاصل نہیں کر سکا اور مختلف قسم کے لاناسانی حالات میں گھر چکا ہے۔ اس سارے عمل کے لئے جہاں ذرائع پیداوار پر نجی ملکیت کے خاتمے، انسان کا نسل، قوم اور قبیلہ و برادری کی تقسیم سے ہٹ کر وحدت انسانیت کی طرف واپس آنا ضروری ہے، وہاں مذہبی پیشوائیت کے ادارہ سے نجات حاصل کرنا بھی لازمی ہے، جس نے مذہب کی وحدت کو ختم کر کے اسے جارحانہ گروہ بندیوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ان تینوں باتوں کے حصول کے بغیر انسان آج تک ناکام و شکست خوردہ ہے، کیونکہ ان رکاوٹوں کے باعث خدا کے پیدا کردہ ذرائع ربوبیت عام انسان کی دسترس تک نہیں پہنچ سکے ہیں بلکہ ساری انسانی تاریخ ہی اور آج بھی چند افراد پر مشتمل گروہ محنت کا استحصال کرتا رہا اور بدستور کر رہا ہے۔

معاشیات کی اہمیت

انسان کھانے پینے اور دوسرے فطرے تقاضوں میں دوسرے حیوانوں کی طرح ہے۔ وہ جب پیدا ہوتا ہے تو دودھ کیلئے پیچ و پکار کرتا ہے۔ جب بڑا ہوتا ہے تو خوراک اور دوسری بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کیلئے جدوجہد کرتا ہے اور آسودہ (خاشاں) زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ پھر مذہب اور اخلاق اسکو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ انسانی خوبیاں پیدا کرے اور اچھے لوگوں کی طرح رہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کا یہ خیال ہے کہ اگر انسان بد حال اور تنگدست ہو تو مذہب اور اخلاق کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا، اس لیے انسانوں میں خوشحال زندگی (ترفہ) کا ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ خوشحال ہو گا تو اس کی عادتیں اور مزاج بھی درست ہوں گے، اخلاقی اور مذہبی لحاظ سے بھی وہ اچھا انسان ہو گا اور اچھے انسانوں کی تمام خوبیاں اس میں موجود ہوں گی۔ آپ کے خیال میں انسان کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ انسان معاشی طور پر خوشحال رہے یا بد حال۔ کیونکہ خدائی منشاء یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی شخص ان چیزوں کے بغیر باقی نہ رہے جن کی ایک متمدن زندگی میں انسان کو ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن فطری طور پر انسان لالچی ہے، تھوڑی سہولت کے بعد زیادہ عیش کا خواہش مند ہے۔ اس کو جب کوئی چیز ملتی ہے اس میں اور اضافے کا خواہاں ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کی خواہش سے ایک خاص نظام پیدا ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک طبقہ بے انتہا دولت کا مالک ہوتا ہے۔ عیش و عشرت کا ہر سامان اسکو میسر ہوتا ہے۔ اس نظام میں غریبوں اور مزدوروں کی کوئی عزت نہیں ہوتی، وہ دولت مندوں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ ضروریات زندگی بھی صحیح طریقے سے پوری نہیں کر سکتے۔ انہیں صرف اتنا کھانے اور پینے کیلئے ملتا ہے کہ وہ دولت مندوں کیلئے دولت پیدا کرنے کو زندہ رہ سکیں۔ یہ نظام قیصر و کسری کا نظام ہے۔ اسلام اس قیصر و کسری کے نظام کو توڑنے آیا تھا۔ اور حضور ﷺ کے نظام نے نظام دولت و نظام حکومت نے اس نظام کو ختم کر دیا تھا۔

قیصر و کسری کے نظام کا پھر سے اجراء

تجربہ ہے کہ بعض سرمایہ پرست مولویوں نے قرآنی آیات کی غلط تعبیرات بیان کر کے پھر قیصر و کسری کے نظام طبقاتی کو حیات بخشنے کی ناروا کوشش کی اور دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ (النحل: ۷۱)

”اور اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی ہے۔“

قرآن مجید کی مختلف صورتوں اور متفرق مقامات پر ایسے آیات کی تعداد ہے جن میں رزق کی کشادگی اور تنگی اور کمی و بیشی کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف فرمائی ہے۔ مذکورہ قرآنی آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان رزق و مال کی کمی و بیشی اور تنگی و کشادگی کے لحاظ سے جو فرق و اختلاف پایا جاتا ہے، اللہ کی معیشت و مرضی سے ہے اور چونکہ اس کے ساتھ خود لوگوں کی اپنی بے شمار مصلحتیں اور منفعتیں وابستہ ہیں، لہذا اس کا ہمیشہ قائم رہنا لازمی اور قدرتی ہے، کوئی اس کو کبھی ختم نہیں کر سکتا۔ ایک مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ اس فرق و تفاوت کو منجانب اللہ سمجھتے ہوئے خوشی کے ساتھ تسلیم کرے اور کبھی کسی ایسی مہم اور تحریک میں شامل نہ ہو جس کا مقصد لوگوں کے درمیان سے رزق و مال کے فرق کو مٹانا اور ختم کرنا ہو۔ کیونکہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ انسانوں کی خیر و بھلائی اور مصلحت و منفعت کی خاطر قائم رکھنا چاہتا ہو، اس کو کون مٹا اور ختم کر سکتا ہے۔ لیکن ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ ان آیات میں بلا تخصیص ہر فرد بشر کو خطاب ہے اور ان کی یہ منشاء ہے کہ مشیت اسباب معیشت باری تعالیٰ کے خزانہ عامہ کی ایسی عنایت ہے کہ جس سے مستفید ہونے کا ہر دی روح کو برابر حق ہے اور ان آیتوں کی مشیت کی زیادہ وضاحت حسب ذیل آیت کرتی ہے:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فَضَّلُوا بَرَاءً ذِيْ رُحْمَةٍ عَلٰی مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاءٌ ۚ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (النحل: ۷۱)

”اور اللہ تعالیٰ نے تم میں بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی ہے پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جن کو زیادہ روزی دی ہے، وہ اپنی روزی کو زیر دستوں پر لوٹا دے، حالانکہ اس روزی میں سب کے سب برابر کے حقدار ہیں، پھر کیا یہ اللہ تعالیٰ کے نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہو رہے ہیں؟“

اس آیت میں حق معیشت کی مساوات کا جس قدر صاف اور واضح اعلان ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔ اس کا انکار بد اہت و صراحت کا انکار ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مشیت الہی کے اس مقصد عظیم کو پورا کون کرے اور اس عالم اسباب میں اسکی تکمیل کس کے ذمے واجب ہے؟ تو اسلام کے نظام کا مکمل نقشہ جن نگاہوں کے سامنے ہے وہ با آسانی یہ جواب دے سکتے ہیں کہ اس عالم تشریع میں یہ فریضہ نائب الہی خلیفۃ اللہ پر عائد ہوتا ہے۔ سلطنت اسلامی میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو حق معیشت سے محروم ہو اور نہ کسی کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ حق معیشت میں مداخلت بن سکے اور جو حکومت اس مشیت الہی کو پورا نہ کرتی ہو وہ فاسد نظام کی حامل اور نظام عدل سے منحرف ہے۔

اس آیت مذکورہ بالا کے متعلق صاحب کشف علامہ زرخشریؒ کی رائے ملاحظہ ہو:

ای جعلکم متفاوتین فی الرزق فرزقکم افضل مبارق مبالغیکم وهم بشم مثلكم واخوانکم فکان ینبغی ان تردوا افضل ما رزقتموه علیکم حتی تتساوا فی البلیس والبطعم کما یحک عن ابی ذرانه سبع النبی ﷺ یقول انہام اخوانکم فاکسومہم ما تلبنسون واطعموہم ما تطعمون۔ (الکشاف: جلد ۲، ص ۵۷۹ قدیمی کتب خانہ)

اس طرح صاحب روح المعانی علامہ آلوسیؒ کی بھی رائے ملاحظہ ہو:

وجوزان یکو معنی الآیۃ ان اللہ تعالیٰ فضل بعضا علی بعض فی الرزق وان الفضلین لایردن من رزقہم علی من دونہم شیئا وانہا انا رازقہم فالبالک والبلوک فی اصل الرزق سواء وان تفاوتا کما وکیفا (روح المعانی جلد ۸ ص ۸۹ مکتبہ امدادیہ)

علاوہ ازیں چنانچہ بقرہ کی آیت ہوالذی خلق لکم مافی الارض جیبعا کی تفسیر فرماتے ہوئے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ ارشاد فرماتے ہیں:

”جملہ اشیائے عالم بدلیل فرمان واجب الاذعان خلق لکم مافی الارض جیبعا تمام بنی آدم کی مملوک معلوم ہوتی ہیں یعنی غرض خداوندی تمام اشیاء کی پیدائش سے رفع حوائج ہمارے (انسان) ہے اور کوئی شے فی حد ذاتہ کسی کی مملوکہ خاص نہیں بلکہ ہر شے اصل خلقت میں جملہ ناس میں مشترکہ ہے اور من وجہ سب کی مملوک ہے۔ ہاں بوجہ رفع نزاع وحصول انتفاع قبضہ کو علت ملک مقرر کیا گیا اور جب تک کسی شے پر ایک شخص کا قبضہ تامہ مستقلہ باقی رہے اس وقت تک کوئی اور اس میں دست درازی نہیں کر سکتا۔ ہاں خود مالک وقابل کو چاہیے کہ اپنی حاجت سے زائد پر قبضہ نہ رکھے بلکہ اسکو اوروں کے حوالہ کر دے، کیونکہ باعتبار اصل اوروں کے حقوق اسکے ساتھ متعلق ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مال کثیر حاجت سے بالکل زائد جمع رکھنا بہتر نہ ہوا گو کہ زکوٰۃ بھی ادا کر دی جائے اور انبیاء اور صلحاء اس سے بغایت مجتنب رہے۔ چنانچہ احادیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے بلکہ بعض تابعین وصحابہ وغیرہ نے حاجت سے زائد رکھنے کو حرام ہی فرمادیا، بہر کیف غیر مناسب وخلاف اولیٰ ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ زائد علی الحاجت سے تو اسکی کوئی غرض متعلق نہیں اور اوروں کی ملک من وجہ اس میں موجود۔ تو گویا شخص مذکورہ من وجہ مال غیر پر قابض ومتصرف ہے اور اس کا حال بعینہ مال غنیمت کا تصور کرنا چاہیے۔ وہاں بھی قبل تقسیم یہی قصہ ہے کہ کل مال غنیمت تمام مجاہدین کا مملوک سمجھا جاتا ہے مگر بوجہ ضرورت وحصول انتفاع بقدر حاجت ہر کوئی مال مذکورہ سے منتفع ہو سکتا ہے۔ ہاں حاجت سے زائد جو رکھنا ہے اسکا حال آپکو بھی معلوم ہے کہ کیا ہونا چاہیے، (یعنی خائن شمار ہو گا) ایضاً الادلہ ملاحظہ ہو

اسی طرح مشہور محدث علامہ ابن حزم ظاہری کی رائے ملاحظہ ہو۔

فرماتے ہیں کہ ہر ایک بستی کے ارباب دولت کا فرض ہے کہ وہ فقراء اور غرباء کی معاشی زندگی کے

کفیل ہو اور اگر مال فی (بیت المال کی آمدنی) ان غرباء کی معاشی کفالت کو پوری نہ ہوتی ہو تو سلطان (امیر) ان ارباب دولت کو اس کفالت کیلئے مجبور کر سکتا ہے (یعنی انکے فاضل مال سے بھر لیکر فقرائے کی ضروریات میں صرف کر سکتا ہے)۔ اور انکی زندگی کے اسباب کیلئے کم از کم یہ انتظام ضروری ہے کہ انکی حاجت کے مطابق روٹی مہیا ہو، پہننے کیلئے گرمی اور سردی دونوں موسموں کے لحاظ سے لباس فراہم ہو اور رہنے کیلئے ایک ایسا مکان ہو جو انکو بارش، گرمی، دھوپ اور سیلاب جیسے امور سے محفوظ رکھ سکے۔ (الحلی جلد ۶ ص ۱۵۶)

مزید حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت پر بحث فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ اس بات پر صحابہ کا اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص بھوکا، ننگا یا ضروریات رہائش سے محروم ہے تو مالدار کے فاضل مال سے اسکی کفالت کرنا فرض ہے۔

نَحْنُ قَسَبْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ

بَعْضًا سَخِيًّا ۖ (الزخرف: ۳۲)

”ہم نے ان کے درمیان اس دنیاوی زندگی میں انکی روزی تقسیم کر رکھی ہے۔ اور ہم نے ایک کے درجے دوسرے سے بلند رکھے ہیں، تاکہ ایک، دوسرے سے کام لیتا رہے۔“

ظاہر ہے کہ لوگوں کا رزق میں ایک دوسرے پر تفوق صلاحیتوں اور قابلیتوں میں ایک دوسرے پر تفوق و برتری کی مانند ہے۔ جس طرح انسانوں میں بعض پست قد ہیں اور بعض دراز قد۔ بعض بد صورت ہیں اور بعض خوبصورت۔ بعض محنتی ہیں اور بعض کام چور و بے کار۔ اور بعض کند ذہن ہیں اور بعض زیرک۔ بعض کمر زور ہیں اور بعض طاقتور۔ اسی طرح بعض تنگ دست ہیں اور بعض کشادہ رزق۔ اور یہ بات اس دنیاوی زندگی کے مزاج وفطرت کے عین مطابق ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو ارادہ واختیار کی قوت دے کر اسے ابتلا وامتحان میں ڈالا ہے جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے، اسکا بھی یہ تقاضا ہے کہ انسانوں میں رزق کے فرق مراتب ہو۔ المختصر مال کی کمی بیشی کسی ذاتی زوال و کمال کی دلیل نہیں بلکہ خدا کی تقسیم کردہ معیشت میں بندوں کا پرچہ امتحان ہے۔ احساس ذمہ داری کا امتحان، اجتماعی اخوت کا امتحان، خدا کے بندوں تک ان کا مقدر شدہ حصہ رزق پہنچانے کی دیانت کا امتحان ہے اور یہ امتحان کہ کمی پر صبر کرنے اور بیشی پر شکر کرنے والے ان دونوں جذبوں کا حق ادا کرنے والے لوگ کون ہیں۔ اس سلسلے میں معروف ہندی محدث علی حقی نے کنز العمال میں ایک بڑی ایمان افروز اور حقیقت نما روایت نقل کی ہے کہ اللہ کریم نے حضرت موسیٰ بن عمران کی طرف وحی فرمائی، فرمایا: ”اے موسیٰ! میں نے فقیروں اور غریبوں کو (غربت وافلاس میں) اسی لئے مجبور نہیں کیا ہے کہ میرا خزانہ ان کے لیے تنگ ہے اور میری رحمت میں ان کے لیے گنجائش نہیں بلکہ یہ چیز اس وجہ سے ہے کہ میں نے مالداروں کے مال میں غرباء کیلئے اتنا فرض قرار دے دیا کہ جو ان کیلئے کافی

ہو، میں نے ارادہ کیا کہ مالداروں کی آزمائش کروں کہ غریبوں کیلئے ان کے مال میں میں نے جو کچھ واجب کیا اس کے بارے میں انکی روش کیسی ہے، کیونکہ میں نے ان پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دنیا میں ان کیلئے کئی گنا اضافہ کیا، کم از کم ایک نیکی کا صلہ دس گنا۔ اے موسیٰ! غریبوں کیلئے خزانہ بن، کمزور کیلئے مستحکم قلعہ اور پناہ چاہنے والے کیلئے پناہ دینے والے بن کر رہو گے تو ہر سختی میں تمہارا ساتھی اور تنہائی میں تمہارا انیس و غم خوار ہوں گا اور ہمیشہ تمہاری نگرانی و حفاظت کروں گا۔“ اسلام میں درجات معیشت کے اندر بعض تکوینی مصالح کے تحت فرق ضروری ہے مگر حق معیشت میں اسلام انصاف، مواسات، ہمدردی اور غم خواری کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ امت مسلمہ کے مختلف افراد کے درمیان اتنا تفاوت پایا جائے کہ کچھ لوگ تو عیش و عشرت کی زندگی گزاریں اور دوسرے لوگ خستہ حال اور پریشان ہوں اور ہر خستہ حال مفلس، فاقہ کشی اور کپڑوں سے ننگے رہنے کی حد تک جا پہنچے۔

ان حضرات کو یہ آیتیں تو نظر آرہی ہیں جبکہ دوسری جانب مزید قرآنی وہ تعلیمات جو مستضعفین کی معاونت و دستگیری کی تلقین کرتی ہیں اور عدم تعاون و عدم کفالت پر سورہ ہمزہ اور سورہ الماعون میں کی گئی سرزنش دکھائی نہیں دیتی اور سرمایہ پرست طبقات ہمیشہ کیلئے بعض مشائخ حضرات اپنے زیر کفالت رکھتے ہیں، تاکہ وہ ان سرمایہ داروں کے ناجائز ذرائع سے کی جانے والی کمائی کیلئے شرعی دلائل جمع کر کے لوگوں کی نگاہوں میں انہیں پارسہا کا جامہ پہناتے رہیں اور انکی ذمہ داری یہ بھی ہوتی ہے کہ حضور ﷺ کے ایک مشہور فرمان کو ہر مقام پر بیان کر کے مفلسی اختیار کرنے کو فروغ دیں اور اس امر کی تلقین عام کی جائے۔ تاکہ لوگ مذہبی جذبات سے سرشار ہو کر مادیات سے مکمل بے رخی اختیار کریں اور سرمایہ داروں کی تجوری حاصل ہو۔

حدیث مذکورہ ملاحظہ ہو:

اللهم احيني مسكينا وامتنني مسكينا واحشني في زمرة المساكين - فقالت عائشة رضي الله عنهما لم يارسول الله!

قال انهم يدخلون الجنة قبل اغنيائهم بادبعين خريفا-

”حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ کریم! مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھنا، مسکین بنا کر موت دینا اور حشر کے روز مسکین کی جماعت کے ساتھ کھڑا کرنا۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ لوگ اپنے امیر لوگوں سے چالیس سال پہلے جنت میں چلے جائیں گے۔“

انسان کی یہ فطری عادت ہوتی ہے کہ جس سے زیادہ محبت ہو، اس کی ہمیشہ بھلائی چاہتا ہے اور اس کی بھلائی اور کامیابی کے حصول کے ذرائع بھی بتاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی اپنی محبوب زوجہ حضرت عائشہؓ

کو جب اللہ تعالیٰ کی رضا کا گر تعلیم فرمایا تو وہ بھی غریبوں اور کمزوروں سے محبت کرنا تھا، یہ مطلوب تھا کہ لوگ مفلسی اختیار کر لیں۔ کیونکہ حضور ﷺ ایک عظیم حکمران تھے اور ان کا لایا گیا نظام، طبقاتی نظام کے خاتمے کیلئے ایک سنگ میل تھا۔ وہ تو غریبوں کی دادرسی ہی اپنا مشن سمجھتے تھے۔ حدیث مذکورہ سے حضور ﷺ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ جو لوگ یہاں دنیا میں کسمپرسی کی زندگی سے دوچار ہیں، اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں انکی اہمیت ہے اور جو یہ چاہتا ہے کہ اپنے آپکو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں برگزیدہ بنا کر قیامت کے دن میرے ساتھ حشر پائے تو جن سے میں محبت رکھتا ہوں ان سے وہ بھی محبت رکھے۔ معاشرے میں رہنے والے مالی برتری کے مالک ان در ماندہ حال بھائیوں کی نگہداشت رکھیں، تاکہ وہ بھی کسمپرسی کے عالم سے نکل کر ایک خوشگوار زندگی گزار سکیں۔ جس کی میں آرزو لئے طبقاتی نظام کے خاتمہ کا عزم لے کر چلا ہوں۔ یہ مطلب قطعاً نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اسلئے مسکنت کو اختیار کیا، تاکہ معاشرے میں جینے والا ہر شخص غربت کا مارا پھرے، جبکہ حضور کے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود مسکنت کی دعا کرنا مسکینوں کو احساس محرومی سے باہر نکالنا ہے اور صاحب ثروت حضرات کو ان کی دادرسی کر کے اپنی عاقبت کی درستگی کی تعلیم دینا مطلوب ہے۔

حق معیشت کیا ہے

”رزق اور معاش کا حقیقی تعلق صرف ذات الہی سے وابستہ ہے اور وہی ہر فرد کا کفیل ہے اور اگرچہ اس کی مصلحت عامہ اور حکمت تامہ کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کے اس متنوع ماحول میں رزق کے اندر تفاوت درجات پایا جائے۔ لیکن امارت و غربت کے فطری تنوع کے باوجود یہاں ایک فرد بھی محروم المعیشت نہ رہنے پائے۔ کیونکہ اس نے حق معیشت کو سب کیلئے مساوی اور برابر رکھا ہے اور کسی کو بھی حق مساوات میں دخل انداز ہونے کا حق عطا نہیں فرمایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا

”اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری اللہ نے اپنے ذمہ میں لی ہے۔“

(ملاحظہ ہو اسلام کا اقتصادی نظام ص ۳۹ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی)

درجات معیشت کیا ہے

”اگرچہ حق معیشت میں سب مساوی ہیں لیکن درجات معیشت میں مساوی نہیں اور معیشت میں درجات کا تفاوت ایک حد تک فطری ہے، یعنی یہ ضروری نہیں کہ سب کیلئے سامان معیشت ایک ہی طرح کا ہو گا۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ سب کیلئے ہو۔ مگر درجات کا یہ تفاوت ایسے اعتدال پر قائم رہے کہ کسی حالت میں بھی وہ لوگوں کے درمیان وجہ ظلم نہ بن سکے، یعنی تفاوت درجات تو ہو، لیکن نہ ایسا کہ معیشت انسانوں کو

دو طبقوں میں اس طرح تقسیم کر دے کہ ایک کی ترقی دوسرے کے فقر و افلاس کا سبب بنے اور دوسرا پہلے کے معاشی اغراض کا آلہ کار بن کر رہ جائے۔“ (ملاحظہ ہو اسلام کا اقتصادی نظام ص ۶۹ مولانا حفیظ الرحمن سیوہاری)

معاشیات و اخلاقیات کا باہمی ارتباط

یہ ایک واضح امر ہے کہ معاشیات و اخلاقیات باہم مربوط ہیں، اسی لیے ارشاد باری تعالیٰ بھی اسی طرف توجہ دلاتا ہے۔ واقعہ قارون میں ہے:

وَلَا تَبْتَغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (النقص: ۷۷)

”اور زمین میں فساد کے طالب نہ بنو، اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“

زمین میں فساد کیا ہے؟ اس آیت کے مطابق زمین میں فساد برپا کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص کو زیادہ دولت ملے تو وہ اس کو صرف اپنی ذات کیلئے خرچ کرے۔ سمندر میں زمین کا پانی اگر جمع ہوتا ہے تو سمندر پانی کو بھاپ کی شکل میں اڑا کر دوبارہ اسکو پوری زمین پر پھیلا دیتا ہے۔ یہ خدا کی دنیا میں اصلاح کا ایک نمونہ ہے۔ یہیں چیز انسان سے اس طرح مطلوب ہے کہ اگر کسی وجہ سے ایک شخص کے پاس زیادہ دولت کھٹی ہو جائے تو اسکو چاہیے کہ وہ اسکو مختلف طریقوں سے ان لوگوں کی طرف لوٹائے جنہیں معاشی تقسیم میں کم حصہ ملا ہے، گویا جمع شدہ دولت کو گردش میں لانا اصلاح ہے اور جمع شدہ دولت کو جمع رکھنا فساد ہے۔ جب جمع رکھنے کو ہی ترجیح دی جائے گی تو وہ طبقہ جس کو قرآن مجید (للسائل والباحسوم) سے تعبیر کرتا ہے، معاشرہ میں احساس محرومی کا شکار ہو گا اور معاشرہ میں انکو دو نمبر شہریت بھی مشکل سے میسر ہوگی۔ تو یہی احساس محرومی کے شکار لوگ اپنی تنگی سے مجبور آکر اپنے لخت جگر کے علاج و معالجہ اور انکی کفالت سے بے بس ہو کر بالآخر انتہائی مایوس ہوتے ہوئے خود کشی کی راہ اختیار کرتے ہیں یا پھر اگر ان میں چھیننے کا حوصلہ ہوتا ہے تو چوری، ڈھاکہ زنی یا پھر کرایہ پر قتل کرنے کو اختیار کر لیتے ہیں اور اگر ان میں نہ چھیننے و غیرہ کا حوصلہ ہو نہ خود کشی کا تو وہ پھر اوباشوں کے نزع میں آکر سرمایہ داروں کی عیاشی کیلئے تختہ متک بن جاتے ہیں۔ لہذا جب سرمایہ پرست طبقوں کی لاپرواہی سے معاشرہ میں ایک دوسرے انداز سے جینے والے پیدا ہوتے ہیں تو یہ انہی سرمایہ پرستوں کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے۔ کیونکہ جب اوباشی اور بد معاشی ان کے معاشرے کا حصہ بنے تو پھر انکے لپیٹ میں خود سرمایہ پرستوں کی اولادیں زیادہ آتی ہیں۔ چنانچہ اسی طرح کے حالات پیدا کرنے کو فساد اور پیدا کرنے والوں کو مفسدین کہا جاتا ہے، جنہیں اللہ سخت ناپسند کرتا ہے۔

اخلاق و معیشت میں ارتباط شاہ ولی اللہ کی نظر میں

اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ ارتباطات پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ”یہ واضح رہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا منشاء اگرچہ بالذات عبادت الہی سے متعلق ہے مگر عبادت کے ساتھ ساتھ اس منشاء میں رسوم

فاسدہ کو فنا کر کے اجتماعی زندگی میں بہترین نظام کا قیام بھی شامل ہے، اسی لئے پیغمبر خدا ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: بعثت لانتہم مکارم الاخلاق۔“ میں اس لئے مبعوث کیا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔“

اور اسی لئے اس مقدس ہستی میں رہبانیت کو اخلاقی حیثیت نہیں دی گئی بلکہ انسانوں کے باہمی اختلاط و اجتماع کی زندگی کو ترجیح دی گئی ہے۔ لیکن اس اجتماعیت کا امتیاز یہ قرار دیا ہے کہ اس کے معاشی نظام میں نہ دولت و ثروت کو وہ حیثیت حاصل ہو جو عجمی بادشاہوں کے یہاں حاصل تھی اور نہ ایسی کیفیت ہو کہ تمدن سے بیزار دہقان اور وحشی لوگوں کی طرح انکی معیشت ہو۔

دولت و ثروت ایک محبوب و محمود شے ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ صحیح اصول پر قائم ہے تو اسکی بدولت انسانوں کا دائمی توازن اعتدال پر رہتا ہے اور اس سے انکے اخلاق کریمانہ صحیح اور درست رہتے ہیں نیز انسان اس قابل بنتا ہے کہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہو۔ اس لیے کہ بیکسانہ اور مجبورانہ افلاس سوء تدبیر اور مزاج کے اختلال کا باعث ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ نظام معیشت میں دولت و ثروت ایک بدترین چیز ہے جبکہ وہ باہمی مناقشات اور بغض و حسد کا سبب بنتی ہے اور خود اہل ثروت و دولت کے اطمینان قلب کو تعصب اور حریفانہ کد و کاوش کے زہر سے مسموم کرتی ہے اور قوموں کے استحصال بالجبر اور دوسروں پر معاشی دست برد کیلئے آمادہ کرتی ہو، کیونکہ اس صورت میں یہ بد اخلاقی کے مرض میں مبتلا کر دیتی ہے، آخرت اور یاد الہی یعنی روحانی زندگی سے بالکل غافل و بے پرواہ بنا دیتی ہے اور مظلوم پرست پر نئے مظالم کا دروازہ کھولتی ہے۔ لہذا پسندیدہ راہ یہ ہے کہ دولت و ثروت نظام معیشت میں ایسا درجہ رکھتی ہو جو توسط اور اعتدال پر قائم اور افراط و تفریط سے پاک ہو اور یہ صحیح معاشی نظام کے بغیر ناممکن ہے۔

شاہ ولی اللہ کے اس نظریہ کی صداقت کیلئے گزشتہ تاریخ کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں۔ موجودہ یورپین حکمرانوں کی تاریخ ہی اس کے لیے زندہ شہادت ہے۔ کیا آپ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ جہاں تک انفرادی اخلاق کا تعلق ہے، بعض یورپین اقوام اخلاقی میسائل میں بلند اخلاق اور مضبوط کریکٹر کی حامل نظر آتی ہیں۔ لیکن جب انکی اجتماعی اخلاقی زندگی پر نظر ڈالئے تو غدر و فریب، بد عہدی، معاشی دست برد، استحصال بالجبر اور اسی قسم کی بد اخلاقی کا سراسر مرقع نظر آتی ہیں۔ وہ معاہدات کرتی ہیں مگر بد عہدی کیلئے، مظالم توڑتی ہیں مگر آئین اور قانون کا نام دے کر۔ فریب کاریاں کرتی ہیں مگر تدبیر اور سیاست کہہ کر اور معاشی دست برد روا رکھتی ہیں مگر تجارت اور تہذیب آموزی کا پردہ رکھ کر۔ حتیٰ کہ انفرادی بد اخلاقیوں میں سے بھی بد کاری، شراب خوری، انکامیہ، خمر بن چکا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ انکے معاشی نظام کی بنیادیں جمہور کی حاجتوں کے پورے کرنے کے اصول پر استوار نہیں کی گئیں بلکہ ان سرمایہ دارانہ اصول پر قائم ہیں جن کو شاہ ولی اللہ کے نظریہ میں فاسد اور مذموم معاشی نظام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(مقالہ اخلاق و معاشیات کا باہمی ربط از مولانا حفیظ الرحمن سیوہاری برائے انجمن ترقی ادب دہلی کے منعقدہ اجلاس ۲۳ فروری ۱۹۵۶ء)